دینی وعصری درسگاہیں

تعلیمی مسائل

یعنی دینی وعصری تعلیم کی اہمیت، تعلیم کے نصاب ونظام کے لئے لائحہ عمل، مدارس کے بارے میں غلط فہمیوں کا ازالہ اور دینی وعصری درسگاہوں کے مسائل پر چشم کشا تجزیے اور تبصرے۔

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی

دینی وعصری درسگاہیں

تعلیمی مسائل

یعنی دینی وعصری تعلیم کی اہمیت، تعلیم کے نصاب ونظام کے لئے لائحہ عمل ، مدارس کے بارے میں غلط فہمیوں کا ازالہ اور دینی وعصری درسگاہوں کے مسائل پر چشم کشا تجزیے اور تبصرے۔

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی

باہتمام : المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد

ناشر : ھدیٰ بک ڈسٹری بیوٹرس، حیدرآباد-۲

نام کتاب	:	دینی وعصری درسگاہیں — تعلیمی مسائل
مصنف	:	مولانا خالد سیف اللہ رحمانی
جمع وترتیب	:	مولانا محمد عمر عابدین قاسمی مدنی
صفحات	:	۲۷۲
اشاعت	:	ذوالحجہ ۱۴۳۲ھ - نومبر ۲۰۱۱ء
تعداد	:	ایک ہزار
کمپیوٹر کتابت	:	مفتی عبداللہ سلیمان مظاہری، محمد نصیر عالم سبیلیؔ ''**العالم**'' اُردو کمپیوٹر سنٹر، بیت العلم، کوتہ پیٹ، بارکس، حیدرآباد، فون نمبر: 0-9959897621
قیمت	:	160/= روپے

ISBN: 81-903989-8-9

باہتمام : المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد

ناشر : ھدیٰ بک ڈسٹری بیوٹرس، حیدرآباد

Huda Book Distributors

Publishers, Importers & Exporters
455, Purani Haveli, Hyderabad-500002, India
Ph: 040-24514892, 66481637
E-mail:hudabook@yahoo.com www.hudaboodshyd.com

ملنے کے پتے :

⊙ المعہد العالی الاسلامی، تعلیم آباد، قبا کالونی، شاہین نگر، حیدرآباد۔

⊙ دکن ٹریڈرس، مغل پورہ پانی کی ٹنکی، حیدرآباد۔

فہرست مضامین

دینی تعلیم اور دینی درسگاہیں

عصری تعلیم اور عصری درسگاہیں

مشترک مسائل

پیش لفظ

تعلیم ہی وہ چیز ہے جو انسان کو دوسری مخلوقات سے ممتاز کرتی ہے، مال وزر، پُرشکوہ بلڈنگوں اور جنت نشان عیش کدوں کے ذریعہ جسمانی سکون تو حاصل کیا جاسکتا ہے؛ لیکن کسی قوم کے لئے ایک باعزت قوم کی حیثیت سے دنیا میں زندہ رہنے کے لئے یہ کافی نہیں ہے، علم سے عقل وشعور کی سطح اونچی ہوتی ہے، اخلاقی معیار بلند ہوتا ہے، دلوں کو فتح کرنے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے اور دنیا میں وہ قوم قیادت کے منصب سے بہرہ ور ہوتی ہے؛ اسی لئے تعلیم کا کوئی بدل نہیں۔

اس حقیر کو ادھر کئی سال سے اردو کے کثیر الاشاعت روزنامہ ''منصف'' میں لکھنے کا شرف حاصل ہو رہا ہے، اس میں میں نے کوشش کی ہے کہ تعلیم کی دعوت زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچائی جائے؛ چنانچہ تعلیمی نظام کے لحاظ سے شوال کے مہینہ میں دینی تعلیم کی اہمیت اور اس کے نصاب و نظام پر، شعبان کے مہینہ میں فضلاء مدارس کی ذمہ داریوں پر اور مئی اور جون میں ...... جو حیدرآباد میں عصری مدارس میں تعلیم کے آغاز کا زمانہ ہوتا ہے...... عصری تعلیم کی اہمیت پر لکھنے اور ان کو ترجیحی بنیاد پر موضوعِ تحریر بنانے کا معمول ہے، یہ مجموعہ انھیں تحریروں پر مشتمل ہے!

اس مجموعہ میں تین طرح کے مضامین ہیں، دینی تعلیم اور دینی مدارس سے متعلق، عصری تعلیم اور عصری درسگاہوں سے متعلق اور دونوں طرح کی درسگاہوں کے مشترک مسائل، افسوس کہ نصاب تعلیم پر اس حقیر کا ایک تفصیلی تجزیاتی مقالہ تھا، جو ایک ملک گیر سیمینار کے لئے لکھا گیا تھا، اس کا زیادہ تر حصہ اس مجموعہ کی ترتیب کے وقت نہیں مل سکا؛ اس لئے وہ مضمون اس میں شامل نہیں ہو پایا — ولعل اللہ یحدث بعد ذلک أمرا — اس مجموعہ میں وہ

مضامین بھی شامل ہیں، جو دینی مدارس پر دہشت گردی کے الزام اور اس سلسلے میں پروپیگنڈہ سے متعلق ہیں، جو آر ایس ایس اور وی ایچ پی کی جانب سے مختلف موقعوں پر اُٹھائے جاتے رہے ہیں، اس عنوان پر کئی مضامین شامل اشاعت ہیں، جو مختلف الگ الگ موقعوں پر ان الزام تراشیوں کے پس منظر میں لکھے گئے ہیں، ان میں کہیں کہیں تکرار بھی محسوس ہوگی؛ لیکن یہ تکرار الگ الگ سیاق میں ہے؛ اس لئے انشاء اللہ وہ نفع سے خالی نہیں، ''منصف'' کے مضامین کے علاوہ اس مجموعہ میں بعض وہ مضامین بھی شریک اشاعت ہیں، جو کسی سمینار یا سمپوزیم کے لئے لکھے گئے ہیں؛ لیکن ان کی افادیت ان پروگراموں تک محدود نہیں تھی۔

آج کل ایک غلط فہمی یہ پھیلی ہوئی ہے کہ علماء عصری تعلیم کے مخالف ہیں؛ حالاں کہ علماء نے کبھی بھی ایسی بات نہیں کہی، علماء کو اس تہذیب وثقافت سے اختلاف تھا اور ہے، جس کو ماڈرن ایجوکیشن کا جزو بنا دیا گیا ہے، اس پس منظر میں راقم الحروف نے بعض مضامین لکھے ہیں، جن میں عصری تعلیم کی اہمیت اور اس سلسلہ میں اسلامی نقطۂ نظر کو واضح کیا گیا ہے اور یہ تصور پیش کیا گیا ہے کہ اسلامی ماحول میں اور اخلاقی اقدار کے ساتھ عصری تعلیم ہونی چاہئے اور خود علماء کو اس نظام کو اپنے ہاتھ میں لینا چاہئے، اس ذیل میں مسلمانوں کی سائنسی خدمات سے متعلق بعض مضامین بھی شامل کئے گئے ہیں؛ تاکہ نئی نسل اپنے اسلاف کے کارناموں سے واقف ہوسکے اور احساس کمتری سے نجات پاسکے۔

اللہ تعالیٰ علم نافع اور عمل صالح سے حظ وافر عطا فرمائے میرے لڑکے عزیزی مولوی محمد عمر عابدین قاسمی مدنی سلمہ اللہ تعالیٰ کو، کہ انھوں نے بڑی محنت سے ان منتشر مضامین کو جمع کیا ہے اور پھر انھیں ترتیب دیا ہے، دُعاء ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی حیات میں برکت عطاء فرمائے، ان سے دین اور علم دین کی خوب خوب خدمت لے اور یہ مجموعہ عنداللہ اور عندالناس مقبول ہو۔

ربنا تقبل منا إنک انت السمیع العلیم۔

۱۵؍شعبان ۱۴۲۵ھ — **خالد سیف اللہ رحمانی**

یکم اکتوبر ۲۰۰۴ء — (خادم المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد)

عرضِ مرتب

دینی مدارس برصغیر میں تقریباً ڈیڑھ سو سالوں سے حفاظت دین اور اشاعت دین کا فریضہ انجام دے رہے ہیں اور موجودہ ہندوستان میں اسلامی تہذیب کے جو جلوے ہمیں نظر آتے ہیں، وہ ان ہی مدارس کی دین ہیں، یہ ایک حقیقت ہے کہ دینی مدارس نے اسلام کی فکری سرحدوں کی حفاظت کے لئے ایسی ٹیم تیار کی ہے، جو اپنے زمانہ کے چیلنجوں کا سینہ سپر ہو کر مقابلہ کرنے کی مکمل صلاحیت اور ہر طرح کی قربانی دے کر امت کے ایمان وعقیدہ کی حفاظت کا حوصلہ رکھتی ہے، یہی وجہ ہے کہ اگر ہم ماضی قریب کی تاریخ کے اوراق کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کہ جب بھی اسلام کے خلاف کوئی آندھی اُٹھی تو ان مدارس کے فضلاء نے ہی اس بادسموم کا مقابلہ کیا اور اُمتِ محمدیہ کو راہ حق کی رہنمائی کی۔

یہ بات ظاہر ہے کہ مدارس کا اصل مقصد اسلام کی حفاظت اور اس کی اشاعت ہے؛ اسی لئے ہم دیکھتے ہیں کہ اس کے لئے ابتدائی دور میں ایسے قدم اُٹھائے گئے، جو اس دور کے چیلنجز کے مقابلہ کے لئے کارآمد ہو سکیں اور قرآن وسنت کی بنیادی تعلیم کے علاوہ نصابِ تعلیم میں ایسے مضامین شامل کئے گئے جو اس دور میں حفاظت اسلام اور اشاعت اسلام کے لئے موزوں تھے، اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ دارالعلوم دیوبند میں اس کے ابتداء قیام ہی کے وقت سنسکرت زبان کی باقاعدہ تعلیم کا نظم کیا گیا، آج جب کہ دینی مدارس کی تاریخ پر ایک صدی سے زیادہ کا عرصہ گذر چکا ہے، نظام تعلیم اور نصاب تعلیم کے سلسلہ میں غور مکرر کی ضرورت ہے؛ تاکہ موجودہ عہد میں اسلام کے خلاف جو آوازیں اُٹھ رہی ہیں، فضلاء ان کا جواب دینے کے لائق ہو سکیں، نیز مسلم معاشرہ میں علماء کے کردار اور ان کی خدمات کا دائرہ وسیع ہو اور ان کا دائرۂ کار مساجد یا مدارس ہی تک محدود نہ رہے، قارئین ان مضامین میں ان

مسائل پر بہت ہی متوازن اور حقیقت پسندانہ گفتگو سے استفادہ کرسکیں گے۔

آج کل مدارس سے متعلق جو سوالات مدارس کے مخالفین یا اس کے ہمدردان اور بہی خواہوں کے ذہن میں آتے ہیں، آپ ان سوالوں کا بھی صحیح جواب، معتدل اور متوازن انداز میں آئندہ صفحات میں پڑھیں گے اور ان مسائل سے متعلق واضح تجزیہ، دوٹوک تبصرہ اور مخلصانہ مشورہ آپ کو ملے گا، ان مضامین کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ ہر بات کو دلائل اور تاریخی حقائق کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے، مثلاً موجودہ حالات میں فضلاءِ دینی مدارس کی ذمہ داریوں کے تحت آپ نے علماء اور مشائخ کو مدرسہ اور خانقاہ سے باہر آکر اُمت کے دوسرے اہم مسائل کی طرف بھی توجہ دینے کی بات لکھی ہے اور اس کو مدلل کرنے کے لئے اسلاف کے مختلف الجہات کارناموں کو نہایت ہی متأثر کن لب ولہجہ میں پیش کیا ہے۔

اس کتاب کی اہمیت کے لئے یہی کافی ہے کہ یہ والد ماجد حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی کے آبگینۂ قلم سے نکلے ہوئے مضامین کا مجموعہ ہے جو روز نامہ ''منصف'' کے شمع فروزاں کالم کے تحت ہر ہفتہ لکھا جاتا ہے اور ہزاروں؛ بلکہ لاکھوں کی تعداد میں لوگ اس سے استفادہ کرتے ہیں، ان مضامین میں جہاں دینی مدارس کی اہمیت وضرورت، ان کی اطمینان بخش کارکردگی اور اُمت کے مسائل کو حل کرنے والے افراد کی تیاری جیسے پہلوؤں پر وضاحت سے روشنی ڈالی گئی ہے، وہیں دینی مدارس کے نظامِ تعلیم، نصابِ تعلیم اور فضلاء مدارس کی ذمہ داریوں کے سلسلہ میں اہم مشورے بھی دیئے گئے ہیں، جو یقیناً اس لائق ہیں کہ انھیں قبول کیا جائے اور اگر انھیں روبہ عمل لایا جائے تو اس سے انشاء اللہ دوررس تبدیلیاں آئیں گی۔

اس مجموعہ کا دوسرا حصہ عصری درسگاہ اور اس سے متعلق مسائل کا ہے، اس ضمن میں حضرت الاستاذ نے مختلف اہم عناوین پر قلم اُٹھایا ہے، دینی مدارس سے متعلق ہونے کے باوجود عصری درسگاہوں کے مسائل اور ان کے حل پر آپ کی جو نظر ہے وہ یقیناً باعث حیرت ہے، آپ نے فلکیات اور مسلم سائنس داں، میڈیکل سائنس اور مسلمانوں کی خدمات، موجودہ زمانہ میں تعلیم کو پیشۂ تجارت بنالینے جیسے اہم عناوین پر قلم اُٹھایا ہے، مضمون کی ندرت، انداز

بیان کی شگفتگی اور حالات سے ہم آہنگی کی وجہ سے ان مضامین کو ملک کے مختلف رسائل وجرائد نے شائع کیا ہے۔

تیسرے قسم کے مضامین دونوں نوع کی درسگاہوں کو پیش آنے والے مشترک مسائل کے تجزیہ سے متعلق ہیں، راقم الحروف نے ان مضامین کو مختلف جگہوں سے جمع کیا، جس سے خود اس کو فکری غذا حاصل ہوئی اور سوچنے کی نئی سمتیں اس پر روشن ہوئیں اور اب یہ مجموعہ کتابی شکل میں دوسرے اہل ذوق کے لئے پیش کیا جارہا ہے، دُعاء ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے بھی قبولیت سے نوازے۔

محمد عمر عابدین قاسمی مدنی
(ریسرچ اسکالر: المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد)

۱۷؍شعبان ۱۴۲۵ھ
۲؍اکتوبر ۲۰۰۴ء

دینی وعصری درسگاہیں— تعلیمی مسائل

دینی تعلیم اور دینی درسگاہیں

صفہ — پہلی اسلامی درسگاہ

پیغمبر اسلام ﷺ کی نبوت کا آفتاب جس قوم میں طلوع ہوا، وہ ایک ''اُمی'' قوم تھی، ''اُمی'' اسے کہتے ہیں جو لکھنا اور لکھی ہوئی چیز کو پڑھنا نہ جانتا ہو، اس میں شبہ نہیں کہ عربوں میں شعر وسخن اور زبان و ادب کا ایک خداداد مذاق تھا اور وہ اپنے کلام کے ذریعے بربطِ دل کو چھیڑنے، لہو کو گرمانے اور محبوب کے لب و عارض کا نقشہ کھینچنے میں بڑی مہارت رکھتے تھے؛ لیکن یہ اشعار اور ادبی سرمایہ زیادہ تر سینہ بہ سینہ ایک نسل سے دوسری نسل تک منتقل ہوتا تھا، وہ اپنے حافظہ سے تحریر کا کام لیتے اور صفحۂ قرطاس کے بجائے صفحۂ دل پر نقش کرنے کا اہتمام کرتے تھے، عربوں میں بعض لکھنے پڑھنے والے بھی تھے، رسول اللہ ﷺ اور بنو ہاشم کے شعب ابی طالب میں بائیکاٹ کا واقعہ حدیث وسیرت کی کتابوں میں موجود ہے، جس میں بائیکاٹ کا تحریری اعلان غلاف کعبہ کے ساتھ آویزاں کرنے کا ذکر ہے، قرآن مجید نے بھی ایک واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے کہ ایک مکی تاجر پر جب سفر کی حالت میں موت کا وقت آیا تو اس نے اپنے سامان کی ایک فہرست بنا کر سامان میں چھپا دی اور سامان رفقاء سفر کے حوالہ کر دیا، اسی فہرست نے چوری اور بد دیانتی کے راز کو افشاء کیا، (المائدۃ: ۱۰۸-۱۰۶) یہ اور اس طرح کے واقعات ظاہر کرتے ہیں کہ عربوں میں تحریر و کتابت کا ذوق موجود تھا؛ لیکن ایسے لوگوں کی تعداد بہت کم تھی، بعض اہل علم نے تو لکھا ہے کہ مکہ میں صرف سترہ افراد کو لکھنا آتا تھا:

''دخل الإسلام وفی قریش سبعة عشر رجلا کلھم یکتب'' (فتوح البلدان: ۶۱-۶۶۰)

مدینہ کا معاملہ اس سے بھی زیادہ گیا گزرا تھا، واقدی نے ان لوگوں کے نام ذکر کئے ہیں، جو مدینہ میں لکھنے سے واقف تھے، جن کی تعداد گیارہ سے آگے نہیں بڑھتی، (فتوح البلدان: ۶۴-۶۶۳) گو ان اعداد وشمار پر اعتماد دشوار ہے؛ لیکن اس میں شبہ نہیں کہ عرب کا بڑا حصہ جہالت اور

ناخواندگی کی گھٹاٹوپ تاریکی میں تھا اور نہ صرف علم کی دولت سے محروم تھا؛ بلکہ علم کی اہمیت، اس کی عظمت اوراس کی ضرورت وافادیت سے بھی نابلد تھا۔

یہ حالات تھے جب آپ ﷺ پر پہلی وحی نازل ہوئی، اس وحی میں شرک کی تردید اور خدا پر ایمان لانے کا صراحت کے ساتھ ذکر نہیں، جو قرآن کی دعوت کا عطر اور خلاصہ ہے، اس وحی میں ''آخرت'' کا تذکرہ نہیں، جو ایمان وعمل کا اصل محرک ہے، اس وحی میں آپ ﷺ کی نبوت ورسالت کا اعلان نہیں، جس پر اسلام کی پوری عمارت کھڑی ہے، اس ظلم و جور اور نااتفاقی کی مذمت نہیں جو عرب سماج کے مزاج میں داخل ہوگیا تھا اور اس وحی میں ان اخلاقی برائیوں اور پستیوں پر بھی کوئی تنقید نہیں، جن کی اصلاح کو آپ ﷺ نے اپنی زندگی کا مشن بنایا، یہ پہلی وحی انسانیت کو ''تعلیم'' کی طرف متوجہ کرتی ہے، اس میں پہلا لفظ ہی ''اقراء'' کا ہے، جس کے معنی ہیں: ''پڑھ'' پھر ان پانچ آیتوں میں دوجگہ تعلیم وتعلم کا ذکر ہے، ایک میں ''قلم'' کے ذریعۂ تعلیم ہونے کی طرف اشارہ فرمایا گیا: ''عَلَّمَ بِالْقَلَمِ'' یہ گویا کتابی تعلیم کی دعوت ہے، دوسری جگہ ان علوم کی تحصیل پر متوجہ کیا گیا جو ابھی انسان کی گرفت میں نہیں ہیں اور انسان کی محنت اور اللہ کی مدد سے ہی ان کو حاصل کیا جاسکتا ہے: ''عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ یَعْلَمْ'' گویا اس میں قیامت تک آنے والے سائنسی علوم اور ایجادات وانکشافات کی طرف بھی اشارہ کردیا گیا؛ کیوں کہ ''علم'' ہی تمام اعتقادی اور عملی واخلاقی بیماریوں کا علاج ہے۔

غرض آپ ﷺ دنیا میں علم کا چراغ بن کر آئے اور اس جہالت کو اپنا نشانہ بنایا جس کے سایہ میں برائیاں پنپتی ہیں؛ اس لئے قرآن مجید نے آپ ﷺ کی جس حیثیت کو زیادہ نمایاں کیا ہے وہ یہی ہے کہ آپ ﷺ ''معلم'' ہیں اور انسانیت متعلم: ''یُعَلِّمُھُمُ الْکِتَابَ وَالْحِکْمَۃَ'' (آل عمران: ۱۶۴) رسول اللہ ﷺ کی حیات طیبہ میں یہ پہلو اتنا نمایاں نظر آتا ہے کہ مکی زندگی میں بھی باوجود ہر طرح کی مشکلات اور دشواریوں کے آپ ﷺ نے اس کو نظر انداز نہیں فرمایا اور اپنے ایک جاں نثار کے مکان ''دارارقم'' کو — جو صفا کی چوٹی پر واقع تھا — تعلیمی وتربیتی مرکز بنایا، مکی زندگی کی ابتداء ہی میں نہ صرف مردوں؛ بلکہ عورتوں میں بھی پڑھنے

لکھنے کا ذوق پیدا ہوگیا تھا، اس کی واضح دلیل حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قبول اسلام کا واقعہ ہے، جس میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بہن اور بہنوئی کے قرآن پڑھنے کا ذکر ہے، قرآن کی کچھ سورتیں ان کے پاس لکھی ہوئی صورت میں موجود تھیں، اس سے معلوم ہوا کہ یہ پڑھنا صرف زبانی ہی نہ تھا، بلکہ کتاب کے ذریعہ تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ رضی اللہ عنہم کی ایسی تربیت فرماتے کہ وہ علم کے زیور سے آراستہ ہوکر دوسروں تک بھی علم کی روشنی پہنچاتے، انصار مدینہ کی خواہش پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کو مدینہ بھیجا جو لوگوں کو قرآن پڑھاتے اور علم سے آراستہ کرتے: ''فکان یقرئہم القرآن ویعلمہم'' (طبقات ابن سعد: ۱۱۸/۴، ط بیروت) جو لوگ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لاتے ان میں بھی علم کی طلب پیدا ہوجاتی، مدینہ میں ابھی کچھ ہی لوگ مشرف بہ اسلام ہوئے تھے اور حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ ابھی مدینہ تشریف بھی نہ لائے تھے کہ مدینہ سے حضرت رافع بن مالک انصاری رضی اللہ عنہ آستانۂ نبوت پر حاضر ہوتے ہیں اور قرآن کی تعلیم حاصل کرکے واپس ہوتے ہیں؛ تاکہ اہل مدینہ تک علم کی یہ امانت پہنچا سکیں۔ (التراتیب الاداریہ: ۱/۴۴)

مدینہ ہجرت فرمانے کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اولین کام یہی کیا کہ مسجد نبوی کی تعمیر فرمائی اور اسی مسجد سے متصل ایک ''چبوترہ'' تعلیمی مقصد کے لئے بنایا، جسے ''صفہ'' کہا جاتا تھا، یہ گویا اسلامی تاریخ کا پہلا مدرسہ تھا، اس مدرسہ میں غیر مقیم طلبہ بھی تعلیم حاصل کرتے تھے اور دارالاقامہ کا بھی نظم تھا، اس درس گاہ میں حالات ومواقع اور واردین کی بڑھتی گھٹتی تعداد کے لحاظ سے طلبہ کی تعداد کم وبیش ہوتی رہتی تھی، بعض حضرات کا خیال ہے کہ چار سو طلبہ نے بحیثیت مجموعی اس درس گاہ سے استفادہ کیا تھا اور قتادہ کی رائے ہے کہ مدرسہ صفہ سے مستفیدین کی تعداد نو سو تک پہنچتی ہے۔ (التراتیب الاداریہ: ۱/۴۰ ۳)

اس درس گاہ کے نصابِ تعلیم کا موضوع قرآن مجید اور احکام کی تعلیم تھی؛ لیکن اس کے علاوہ تحریر وکتابت پر بھی پوری توجہ دی جاتی تھی، جس کی عرب کے اس معاشرہ میں بڑی اہمیت تھی، حضرت عبداللہ بن سعید بن عاص انصاری رضی اللہ عنہ جو غزوۂ بدر میں شہید ہوگئے تھے، اچھے کاتب تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو کتابت سکھانے پر مامور فرمایا تھا، (الاصابہ: ۴۷۷۱) علم

وحکمت کے حصول میں آپ ﷺ نے دین و مذہب کے اختلاف کو بھی رکاوٹ نہیں بننے دیا؛ چنانچہ غزوۂ بدر میں جو مشرکین قید ہوکر آئے، ان میں جو لوگ کتابت سے واقف تھے، آپ ﷺ نے ان کا فدیہ یہی مقرر فرمایا کہ وہ مسلمان بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھائیں۔

یہ بات تو ظاہر ہے کہ جو صحابہ علم وفضل میں معروف تھے اور جن کے علم ومعرفت پر خود آپ ﷺ کو اتنا اعتماد تھا، کہ آپ ﷺ ان سے قرآن سیکھنے کی تلقین فرماتے تھے، یا کسی خاص فن جیسے علم الفرائض یا قضاء وغیرہ میں ان کی خصوصی مناسبت کا ذکر کرتے تھے، وہ ضرور اس درس گاہ میں فریضۂ تدریس انجام دیتے رہے ہوں گے اور چوں کہ دین سکھانا اور قرآن کی تعلیم دینا افضل ترین عبادت ہے؛ اس لئے ہر صحابی نے اپنی صلاحیت اور فراغِ وقت کے اعتبار سے اس میں حصہ لینے کی کوشش کی ہوگی؛ لیکن بعض صحابہ کا اس سلسلہ میں خاص طور پر ذکر ملتا ہے، حضرت عبداللہ بن سعید رضی اللہ عنہ کا ذکر اوپر آچکا ہے، حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ بھی اہل صفہ کو قرآن اور کتابت سکھانے پر مامور تھے، (مسند احمد: ۳۱۵/۵) اور حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ ''جن کو بارگاہ نبوی ﷺ سے سب سے بڑے قاری ہونے کی سند عطا فرمائی گئی'' کے ذمہ خاص طور پر قرآن پاک کی تعلیم تھی۔ (بیہقی: ۱۲۶/۶)

رسول اللہ ﷺ نے ''علم'' کو یہ عظمت عطا فرمائی کہ اسے خرید وفروخت کی جانے والی شئ قرار نہیں دیا؛ بلکہ اسے عبادت کا درجہ دیا، جسے خالصۃً اللہ کی خوشنودی اور خلق اللہ کی خدمت کے جذبے سے دوسروں تک پہنچایا جائے اور اسے سامان تجارت نہ بنایا جائے، حضرت اُبی کے ایک شاگرد نے ایک کمان تحفتاً پیش کی، انھوں نے آپ ﷺ سے اس کے بارے میں دریافت کیا، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اگر تم نے یہ کمان لی تو گویا آگ کی کمان حاصل کی، ''إن أخذتها فخذ بها قوسا من النار'' (بیہقی: ۱۲۶/۶) اس لئے جو اساتذہ اس درس گاہ میں خدمت پر مامور تھے، وہ فی سبیل اللہ خدمت کرتے تھے۔

جو طلبہ ''صفہ'' میں مقیم تھے، اہل مدینہ ان کے کھانے کا نظم کرتے تھے اور ان کو اپنا اور اپنے رسول ﷺ کا مہمان سمجھ کر ان کے ساتھ خوب اکرام کا معاملہ فرماتے تھے، ان کے

طعام کا نظم دو طریقوں پر ہوتا، اول یہ کہ خود صفہ میں کھانے کی چیز پہنچا دی جاتی، چوں کہ عربوں کی عام غذا کھجور تھی؛ اس لئے کھجور کے خوشے صفہ کے ستونوں سے لٹکا دئے جاتے، حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کے بارے میں مروی ہے کہ دو ستونوں کے درمیان رسی باندھ کر اسی رسی سے کھجور کے خوشے لٹکا دیتے، (التراتیب الاداریہ: ۱/ ۴۷۵) دوسرا طریقہ یہ تھا کہ لوگ کچھ طلبہ کو اپنے گھر لے جاتے اور ان کو کھانا کھلاتے، ایک موقع پر آپ ﷺ نے اعلان فرمایا کہ جس کے پاس دو اشخاص کے کھانے ہوں، وہ اپنے ساتھ تیسرے مہمان کو لے جائے، خود رسول اللہ ﷺ اپنے ساتھ دس طلبہ کو لے گئے، (مسند احمد: ۱/۱۹۷) حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کا مکان اہل صفہ کے لئے گویا سب سے بڑا مہمان خانہ تھا، ابن سیرین کی روایت ہے کہ سعد بن عبادہ ہر شب اسّی طلبہ کو اپنے یہاں شب کا کھانا کھلاتے تھے، (سیر اعلام النبلاء: ۱/ ۲۰۰) اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ عام طور پر دار الاقامہ میں طلبہ کی تعداد اسّی سے کم نہ ہوتی تھی۔

احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ان طلبہ کے قیام وطعام کے مسائل سے آپ ﷺ غافل نہ رہتے تھے اور کھانے کے معیار پر بھی نظر رکھتے تھے، ایک بار آپ ﷺ تشریف لائے، دستِ مبارک میں عصا تھا اور کھجور کا ایک خوشہ لٹکا ہوا تھا، یہ کھجور اچھی نہ تھی، آپ ﷺ نے لاٹھی سے اس خوشہ کو مارا اور فرمایا کہ اگر یہ شخص چاہتا تو اس سے بہتر کھجور بھی دے سکتا تھا، پھر آپ ﷺ نے ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا: قیامت کے دن یہ بھی ایسی ہی معمولی کھجور کھائے گا۔
(ابوداؤد، حدیث نمبر: ۱۶۰۸)

گو تعلیم کا اصل مرکز یہی ''صفہ'' تھا؛ لیکن یہ ایک چھوٹی سی جگہ تھی، جو آج مسجد نبوی کا حصہ ہے؛ اس لئے اگر واردین کی کثرت ہوتی اور طالبان علم کا اژدہام ہو جاتا، تو عارضی طور پر ان کو مختلف اہل علم پر تقسیم کر دیا جاتا کہ وہ ان کے طعام وقیام کا بھی نظم کریں اور تعلیم وتربیت کا بھی، اس سلسلہ میں وفد عبد القیس کا واقعہ سیرت کا ایک مشہور واقعہ ہے، رسول اللہ ﷺ نے ان کو صحابہ پر تقسیم فرما دیا، پھر آپ ﷺ نے استفسار حال بھی فرمایا کہ میزبان بھائیوں کا کیسا سلوک رہا؟ وفد نے بڑی تعریف کی اور کہا کہ انھوں نے رہائش کا بہتر انتظام کیا، اچھے کھانے کھلائے

اور شب و روز ہمیں کتاب وسنت کی تعلیم دیتے رہے: ''باتو او أصبحو ایعلمو ننا کتاب ربنا و سنۃ نبینا'' چنانچہ آپ ﷺ بہت خوش ہوئے اور وفد کے ایک ایک رکن سے ان کی تعلیم و تربیت کے بارے میں الگ الگ گفتگو کی۔ (مسند احمد: ۲۰۶/۴)

اس درس گاہ سے نہ صرف واردین استفادہ کرتے؛ بلکہ دور دراز کے علاقوں میں تعلیمی اغراض کے تحت درس گاہ کے فضلاء اور تربیت یافتگان بھیجے بھی جاتے، اسے ''گشتی نظام تعلیم'' سے بھی تعبیر کیا جا سکتا ہے؛ چنانچہ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ کچھ لوگوں نے قرآن وسنت کی تعلیم کے لئے کچھ لوگوں کو بھیجنے کی درخواست کی، آپ ﷺ نے ستر انصار کو اس خدمت کے لئے روانہ فرمایا، یہ لوگ ''قراء'' کہلاتے تھے، انھیں میں میرے ماموں حرام رضی اللہ عنہ بھی تھے، یہ حضرات رات میں تعلیم حاصل کرتے اور اس کا مذاکرہ کرتے تھے اور دن میں مسجد میں پانی لاکر رکھتے اور لکڑی کاٹ کر لاتے، جسے فروخت کر کے اہل صفہ کے لئے کھانے کا نظم کیا جاتا، رسول اللہ ﷺ نے ان حضرات کو بھیجا، یہ مشہور واقعہ ہے جو ''بئر معونہ'' کے نام سے معروف ہے اور جن میں ان حضرات کو دھوکہ دے کر شہید کر دیا گیا، (دیکھئے: طبقات ابن سعد: ۷۱/۳) اسی طرح کے بعض اور وفود کو بھی آپ ﷺ نے دور دراز علاقوں میں بھیجے ہیں، اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ''صفہ'' میں ''شبینہ تعلیم'' کا نظم تھا؛ تاکہ مشغول اور متأہل افراد بھی استفادہ کر سکیں، نیز یہ بات بھی ظاہر ہوئی کہ جیسے آج کل ''عالم'' اور ''فاضل'' وغیرہ سے سندیں موسوم ہیں، اس زمانہ میں جو لوگ تعلیم حاصل کر لیتے تھے ''قاری'' کہلاتے تھے؛ کیوں کہ ان کی تعلیم کا بنیادی حصہ قرآن مجید کا پڑھنا پڑھانا ہوتا تھا۔

مدینہ میں 'صفہ' کی اس درس گاہ کے علاوہ بعض اور مکاتب اور چھوٹی درس گاہیں بھی تھیں، حضرت مخرمہ بن نوفل رضی اللہ عنہ کا مکان تو ''دارالقراء'' ہی سے معروف تھا اور یہاں بھی درس کا ایک نظام قائم تھا، حضرت عبداللہ بن اُم مکتوم رضی اللہ عنہ کے بارے مروی ہے کہ وہ غزوۂ بدر کے کچھ ہی بعد تشریف لائے تو اسی ''دارالقراء'' میں مقیم ہوئے، (طبقات بن سعد: ۱۵۰/۴) اس سے ظاہر ہے کہ یہاں محدود پیمانہ ہی پر سہی، طلبہ کے قیام کا نظم بھی تھا؛ لیکن بہر حال مرکزی

حیثیت ''اسی درس گاہ صفہ'' کو حاصل تھی۔

یہی اولین درس گاہ ہے کہ دنیا میں جتنی دینی درس گاہیں آج تعلیم و تعلم کا فریضہ انجام دے رہی ہیں، یہ ان کا اصل سرچشمہ ہے؛ بلکہ ایک دینی تعلیم ہی پر منحصر نہیں؛ بلکہ یہی ہر علم نافع کا منبع ہے، جس کی بنیاد ایک نبی اُمی (ﷺ) کے ہاتھوں پڑی تھی اور جس کی ضوء سے مشرق و مغرب اور شمال و جنوب غرض دنیا کے ایک کونہ سے دوسرے کونہ تک تمام دانش گاہیں روشنی حاصل کر رہی ہیں اور اس کی عالم تاب کرنوں سے ذرہ ذرہ منور ہے — صد لاکھ سلام ہو اس درس گاہ کے معلم اول پر اور ان کے رفقاء عالی مقام پر!!

میں اس ذلت کو فراموش نہیں کرسکتا!

عطاء بن ابی رباح بڑے عالم تھے، حدیث کے بھی اور فقہ کے بھی، ۱۱۴ھ میں وفات ہوئی، یہ مکہ کی ایک خاتون کے غلام تھے، کالے بھی تھے، کانے بھی، ناک چپٹی، ہاتھ لنجے، پاؤں میں لنگ بھی تھا اور اخیر عمر میں مکمل ہی نابینا ہوگئے تھے، بال بہت گھنگھریالے تھے اور بہ قول ان کے تذکرہ نگاروں کے ناک چقندر کی سی تھی، بادشاہ وقت سلیمان بن عبدالملک ایک بار اپنے دو فرزندوں کے ساتھ ان کے پاس آیا، وہ نماز میں مشغول تھے، یہ منتظر رہے، شدہ شدہ عطاء کے لئے لوگوں کا ایک جم غفیر جمع ہوگیا، جب نماز سے فارغ ہوئے تو ایک حلقہ سا بن چکا تھا، لوگ احکامِ حج سے متعلق سوالات کرتے اور وہ جواب دیتے جاتے، یہاں تک کہ عطاء کی پشت بادشاہ اور شہزادوں کی طرف ہوگئی اور رُخ دوسرے حاضرین کی طرف، ظاہر ہے یہ بات کسی بھی طرح آدابِ شاہی سے میل نہ کھاتی تھی، سلیمان نے شہزادوں سے کہا کہ کھڑے ہوجاؤ، یہ کھڑے ہوگئے، پھر کہا کہ علم (دین) کے حاصل کرنے میں کوتاہی سے کام نہ لینا! خدا کی قسم! میں اس سیاہ غلام کے سامنے اپنی ذلت کو کبھی فراموش نہیں کرسکتا۔

(من اخلاق العلماء، ص:۱۳۱)

اللہ تعالیٰ نے جیسے اپنے دین کو باعزت بنایا ہے، اسی طرح اپنے دین کے علم سے بھی عزت واحترام کو متعلق رکھا ہے، اس لئے کہ دوسرے علوم کا مفاد اکثر انسان کی اپنی ذات ہوتی ہے اور دین کو سیکھنا اس کے لئے بھی نافع ہوتا ہے اور دوسروں کے لئے بھی، مسلمان خواہ کتنے ہی بڑے عہدہ پر پہنچ جائے، اگر اس میں ''مسلمانیت'' باقی ہے تو وہ ان لوگوں سے بے نیاز نہیں ہوسکتا جو دین کے بارے میں واقف ہوں اور جنھوں نے دین کو اس کے اصل سرچشموں قرآن وحدیث سے پڑھا ہے اور اگر بے نیاز ہے تو یہ دین سے بے اعتنائی کی علامت ہے،

خدا کی خوشنودی کے لئے جو علم حاصل کیا جائے، وہ انسان کو رعب و وقار سے ہمکنار کرتا ہے، لوگوں میں اس کی عظمت پیدا ہوتی ہے اور سلاطینِ وقت کی بھی جبین احترام اس کے سامنے خم ہوجاتی ہے!

حماد بن سلمہؒ بھی اپنے عہد کے بڑے علماء و محدثین میں تھے، اکثر محدثین نے ان سے براہِ راست یا بالواسطہ کسبِ فیض کیا ہے، مقاتل خراسانیؒ ناقل ہیں کہ میں ان کے یہاں گیا تو دیکھا کہ ان کے کمرہ میں ایک چٹائی ہے جس پر وہ بیٹھتے ہیں، تلاوت کے لئے قرآن مجید ہے، ایک تھیلی میں ان کے مسودات ہیں اور ایک وضو کرنے کا برتن ہے اور بس، میں وہیں تھا کہ کسی نے دروازہ پر دستک دی، آپ نے ایک کم سن بچی سے کہا کہ دیکھو کون ہے؟ لڑکی نے واپس آکر بتایا کہ گورنرِ بصرہ محمد بن سلیمان کا قاصد باریابی چاہتا ہے، آپ نے کہا کہ اسے کہو کہ تنہا آئے، قاصد آیا، سلام کیا اور گورنر کا خط پیش کیا، خط میں حماد سے خواہش کی گئی تھی کہ ایک مسئلہ پیش آگیا، وہ اس کے حل کے لئے تشریف لے آئیں؛ لیکن حماد بن سلمہؒ نے قلم و دوات لیا اور جواب لکھا کہ ہم نے اہل علم کو دیکھا ہے کہ وہ کسی کے پاس نہیں جاتے، اس لئے اگر کوئی مسئلہ درپیش ہو تو آپ خود آیا کریں اور دریافت کریں اور میرے پاس آنا ہو تو اس بات کا خیال رکھیں کہ تنہا آئیں، جاہ و حشم اور گھوڑے اور پیادہ فوجوں کے ساتھ آنے کی زحمت نہ کریں، ورنہ، نہ میں آپ کے ساتھ خیر خواہی کرسکوں گا اور نہ اپنے آپ ہی کے ساتھ۔

تھوڑی دیر گزری ہوگی کہ پھر دستک ہوئی اور خود گورنرِ بصرہ حماد کے دروازے پر منتظر باریابی تھے، آپ نے فرمایا کہ کہہ دیا جائے کہ تنہا داخل ہوں؛ چنانچہ محمد بن سلیمان تنہا داخل ہوئے، سلام کیا اور سامنے بیٹھ گئے، پھر گورنر نے دریافت کیا کہ یہ کیا بات ہے کہ جب میں آپ کو دیکھتا ہوں تو مجھ پر آپ کی ہیبت طاری ہوجاتی ہے؟ حماد نے ثابت بنانیؒ کے واسطہ سے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل کیا کہ ''عالم جب اپنے علم سے اللہ کی رضا چاہتا ہے تو ہر چیز اس سے مرعوب ہوتی ہے اور جب خزانہ جمع کرنے کے لئے علم حاصل کرتا ہے تو خود وہ ہر چیز سے ڈرنے لگتا ہے'' محمد بن سلیمان نے اپنا مطلوبہ مسئلہ دریافت کیا، پھر آپؒ

سے خواہش کی آپ کی کوئی حاجت ہوتو بیان فرمائیں، آپ نے کہا ایسی چیز دو جس سے دین میں کمی نہ ہو، گورنر نے پچاس ہزار دراہم کی پیشکش کی کہ اس کو اپنی ضرورت میں خرچ کریں، شیخ نے کہا: یہ ان ہی کو دے دو جن پر تم نے ظلم کیا ہے، گورنر بصرہ نے کہا کہ یہ وہ مال ہے جو مجھے میراث میں حاصل ہوا ہے، شیخ نے کہا: مجھے اس کی حاجت نہیں، گورنر نے دریافت کیا کہ اس کے علاوہ کوئی اور ضرورت؟ شیخ نے پھر وہی جواب دیا کہ ایسی چیز جس سے دین میں نقص نہ ہو، گورنر نے عرض کیا کہ اسے قبول کریں اور تقسیم کردیں، شیخ نے فرمایا: اگر میں تقسیم کروں تو عدل سے کام لوں جب بھی جس کو نہ ملے گا وہ میرے بارے میں کہے گا کہ اس نے عدل نہیں کیا اور اس طرح گنہگار ہوگا، اس لئے تم مجھے اس سے بچاؤ، اللہ تم سے تمہارے گناہوں کا بوجھ ہلکا کرے گا۔ (امام نووی، بستان العارفین، ص: ۹۲)

''علم'' سے بڑھ کر انسان کے لئے کوئی اعزاز نہیں اور جہل سے بڑھ کر انسان کے لئے کوئی وجہ رسوائی نہیں سدا زندہ، انسان کے لئے نافع اور فکر ونظر کے لئے خضر راہ وہ علم ہے جس کا رشتہ خدا سے جڑا ہوا ہو، جو انسان کو جینے کا سلیقہ سکھاتا ہو اور قلب ونظر کو تسکین وطمانینت عطا کرتا ہو، جو دنیا میں حقیقی انسان کو جنم دیتا ہو، ایسے انسان کو نہیں جس کی منزل معدہ اور صرف معدہ ہے، جو فانی دنیا سے آگے نہ دیکھتا ہو نہ سوچتا ہو، یہ علم کتاب وسنت سے حاصل ہوتا ہے، یہ علم اپنے لئے وجہ سکون، دوسروں کے لئے سامانِ ہدایت، آخرت میں باعثِ نجات اور قلب و روح کی بیماریوں کے لئے نسخۂ شفا ہے، مگر آج کتنے اہل نظر ہیں جن کی نظر حقیقت شناس نے اس حقیقت کو سمجھا ہے اور طلبِ علم کی اس راہ میں آبلہ پائی کی لذت اٹھائی ہے؟؟

(۱۳/ مارچ ۱۹۹۸ء)

دینی تعلیم کا نظام — وقت کی اہم ضرورت

کسی بھی مذہب اور فکر وعقیدہ کے لئے تعلیم کی حیثیت شہ رگ کی ہے، اگر کسی قوم کو اس کے دین سے محروم کرنا ہو تو اس کے دینی تصورات سے اس قوم کا علمی رشتہ کاٹ دیجئے، یہ چیز خود بخود اس قوم کو اپنے مذہب سے بے گانہ بنادے گی، اس کے لئے پنجہ آزمائی کی ضرورت پڑے گی اور نہ معرکہ آرائی کی، یہ کسی قوم کو فکری اور مذہبی اعتبار سے قتل کرنے کا ایسا کامیاب اور بے ضرر نسخہ ہے کہ بقول شاعر :

دامن پہ کوئی چھینٹ ، نہ خنجر پہ کوئی داغ
تم قتل کرو ہو کہ کرامات کرو ہو !

ہندوستان میں اس وقت مسلمانوں کے ساتھ یہی طرز عمل اختیار کرنے کی کوشش کی جارہی ہے، انگریز جب ہندوستان میں آئے، تو انھوں نے بھی یہ ناکام کوشش کی؛ چنانچہ لارڈ میکالے جب فورٹ ولیم کالج قائم کرنے کے بعد برطانیہ واپس گئے، تو انھوں نے برطانوی دارالعوام میں اپنے اس منصوبہ کو ان الفاظ میں ظاہر کیا: ''میں ہندوستان میں ایک ایسے ادارہ کی بنیاد ڈال کر آیا ہوں کہ اس کی وجہ سے ہندوستان میں رہنے والے رنگ ونسل کے اعتبار سے تو ہندوستانی رہیں گے؛ لیکن اپنی فکر اور ذہن و دماغ کے اعتبار سے انگریز بن جائیں گے'' چنانچہ اس ملک کے دردمند علماء نے اس حقیقت کو محسوس کرلیا اور انھوں نے ہندوستان کے مختلف علاقوں میں دینی مدارس اور مکاتب قائم کرکے اس بات کا انتظام فرمایا کہ اس ملک میں بسنے والے مسلمان گو رنگ ونسل کے اعتبار سے ہندوستانی ہوں؛ لیکن وہ دل ونگاہ کے اعتبار سے ''حجازی'' بنے رہیں اور پیغمبر اسلام محمد رسول اللہ ﷺ کا دامن نبوت ان کے ہاتھوں سے چھوٹنے نہ پائے۔

جب ملک آزاد ہوا تو مسلمانوں نے اس جذبہ کے ساتھ جنگ آزادی میں شرکت کی کہ وہ اس ملک کے مالکوں میں ہوں گے، اس ملک میں ان کا مذہب، ان کی تہذیب اور ان کی زبان محفوظ رہے گی؛ لیکن بدقسمتی سے انگریزوں نے اس ملک میں فرقہ پرستی کا بیج بویا اور اس شجر خبیث کو اتنا تناور کردیا کہ آزادی کے بعد بھی اس کی جڑیں پھیلتی رہیں اور آج تو فرقہ پرست طاقتیں بامِ اقتدار تک پہنچ چکی ہیں، جہاں انھیں اس ملک میں معاشی طور پر پس ماندہ، سیاسی اعتبار سے مفلوج و بے اثر اور جان و مال کے اعتبار سے غیر محفوظ و غیر مامون کرنے کی کوششیں کی گئیں، وہیں مسلمانوں کی تہذیب پر بھی یلغار کی گئی اور کوشش کی گئی کہ تہذیبی اعتبار سے ان کا ہندوکرن کردیا جائے اور اس بات کی بھی بھرپور کوشش کی جارہی ہے کہ مسلمانوں کو ان کے مذہب اور عقیدہ سے دور کردیا جائے؛ تاکہ ایک دو نسل کے بعد وہ مذہبی شعور سے پوری طرح محروم ہوجائیں۔

مسلمانوں پر یہ سب سے بڑا حملہ اور ضربِ کاری ہے اور اس سے معمولی سا تغافل بھی ان کے ملی وجود اور بقا کے لئے زبردست خطرہ ہے—فرقہ پرست طاقتیں اس مقصد کے لئے دوطرفہ حملہ کررہی ہیں، ایک طرف سرکاری درس گاہوں کے نصاب میں ایسی تبدیلیاں لائی جارہی ہیں جو ایک سیکولر ملک کے بجائے خالص ہندو تصورات پر مبنی ملک کی نمائندگی کرتی ہوں، ہندو دیویوں اور دیوتاؤں کے حالات، ہندو فکر و عقیدہ کی وکالت اور ہندو تاریخ کی عظمت اور تفوق کا اظہار، مسلم حکمرانوں کے مفروضہ ظلم و جور کا بیان، یہاں تک کہ بعض اوقات خود پیغمبر اسلام ﷺ کی حیاتِ طیبہ پر حرف گیری اس ''بھگوا نصابِ تعلیم'' کی فکری بنیادیں ہیں ''وندے ماترم'' اور ''سرسوتی وندنا'' اقلیتوں کو مشرکانہ تصورات سے مانوس کرنے کی ناپاک کوشش ہے اور بعض ریاستی حکومتیں یہ منصوبہ بھی بنارہی ہیں کہ پانچویں جماعت سے اوپر کوئی نجی سرکاری درس گاہ قائم نہیں کی جاسکتی، گو یہ ایسا خواب ہے جو ملک کے موجودہ معاشی حالات کے تحت ہرگز شرمندۂ تعبیر نہ ہوگا؛ لیکن اس سے فرقہ پرست عناصر کے ناپاک منصوبوں کا اندازہ تو کیا ہی جاسکتا ہے۔

دوسری طرف دینی مدارس کے نظام میں دخیل ہونے اوران اداروں کو بدنام کرنے کی کوششیں بھی جاری ہیں ، بہار میں مدتوں پہلے گورنمنٹ نے دینی مدارس کو نصابِ تعلیم میں معمولی ترمیم کی شرط پر اعانت دینے کی پیش کش کی تھی اور اس کے لئے ''بہار مدارس اکزامنیشن بورڈ'' کی بنیاد رکھی تھی ، ریاست کے وہ مخلص بزرگ علماء جو حالات کی نبض پہ انگلی رکھتے تھے ، نے مدارس کو اس سرکاری بورڈ میں شریک ہونے سے روکنے کی بڑی کوششیں کیں ؛ لیکن سرکاری اعانتوں کی پیش کش نے اکثر ارباب مدارس کے قدم ڈگمگا دیئے اور انھوں نے اس کو ایک ''نعمتِ غیر مترقبہ'' سمجھ کر بے تحاشہ الحاق کرانا شروع کیا، گورنمنٹ نے بتدریج ان مدارس کے نصاب اور نظام میں ایسی تبدیلیاں کیں کہ اب ان کو دینی درس گاہ کہنا ایک تہمت سے کم نہیں اور افسوس کہ ان کو ایک معیاری عصری درس گاہ بھی نہیں کہا جا سکتا، اسی قسم کی کوشش مشرقی اتر پردیش میں شروع ہوئی اور کسی قدر تاخیر سے سہی ؛ لیکن اب وہاں بھی اس کا اثر محسوس کیا جا رہا ہے — جو دینی مدارس حکومت کے زیر اثر نہیں ہیں اور اس کے عمل و دخل سے آزاد ہیں، ان کو بدنام کرنے اور ان کی تصویر مسخ کرنے کی بھرپور کوشش کی جا رہی ہے، کبھی اس کو ''آئی ، ایس ، آئی'' کا مرکز قرار دیا جاتا ہے، کبھی ان مدارس کی طرف دہشت گردی کو منسوب کیا جاتا ہے، کبھی ان کے مالی وسائل کے بارے میں شکوک وشبہات ظاہر کئے جاتے ہیں ، تاکہ خاص طور پر غیر مسلم بھائیوں کا ذہن ان اداروں کے بارے میں مسموم ہو جائے۔

ان حالات میں دینی تعلیم کی ضرورت اور بڑھ گئی ہے، دینی تعلیم حاصل کرنے کے دو درجے ہیں : ایک تو اتنی تعلیم جو ہر شخص کے لئے ضروری ہے، یہ دین کے بارے میں بنیادی واقفیت ہے، توحید اور شرک کی حقیقت ، نبوت و وحی کا اسلامی تصور ، انبیاء اور بالخصوص پیغمبر اسلام ﷺ کے ضروری حالات ، پاکی و ناپاکی ، نماز ، روزہ ، حج و زکوٰۃ اور قربانی کے بنیادی احکام، نکاح وطلاق، خرید وفروخت ، ملازمت اور نوکری، کسبِ معاش کے حلال وحرام طریقے ، شریعت کی حرام کی ہوئی چیزوں وغیرہ سے متعلق ضروری مسائل، صحابہ اور صحابیات کی مبارک زندگیوں سے متعلق بنیادی معلومات ، والدین ، اولاد ، میاں بیوی اور اعزہ واقرباء سے متعلق

حقوق، شب وروز کئے جانے والے افعال کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کی سنتیں اور مسنون وماثور اوراد واذکار، یہ وہ امور ہیں کہ جن کے بارے میں جاننا ہر مسلمان پر فرض ہے، مرد ہو یا عورت اور جوان ہوں یا بوڑھے، اس مقصد کے لئے جگہ جگہ دینی مکاتب اور بالغوں کے لئے دینی تعلیم کے مراکز قائم کرنے کی ضرورت ہے، کوشش کرنی چاہئے کہ کوئی محلہ اور کوئی مسجد ایسے مکاتب اور مراکز سے خالی نہ ہو؛ بلکہ بچوں اور بچیوں کے اسکول کے اوقات کے لحاظ سے صباحی اور مسائی دونوں طرح کے مکاتب ہوں اور کوشش کی جائے کہ محلہ کا کوئی بچہ اور دین سے ناواقف کوئی نوجوان ایسا نہ رہے جو اس نظام سے فائدہ نہ اُٹھائے۔

لیکن دوسری ضرورت ایسی درس گاہوں کی ہے، جہاں قرآن وحدیث، کلام وعقیدہ اور سیرت نبوی سے متعلق اعلیٰ تعلیم دی جاتی ہو اور اسلام کو اصل مآخذ سے سمجھنے اور سمجھانے کی غرض سے عربی زبان وادب میں بصیرت کا سامان فراہم کیا جاتا ہو، بحمداللہ ہندوستان کے چپہ چپہ میں ایسے مدارس موجود ہیں، یہ اسلام کی فکری سرحدوں کے محافظ ہیں، ان ہی درس گاہوں سے نکلنے والے فضلاء نے ہر عہد میں اسلام کے خلاف اٹھنے والی فکری شورشوں کا مقابلہ کیا ہے۔

ہندوستان میں مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد مسیحی پادریوں اور مبلغوں کا ایک سیلاب سا اُمڈ آیا، دیہات دیہات یہ مبلغین پہنچتے، بھولے بھالے مسلمانوں کو گمراہ کرنے کی کوشش کرتے اور مناظرہ کا چیلنج دیتے، یہ حضرات علماء ہی ہیں جنھوں نے ان سے پنجہ آزمائی کی اور اسی دور میں ایک ہندوستانی عالم مولانا رحمت اللہ کیرانوی نے عیسائیت کے رد میں ''اظہار الحق'' کے نام سے ایک ایسی کتاب تالیف کی کہ اس موضوع پر کسی زبان میں اس کی نظیر نہیں ملتی اور ہندوستان سے مصر و ترکی تک مشہور عیسائی مناظر پادری فنڈر کا تعاقب کر کے اس کو راہ فرار اختیار کرنے پر مجبور کیا، پھر جب آریہ سماجی تحریک اُٹھی اور اس نے شدھی یعنی مسلمانوں کو ہندو بنانے کی کوششیں شروع کیں، تو یہ علماء ہی تھے جو اس کے مقابلہ کے لئے کھڑے ہوئے اور فتنہ کا ایسا علمی اور تبلیغی تعاقب کیا کہ ان کی ناپاک کوششیں ذرا بھی بارآور نہ ہو پائیں۔

اسی طرح جب انگریزوں کی شہ پر پنجاب کے ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ کی ختم

نبوت پر حملہ کیا اور جھوٹی نبوت کا ڈھونگ رچایا، تو یہی علماء تھے جنھوں نے اُمت کو اس عظیم فتنہ سے بچانے کی سعی کی اور پورے برصغیر میں اپنی مجاہدانہ کوششوں سے مسلمانوں کے دین وایمان کی حفاظت فرمائی، اسی طرح انکارِ حدیث کا فتنہ اُٹھا، مستشرقین نے اسلام کے بارے میں تشکیلی کی مہم چلائی، تاکہ مسلمانوں کی نئی نسل کے قلوب میں ان کے مذہب کے تئیں شکوک وشبہات کے کانٹے چبھو دیئے جائیں، ان ہی مدارس کے فضلاء نے ان سازشوں کے مقابلہ کے لئے لوح وقلم کی امانت سنبھالی اور وقت کے اُسلوب میں ان کا رد فرمایا، پھر جب ماضی قریب میں شریعت اسلامی کو فکری اور عقلی حملوں کا نشانہ بنایا گیا اور مسلم پرسنل لاء میں تبدیلی کی کوشش کی گئی، تو پورے ملک میں ان مدارس کے تعلیم یافتہ اور پرداختہ فضلاء نے ایک تحریک کی شکل میں ''مسلم پرسنل لاء'' کے تحفظ کا بیڑہ اُٹھایا اور مسلمانوں میں اس مسئلہ پر شعور پیدا کیا۔

حقیقت یہ ہے کہ اس ملک میں اسلام کی حفاظت وصیانت میں دینی مدارس کا اتنا نمایاں اور اہم کردار ہے کہ کسی حقیقت پسند کے لئے اس سے انکار ممکن نہیں، اسی لئے اُمت میں ایک ایسے طبقہ کا وجود ضروری ہے جو اسلام کا تحقیقی اور کتاب وسنت کا تفصیلی علم رکھتا ہو، اپنے عہد کے فکری اور فقہی مسائل کو حل کرنے کا اہل ہو، نیز اسلام کے خلاف اُٹھنے والے علمی وفکری فتنوں کا مقابلہ کرسکتا ہو اور ہر دور میں اس دور کی زبان اور طریقۂ استدلال کی رعایت کے ساتھ اسلام کی ترجمانی کی صلاحیت رکھتا ہو، ہونا تو یہ چاہئے کہ ہر خاندان میں ایسا ایک عالم موجود ہو؛ لیکن جب مدینہ میں ۸۰ اشخاص نے اسلام قبول کیا تو آپ ﷺ نے ان کی تربیت کے لئے حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کو بھیجا، اس سے معلوم ہوا کہ کم سے کم ہر اسّی مسلمان پر ایک عالم ہونا چاہئے، اس وقت صورتِ حال یہ ہے کہ علماء کی تعداد ایک فیصد بھی نہیں، بیس کروڑ کی مسلمان آبادی میں اگر ایک فیصد بھی عالم ہو، تو ان کی تعداد بیس لاکھ ہونی چاہئے؛ لیکن پورے ملک میں علماء کی تعداد شاید دو لاکھ بھی نہ ہو، گویا مسلم آبادی میں ان کا تناسب ایک فی ہزار بھی نہیں، اس لئے یہ سمجھنا کہ دینی مدارس ضرورت سے زیادہ ہیں، محض ناواقفیت کی بات ہے!

علامہ اقبالؒ ان لوگوں میں تھے، جن کو مشرق دیدہ اور مغرب رسیدہ کہا جاسکتا ہے، حکیم

احمد شجاع نے اپنی کتاب ’’خون بہا‘‘ (۱/ ۴۳۹) میں اقبالؒ سے اپنی ایک دلچسپ گفتگو نقل کی ہے، جوان لوگوں کے لئے یقینا چشم کشا ہے، جوان دینی مدارس کے نظام کوفرسودہ اور (Outof date) تصور کرتے ہیں، حکیم صاحب کا بیان ہے :

> لاہور میں آ کر میں نے پاک پٹن شریف کے مسلمانوں کی نفسیاتی کیفیت اوراپنے ان احساسات کی روداد ڈاکٹر محمد اقبال کو سنائی، وہ پہلے تو حسبِ عادت میری بات غور سے سنتے رہے، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انھیں میرے احساسات سے ہمدردی ہے، پھر آنکھیں بند کرکے سوچنے لگے، جب میں اپنی کہانی سنا چکا تو فرمایا: ’’جب میں تمہاری طرح جوان تھا تو میرے قلب کی کیفیت بھی ایسی ہی تھی ، میں بھی وہی کچھ سوچتا تھا جو تم چاہتے ہو، انقلاب ایک ایسا انقلاب ہو جو ہندوستان کے مسلمانوں کو مغرب کی مہذیب ومتمدن قوموں کے دوش بدوش کھڑا کردے‘‘ پھر علامہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: ’’انمکتبو ں اور مدرسوں کو اسی حالت میں رہنے دو، غریب مسلمان کے بچوں کو انھیں مدرسوں میں پڑھنے دو‘‘ اگر یہ ملا اور درویش نہ رہے تو جانتے ہو کیا ہوگا؟ اب جو کچھ میں اپنی آنکھوں سے دیکھ آیا ہوں ، اگر ہندوستان کے مسلمان ان مدرسوں کے اثر سے محروم ہو گئے، تو بالکل اسی طرح جس طرح اندلس میں مسلمانوں کی آٹھ سو برس حکومت کے باوجود آج غرناطہ اورقرطبہ کے کھنڈر اور الحمراء اور باب الاخوتین کے نشانات کے سوا اسلام کے پیرؤں اور اسلامی تہذیب کے اثر کا کوئی نقش نہیں ملتا، ہندوستان میں بھی آگرہ کے تاج محل اور دلی کے لال قلعہ کے سوا مسلمانوں کی آٹھ سو سالہ حکومت اوران کی تہذیب کا کوئی نشان نہیں ملے گا۔

اسلام کی حفاظت واشاعت
اور
ملک وقوم کی تعمیر میں دینی مدارس کا حصہ *

الحمد للہ رب العالمین والصلاۃ والسلام علی سید المرسلین وعلیٰ آلہ واصحابہ اجمعین! امابعد

حضرات! اس ملک میں دینی مدارس کی ایک روشن تاریخ رہی ہے، ایک زمانہ وہ تھا جب اس ملک پر مسلمانوں کے اقتدار کا سورج چمک رہا تھا، ہر صبح جب آفتاب نکلتا تھا تو اس کی کرنیں اس امت کی خوش بختی اور سعادت نصیبی کے نغمے گاتی تھیں، مسلمان صرف اس ملک کی زمین اور اثاثہ واسباب کے ہی مالک نہیں تھے بلکہ انھوں نے لوگوں کے دل ودماغ کو بھی فتح کیا تھا، وہ اس ملک میں محبت کی بادنسیم، رحمت کی گھٹائے گھنگھور اور انسانیت کے علمبردار بن کر آئے، انھوں نے انسانوں کو انسانوں کی غلامی سے آزاد کیا، انسانی مساوات وبرابری کا سبق دیا اور لوگوں کے دلوں پر اپنی محبت اور انسانیت نوازی کے نقوش جاوداں ثبت کردیئے، پھر اس ملک پر انگریز قابض ہوئے اور انھوں نے اپنے ہاتھ میں عنان اقتدار ہی لینے پر اکتفاء نہیں کیا بلکہ اس بات کی بھی کوشش کی کہ ہندوستان پر مغربی تہذیب وثقافت کو مسلط کردیا جائے اور ایک ایسی نسل کو وجود بخشا جائے، جو رنگ وروپ میں تو ہندوستانی ہو، لیکن اس کا دل ودماغ اس سے چھین لیا گیا ہو۔

* یہ افتتاحی خطبہ ہے، جو دینی مدارس بورڈ آندھرا پردیش کے زیر اہتمام منعقدہ ''دینی مدارس کنونشن ۱۵اپریل ۲۰۰۳ء'' کو جامعہ انوار الہدیٰ حیدرآباد میں پڑھا گیا۔

ان حالات میں کچھ زمانہ شناس اور دردمند علماء ومشائخ کو فکر ہوئی کہ اقتدار کا عروج وزوال ایک ایسی حقیقت ہے جس سے کسی قوم کو مفر نہیں، لیکن ایسا نہ ہو کہ زر وزمین کے ساتھ دل ودماغ کا سودا ہو جائے اور مسلمان دین وایمان کی دولت سے بھی محروم ہو جائیں، اس لئے انھوں نے خوب سوچ سمجھ کر تحریک مدارس کی بنیاد رکھی، سید الطائفہ حضرت امداد اللہ مہاجر مکیؒ جو اپنے عہد کے متفق علیہ بزرگ تھے اور ہر حلقہ میں احترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے، انھوں نے اپنے خلفاء کو اس کی تحریک فرمائی؛ چنانچہ دیوبند میں حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور ان کے رفقاء نے دار العلوم دیوبند کی، دکن میں معروف صاحب علم اور روشن ضمیر بزرگ فضیلت جنگ حضرت مولانا انوار اللہ فاروقیؒ نے جامعہ نظامیہ کی، ویلور میں ایک اور بزرگ نے مدرسہ باقیات الصالحات کی، بہار میں حضرت حاجی صاحب کے ہی ایک خلیفہ حضرت حاجی منور علی صاحبؒ نے مدرسہ امدادیہ دربھنگہ کی بنیاد رکھی اور ایک ایسی تاریخی اور انقلاب انگیز تحریک وجود میں آئی، جو اسلام کے احیاء اور تجدید کی تاریخ کا ایک ناقابل فراموش باب ہے، ہندوستان میں انگریزوں کے تسلط اور مسلم حکومت کے خاتمہ (جس کا مکمل ظہور ۱۸۵۷ء کی تحریک آزادی میں ہوا) کے بعد اس تحریک کی بنیاد پڑی اور اس وقت سے آج تک اس ملک میں اسلام اور مسلمانوں کے ملی تشخص کی حفاظت اور اسلام کے خلاف اٹھنے والے فتنہ کا مقابلہ کا سہرا اسی تحریک کے سر ہے، دینی مدارس کے اسی اہم کردار کی وضاحت کے لئے یہاں نمبروار چند نکات کا ذکر کیا جاتا ہے:

۱- ۱۸۱۳ء میں برطانوی پارلیمنٹ نے ایک بل پاس کیا کہ ہندوستانیوں کو عیسائی بنانے کے لئے اگر پادری وہاں جانا چاہیں تو انھیں اجازت ہے، اس کے بعد ہی سے ہندوستان میں بڑی تعداد میں عیسائی پادری اور تبلیغی وفود کا آنا شروع ہوا، ۱۹۰۰ء تک ہندوستان میں عیسائیوں کے ۴۲ مشن اپنا قدم جما چکے تھے،'' پادری ای اینڈ مینڈ نے برسرعام دعوت دی تھی کہ اب تمام ہندوستان میں ایک عمل داری ہوگئی، تار برقی سے سب جگہ کی خبر ایک ہوگئی، ریلوے سڑک سے سب جگہ کی آمد و رفت ایک ہوگئی، مذہب بھی ایک چاہئے، اس لئے

مناسب ہے کہ تم لوگ بھی عیسائی ایک مذہب ہوجاؤ‘‘(سیرت مولانا محمد علی مونگیری:۴۱)
انگریزوں کی کوشش تھی کہ ایسا نظام تعلیم مروج ہو، جو پادریوں کے لئے ان کی تبلیغی کوششوں میں معاون و مددگار ثابت ہو؛ تاکہ ہندوستان میں بڑے پیمانہ پر لوگ عیسائیت کو قبول کریں، سرچارلس ٹریویلین آئی سی ایس جو برطانوی کونسل کے ممبر تھے، نے ایک موقع پر ان خیالات کا اظہار کیا :

> میرا یقین ہے کہ جس طرح ہمارے بزرگ کل کے کل ایک ساتھ عیسائی ہوگئے تھے، اسی طرح یہاں بھی سب ایک ساتھ عیسائی ہوجائیں گے، ملک میں مذہب عیسوی کی تعلیم بلاواسطہ کتابوں، اخباروں اور یورپینیوں سے بات چیت وغیرہ کے ذریعہ نفوذ کرے گی ،حتیٰ کہ عیسوی علوم تمام سوسائٹی میں اثر کر جائیں گے،تب ہزاروں کی تعداد میں عیسائی ہوا کریں گے۔ (تاریخ التعلیم از سید محمود،ص:۶۹)

نتیجہ یہ تھا کہ گاؤں گاؤں اور قریہ قریہ عیسائی پادری اور منّاد مسلمانوں اور ہندوؤں کو دعوت ارتداد وتبدیلی مذہب دیتے تھے،سرسید احمد خان مرحوم سے اپنی رواداری اور حکومت برطانیہ کے حق میں نرم روی کے باوجود یہ کیفیت برداشت نہ ہوسکی، انھوں نے اپنے رسالہ بغاوت ہند میں اس کیفیت پر وضاحت سے روشنی ڈالی ہے، ان حالات میں اس فتنہ کے مقابلہ کے لئے وہی لوگ اُٹھے، جو دینی مدارس سے متعلق یا ان کے پروردہ تھے، انھوں نے شہر سے دیہات تک گلی کوچوں میں جاکر مسلمانوں کو اس فتنہ سے باخبر کیا، عیسائی مشنریز سے مناظرے کئے اور مسلمانوں کو ان کے دام ہم رنگ زمین سے بچایا، اس سلسلہ میں حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی، حضرت مولانا محمد علی مونگیری، حضرت نانوتوی اور حضرت مولانا ثناء اللہ امرتسری وغیرہ کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔

۲- ۱۸۳۵ء میں صوبہ پنجاب کے ایک قریہ قادیان میں مرزا غلام احمد قادیانی نامی شخص پیدا ہوا یہ خاندان شروع سے انگریزوں کا لقمہ خوار تھا، ان کے بڑے بھائی غلام قادر کو

جنرل نیکلسن نے ایک سند دی تھی، جس میں لکھا تھا کہ :

۱۸۵۷ء میں خاندان قادیان ضلع گورداس پور کے تمام دوسرے خاندانوں سے زیادہ نمک حلال رہا۔

یہ بات خود مرزا صاحب کے لڑکے مرزا محمود نے لکھی ہے، (سیرت حضرت مسیح موعود، ص:٦)

—— انگریز چاہتے تھے کہ اس اُمت کی وحدت ٹوٹ کر رہ جائے اور مسلمانوں میں جہاد کا جذبہ سرد پڑ جائے، اس کے لئے ان کو ایک ایسے شخص کی تلاش تھی، جو کسی عہدۂ غیبی کا مدعی ہو اور جہاد کے منسوخ ہونے کا اعلان کر سکے؛ چنانچہ انھوں نے مرزا غلام احمد قادیانی کو اس کے لے کھڑا کیا، جس نے مختلف دعوے کرتے ہوئے ۱۹۰۱ء میں کھل کر نبوت کا دعویٰ کر دیا، وہ اپنے مسیح موعود ہونے کا بھی مدعی تھا اور اس نے جہاد کو منسوخ قرار دیا تھا، حکومت برطانیہ اس فتنہ کے پشت پر تھی؛ چنانچہ خود مرزا صاحب نے اپنے آپ کو انگریزوں کا خود کاشتہ پودا قرار دیا ہے۔

قادیانیت دراصل پیغمبر اسلام ﷺ کے خاتم نبوت ہونے کے خلاف بغاوت اور متوازی نبوت کا اعلان تھا، اگر یہ کہا جائے کہ عہد صدیقی کے مدعیان نبوت کے فتنے کے بعد مسلمانوں کے درمیان ایسا سخت کوئی اور مذہبی فتنہ پیدا نہیں ہوا تھا، تو بے جا نہیں ہوگا، اس کو ایک طرف انگریزوں کی طرف سے تائید وتقویت حاصل تھی، تو دوسری طرف بہت سے ہندو بھی اس کی پشت پر تھے، یہاں تک کہ جواہر لال نہرو نے بھی مسلمانوں کو مشورہ دیا تھا کہ وہ اس ہندوستانی نبی پر ایمان لے آئیں؛ تاکہ ان کے اندر حب الوطنی پیدا ہو، مسلمان چوں کہ اس وقت مایوسی اور نا اُمیدی کے شکار تھے اور چاہتے تھے کہ ان کی مدد کے لئے کسی غیبی طاقت کا ظہور ہو، اس لئے اچھے خاصے لوگ یا تو اس فتنہ سے متاثر ہو رہے تھے یا اس فتنہ کی سنگینی سے بے خبر تھے، یہاں تک کہ ابتداء میں علامہ اقبالؒ جیسے بالغ نظر اور مخلص مسلمان بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہے، تا آں کہ اس موضوع پر علامہ انور شاہ کشمیری شیخ الحدیث دار العلوم دیوبند سے ان کی گفتگو ہوئی اور پھر انھوں نے نہ صرف اس فتنہ کی سنگینی کو محسوس کیا بلکہ نہایت ہی قوت کے

ساتھ اس کا تعاقب بھی کیا۔

اس فتنہ کی سنگینی اور اس کے مضر اثرات کو جن لوگوں نے پہلی نظر میں تاڑ لیا وہ علماء ہی تھے اور پھر علماء ہی نے نہ صرف برصغیر بلکہ پوری دنیا میں اس فتنہ کا پیچھا کیا، اس سلسلہ میں علامہ انور شاہ کشمیریؒ، مولانا سید محمد علی مونگیریؒ، مولانا انوار اللہ صاحب حیدرآبادی، مولانا ثناء اللہ امرتسریؒ، مولانا محمد حسین بٹالویؒ، پیر کرم علی شاہ، مولانا محمد یوسف بنوریؒ، مفتی محمد شفیع صاحبؒ، مولانا سید ابوالاعلی مودودیؒ وغیرہ کے نام خصوصیت سے قابل ذکر ہیں، ختم نبوت کا یہ معرکہ ہمیشہ ان ہی دینی مدارس کے فرزندوں یا ان کے تربیت یافتہ افراد نے سر کیا اور آج بھی جہاں کہیں اس شجر خبیث کا سایہ پہنچتا ہے، یہی بوریہ نشین علماء ہیں، جو ان کے مقابلہ کے لئے سینہ سپر ہوتے ہیں۔

۳- برطانوی حکومت کو اصل عداوت مسلمانوں سے تھی؛ کیوں کہ انھوں نے مسلمانوں ہی کے ہاتھ سے اقتدار کی زمام حاصل کی تھی اور اسی لئے فطری طور پر مسلمان جنگِ آزادی میں زیادہ سرگرم عمل تھے، ہندو برادران وطن کے ساتھ ان کا رویہ نرم رہتا تھا؛ چنانچہ بیسویں صدی کے اوائل میں آریہ سماجی تحریک نے بہت قوت حاصل کرلی، پنڈت دیانند سرسوتی نے ستیارتھ پرکاش، آریہ سماجی ہندو فکر کی تائید وتقویت کے لئے لکھی اور یوں تو اس میں سناتن دھرم، عیسائی اور مسلمان سبھوں کو نشانہ بنایا؛ لیکن ان کا سب سے زیادہ ہدف مسلمان تھے، آریہ سماجیوں نے گاؤں گاؤں شدھی تحریک یعنی مسلمانوں کو — بقول ان کے — سابقہ مذہب ہندو دھرم میں واپس لانے کی نہایت ہی گرم جوش کوششیں شروع کردیں، یہ مسلمانوں کو علانیہ مناظر اور مباحثہ کی دعوت دیا کرتے تھے، اس وقت ارتداد کی ایک لہر سی چل پڑی تھی اور بہت سے پسماندہ اور تعلیم سے محروم علاقے اس آگ کی لپیٹ میں آرہے تھے۔

اس وقت بھی دینی مدارس کے علماء اس فتنہ کے استیصال کے لئے کھڑے ہوئے، اسی نسبت سے میلۂ خدا شناسی میں مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی تقریروں اور مناظروں نے بڑی شہرت حاصل کی، جو لوگ اس فتنہ کے مقابلہ کے لئے کھڑے ہوئے ان میں مولانا نوتوی،

مولانا محمد علی مونگیری، مولانا ثناء اللہ امرتسری، مولانا عبدالصمد رحمانی وغیرہ خصوصیت سے قابل ذکر ہیں، آج یہ تاریخ کا ایک فراموش کردہ باب ہے؛ لیکن راجستھان کے حالات اس کی ایک معمولی سی جھلک ہیں، اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اگر اس وقت علماء نے اس کے سد باب کی کوششیں نہیں کی ہوتیں، تو آج حالات کتنے خراب ہوتے۔

۴ - فتنۂ ارتداد کو روکنے کی ایک کوشش فقہی جہت سے بھی ہوئی ہے، مسلمان عورتیں قاضی شرع کے موجود نہ ہونے کی وجہ سے بڑی دشواری محسوس کرتی تھیں اور وہ مرد کے ظلم وزیادتی کو روکنے اور دوسرا نکاح کرنے کے لئے کوئی حل نہیں پاتی تھیں؛ چنانچہ بعض عورتیں مرتد ہوجاتی تھیں، تاکہ ارتداد کی وجہ سے خود بخود ان کا نکاح ختم ہوجائے، اس صورت حال سے اس عہد کے علماء تڑپ اُٹھے اور انفساخ نکاح مسلم ایکٹ مرتب کیا اور اسے گورنمنٹ سے پاس کرایا، کہ عورتوں کے لئے فسخ نکاح کا جائز طریقہ کھلا رہے اور وہ ناجائز راستہ اختیار نہ کریں، یہی قانون اب تک عدالتوں میں مروج ہے، اس ایکٹ کے پیچھے جن لوگوں کا دماغ کام کررہا تھا ان میں حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ، حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ اور حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحبؒ کے نام خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

۵ - آزادی کے بعد فرقہ وارانہ فسادات کی کثرت، ملازمت وتجارت کے مواقع سے محرومی نے مایوسی وناامیدی کی کیفیت کے ساتھ ایک صورت حال یہ پیدا کردی ہے کہ پڑھے لکھے اور صاحب ثروت مسلمانوں نے دیہاتوں کو چھوڑ کر شہر کی پناہ لی ہے، نتیجہ یہ ہے کہ ہندوستان کے بہت سے علاقوں میں دیہاتوں کے مسلمان ارتداد کی سرحد پر کھڑے ہیں، حیدرآباد جیسے علمی، ثقافتی اور مذہبی اعتبار سے نمایاں شہر سے صرف پچاس اور سو کیلومیٹر پر جو دیہات واقع ہیں وہاں بھی بہت سے لوگ وہ ہیں جو کلمہ طیبہ پڑھنے سے بھی قاصر ہیں اور جن کی وضع قطع اور رہن سہن کو دیکھ کر یہ اندازہ لگانا بھی مشکل ہے کہ یہ مسلمان ہیں۔

ایسے دور دراز علاقوں میں دینی مدارس کے فضلاء پہنچ کر دعوتی کام کررہے ہیں اور ان کے لئے مکاتب قائم کررہے ہیں، جو ان کی حفاظت کا واحد ذریعہ ہیں، اگر یہ کوششیں نہ ہوتیں

تو لاکھوں مسلمان دولت ایمان سے محروم ہو چکے ہوتے اور اب بھی یہ کوششیں روک دی جائیں تو جہالت وناواقفیت کی وجہ سے دیہاتوں میں خدانخواستہ ارتداد کا سیلاب سا آجائے گا۔

۶ - مسلمان جہاں کہیں بھی ہوں، ان کے لئے صرف دین کو مان لینا کافی نہیں؛ بلکہ ان پر عمل کرنا بھی ضروری ہے، اسی لئے مسلمانوں پر (خواہ وہ کسی ملک میں ہوں) اپنی عائلی اور سماجی زندگی میں شریعت اسلامی پر عمل کرنا ضروری ہے، مدارس نے ہمیشہ تحفظ شریعت کی جدوجہد میں بڑا اہم کردار ادا کیا ہے، آزادی سے پہلے ۱۹۳۷ء میں حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ، حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحبؒ اور دوسرے اہل علم کی کوششوں سے شریعت اپلی کیشن ایکٹ بنا، بدقسمتی سے آزادی کے بعد رہنما اُصول کی ایک دفعہ کے تحت یکساں سیول کوڈ کی گنجائش پیدا کی گئی اور آہستہ آہستہ مسلم پرسنل لاء کی تنسیخ کا مطالبہ کیا جانے لگا، ۱۹۷۲ء میں لے پالک کے مسئلہ کو لے کر اس مسئلہ نے شدت اختیار کر لی، اس وقت علماء ہی تھے جو تحفظ شریعت کی تحریک کو لے کر اُٹھے اور آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کا قیام عمل میں آیا، اس سلسلہ میں امیر شریعت حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانیؒ، حکیم الاسلام حضرت قاری محمد طیب صاحبؒ، حضرت مولانا مفتی برہان الحق صاحب، خلیفہ مولانا احمد رضا خان صاحب بریلویؒ، مفتی عتیق الرحمن عثمانیؒ اور مولانا ابواللیث اصلاحیؒ وغیرہ کے نام خصوصیت سے قابل ذکر ہیں، آج نہ صرف اُمتِ مسلمہ بلکہ حکومت کی نظر میں بھی اس بورڈ کا جو وزن محسوس کیا جاتا ہے وہ محتاج بیان نہیں۔

۷ - آزادی کے بعد اور آزادی سے پہلے ہندوستان میں جو اسلامی تحریکات اُٹھی ہیں اور جنھوں نے نہ صرف ملک میں بلکہ بیرون ملک بھی گہرے اثرات ڈالے ہیں، وہ یا تو ان ہی مدارس سے نکلنے والے علماء کے ذریعہ وجود میں آئی ہیں اور نہیں تو کم سے کم مدارس سے ان کو خون جگر ضرور ملا ہے، ہندوستان میں مسلمانوں کی کوئی مذہبی اور سماجی تحریک ایسی نہیں جو اس سے مستثنیٰ ہو، اس سلسلہ میں خاص طور پر حضرت مولانا محمد الیاس صاحب کی تحریک دعوت و تبلیغ کا ذکر کروں گا، جو آج ایک عالمی تحریک بن چکی ہے، جو دور دراز علاقوں تک اسلام کی

بنیادی تعلیمات کو پہنچانے کا نہایت اثر انگیز ذریعہ ہے اور جس سے لاکھوں لوگ توبہ واصلاح کی دولت سے سرفراز ہورہے ہیں ، ایک بڑے صاحب نظر کے بقول مدارس کی حیثیت دراصل پاور ہاؤس کی ہے، جس سے ملت کے تمام کاموں کو غذا اور قوت حاصل ہوتی ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ ہندوستان میں بلکہ عالمی سطح پر اسلامی ثقافت کو ختم کرنے اور مسلمانوں کو مغربی اور برہمنی تہذیب میں جذب کرنے کی کوششوں میں یہ دینی مدارس پوری قوت کے ساتھ حارج ہیں، اسی لئے مدارس کا وجود ان کے لئے بہت ہی گراں خاطر ہے؛ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ اگر ہندوستان میں مدارس کی تحریک قائم نہ ہوتی اور ترقی نہیں کرتی تو شاید ہندوستان ایشیاء کا اسپین بن جاتا ، جہاں بلند و بالا ، حسین وجمیل اور پرشکوہ عمارتوں کی صورت میں مسلمانوں کے تہذیبی نقوش تو باقی رہتے ؛ لیکن اسلام کا نام ونشان باقی نہیں رہتا۔

یہ تو اسلام کی حفاظت وصیانت کا پہلو ہے، اب اس ملک کی تعمیر وترقی میں مدارس کا جو رول ہے، ایک نظر اس پر بھی ڈالنا چاہئے :

۱- بیسویں صدی کے آغاز سے جنگِ آزادی کی جو معرکہ آرائیاں ہوئی ہیں، ان میں پیش پیش علماء رہے ہیں، خلافت تحریک شروع ہی ہوئی تو علماء کی کوششوں سے، ترک موالات تحریک کے تن مردہ میں جان اس وقت پڑی جب حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ نے اس پر ایک تفصیلی فتویٰ دیا اور اس تحریک کو مذہبی رنگ میں پیش کیا، مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، مولانا رشید احمد گنگوہیؒ ، مولانا فضل حق خیرآبادیؒ ، شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ ، مولانا ابوالکلام آزادؒ، مولانا عبیداللہ سندھیؒ، مولانا محمد سجادؒ، مولانا حسین احمد مدنیؒ، مولانا حفظ الرحمن سیوہارویؒ وغیرہ یہ سب حضرات مدارس ہی سے تعلق رکھنے والے علماء تھے، جنھوں نے اپنے خونِ جگر سے اس ملک کی آزادی کی تاریخ رقم کی ہے۔

۲- ملک کے آزاد ہونے کے بعد مسلمانوں کو متحدہ ہندوستان کے حق میں ہموار کرنا اوران کو ترکِ وطن اور نقل مکان سے روکنا بھی علماء کا ایک بڑا کارنامہ ہے۔

۳- مدارس نے ملک کی تعمیر میں جو نہایت اہم رول ادا کیا ہے، ان میں تعلیم کو عام کرنا،

غریبوں اور دیہات کے پسماندہ لوگوں کو فری ایجوکیشن فراہم کرنا اور ایسے لوگوں تک علم کی روشنی پہنچانا جن کے لئے تمام درس گاہوں کے دروازے بند ہیں، نہایت اہم ہیں، انٹلی جینس بیورو کے مطابق اس وقت درج ذیل صوبوں میں مدارس اور طلباء کی تعداد اس طرح ہے :

	صوبہ	مدارس	طلباء
(۱)	آندھرا پردیش	۷۲۱	۷۲,۵۲۸
(۲)	آسام	۲۰۰۲	۲۰,۰۰۰
(۳)	دہلی	۱۱۶۱	۳,۷۲۲
(۴)	گجرات	۱۸۲۵	۲۰,۰۰۰
(۵)	جموں وکشمیر	۱۲۲	۱۰,۵۱۵
(۶)	کرناٹک	۹۶۱	۸۴,۸۶۴
(۷)	کیرالا	۹۹۷۵	۷۳۸,۰۰۰
(۸)	راجستھان	۱۷۸۰	۲,۵۰۴
(۹)	مدھیہ پردیش	۶۰۰۰	۴۰۰,۰۰۰
(۱۰)	مہاراشٹر	۲۴۳۵	۲۰,۳۹۷
(۱۱)	مغربی بنگال	۲۱۱۶	۹۰,۰۰۰
(۱۲)	مجموعہ	۲۹۰۹۸	۱۴۶۳۵۳۰

اس میں یوپی اور بہار کے مدارس اور طلباء کا ذکر نہیں ہے، جن کی تعداد یقینی طور پر دوسری ریاستوں سے زیادہ ہوگی، اس کے علاوہ ۲۱ ریاستوں کے اعداد وشمار بھی نہیں ہیں یہ تعداد بظاہر کافی مبالغہ پر مبنی معلوم ہوتی ہے، شاید اس میں مکاتب اور صباحی ومسائی تعلیمی نظام کو بھی شامل کرلیا گیا ہے؛ لیکن اس سے قطع نظر ان اعداد وشمار اور ان پر قیاس کرتے ہوئے جن صوبوں کے اعداد وشمار مذکور نہیں ہیں، ان کے اعداد وشمار کو سامنے رکھا جائے تو اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ کتنی بڑی تعداد میں بچے اس نظام تعلیم سے فائدہ اُٹھا رہے ہیں اور تعلیم اور خواندگی

کو عام کرنے میں ان کا کتنا اہم حصہ ہے، ہندوستان میں خواندگی کی قومی شرح ۱۹۵۱ء میں ۳۳۔۱۸ فیصد تھی، ۱۹۹۱ء میں یہ بڑھ کر ۲۱۔۵۲ فیصد ہوگئی اور ۲۰۰۱ء کی مردم شماری میں قومی خواندگی کی شرح ۶۲ فیصد سے زیادہ ہوچکی ہے، حکومت کی جانب سے غالباً مسلمانوں کی علیحدہ شرح خواندگی دستیاب نہیں ہے لیکن بعض پرائیوٹ اداروں نے جو سروے کیا ہے ان کے مطابق مسلمانوں میں خواندگی کی شرح ۳۰ فیصد سے بھی کم ہے اور مسلم خواتین میں تو شرح خواندگی ۱۰ فیصد بھی نہیں، گویا اب بھی مجموعی اعتبار سے ۷۰ فیصد مسلمان مرد اور ۹۰ فیصد مسلمان خواتین ناخواندہ ہیں، اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ مسلمانوں میں شرح خواندگی کا کیا حال ہے؟ ان حالات میں ان مدارس کے تعمیری رول کی اہمیت سمجھ میں آتی ہے۔

۴- معاشی پہلو سے بھی دیکھا جائے تو مدارس کا کردار نہایت اہم ہے، صورت حال یہ ہے کہ ملک میں بیروزگاری عام ہے، لاکھوں ڈاکٹرس اور انجینئرس بیروزگار ہیں، مسلمانوں میں بیروزگاری تو ظاہر ہے اس سے بھی زیادہ ہے، مرکزی حکومت کی ملازمتوں میں مسلمانوں کا موجودہ تناسب حسبِ ذیل ہے :

درجہ اول کی ملازمت	:	۶۱۔۱	فیصد
درجہ دوم کی ملازمت	:	۳	فیصد
درجہ سوم کی ملازمت	:	۴۱۔۴	فیصد
درجہ چہارم کی ملازمت	:	۱۲۔۵	فیصد

ریاستوں میں بھی اس سے بہتر صورت حال نہیں ہے؛ بلکہ بعض صوبوں میں مرکز سے بھی زیادہ خراب حالات ہیں، اب اس نقطۂ نظر سے دیکھیں کہ صرف گیارہ صوبوں میں حکومت کی رپورٹ کے مطابق ۲۹,۰۹۸ مدارس ہیں، اگر ہر مدرسہ میں اوسطاً دس افراد کا اسٹاف مانا جائے تو ان کی تعداد ۲۹,۰۹۸۰ ہوتی ہے، پھر اندازہ کیا جاتا ہے کہ ہندوستان میں کم از کم پانچ لاکھ مسجدیں ہیں، ہر مسجد میں ایک امام اور ایک موذن کی ضرورت پیش آتی ہے، گویا مسجدیں دس لاکھ افراد کے لئے روزگار کا ذریعہ بھی ہیں، اس طرح گیارہ صوبوں کے مدارس اور ملک

کے مساجد کے ذریعہ ۴۴,۰۸,۹۸۰ افراد کو روزگار ملتا ہے، وہ تعداد اس کے علاوہ ہے جو ملک کی دیگر ریاستوں میں مدارس کی ہے، تو اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ بیروزگاری کے مسئلہ کو حل کرنے میں بھی ان مدارس کا اہم حصہ ہے، یہ ضرور ہے کہ ان اداروں میں تنخواہیں کم ملتی ہیں اور مذہبی جذبہ کے تحت معمولی اُجرتوں پر لوگ کام کرتے ہیں؛ لیکن بہرحال یہ ایک بہت بڑی تعداد کے لئے روزگار کا ذریعہ ہیں۔

۵- اس وقت ملک میں بہت سی قوم دشمن تحریکیں سرگرم عمل ہیں، پورے ملک میں امن وقانون کی دھجیاں بکھیری جارہی ہیں، لوگوں کے مال واسباب پر منظم طور پر حملے کئے جاتے ہیں، بعض شدت پسند تنظیمیں وہ ہیں جن میں بڑی تعداد میں تعلیم یافتہ بیروزگار نوجوان شامل ہیں، حکومت نے بار بار کوشش کی ہے کہ گفت وشنید کے ذریعہ انھیں پُرامن زندگی گذارنے پر آمادہ کیا جائے؛ لیکن اب تک اس میں خاطر خواہ کامیابی حاصل نہیں ہوسکی، ایسی تحریکوں میں عصری درس گاہوں کے توسینکڑوں افراد مل جائیں گے لیکن دینی مدارس کے طلباء اور فضلاء کبھی بھی ایسی غیر قانونی سرگرمیوں میں شریک نہیں ہوئے، شاید ہی ایسی کوئی مثال ہو کہ اس حلقہ سے تعلق رکھنے والے کسی شخص پر اس قسم کے جرائم ثابت ہوئے ہوں، یہاں تک کہ جموں اور کشمیر میں بھی مدارس اور علماء نے اپنے آپ کو تشدد آمیز جدوجہد سے دور رکھا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ یہ مدارس ملک کو امن پسند اور قانون کے پابند شہری فراہم کرتے ہیں، پس نہ صرف اسلامی نقطۂ نظر سے بلکہ قومی نقطۂ نظر سے بھی مدارس اور یہاں کے فضلاء کا نہایت عظیم الشان تعمیری رول رہا ہے۔

مدارس کے بارے میں چند غلط فہمیاں لوگوں کے ذہن میں ہیں، یا پیدا کی جاتی ہیں، ان پر بھی اختصار کے ساتھ روشنی ڈالنا ضروری ہے :

۱- ایک بات یہ کہی جاتی ہے کہ مدارس اور ان سے متعلق علماء انگریزی زبان اور عصری علوم کے مخالف ہیں، اسی لئے مدارس میں ان مضامین کو داخل نصاب نہیں کیا جاتا ہے،

یہ بات بالکل غلط ہے، کسی بھی قابل ذکر مستند عالم نے انگریزی زبان اوران مضامین کی مخالفت نہیں کی ہے، مولانا عبدالحفیظ بلیاوی (سابق استاذ دارالعلوم دیوبند و دارالعلوم ندوۃ العلماء) نے اس موضوع پر مستقل رسالہ لکھا ہے، جامعہ ملیہ کی بنیاد علماء ہی نے رکھی اور شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب کے ہاتھوں اس کا افتتاح ہوا، تاریخ، فلسفہ، فلکیات وغیرہ شروع سے مدارس کے نصاب میں شامل ہیں، اس وقت اکثر مدارس میں پرائمری سطح کی تعلیم بڑی حد تک سرکاری نصاب کی رعایت کے ساتھ ہوتی ہے، عربی جماعتوں میں بھی متوسطات تک انگریزی پڑھائی جاتی ہے، تخصصات کے شعبوں میں انگریزی وعصری مضامین باضابطہ داخل نصاب ہیں، دارالعلوم دیوبند کے بشمول کئی اداروں میں فضلاء مدارس کے لئے انگریزی زبان کی تعلیم کا مناسب انتظام کیا گیا ہے۔

لیکن یہ حقیقت ہے کہ ان مدارس کا ایک خاص مقصد ہے اور وہ ہے اسلام کی تبلیغ واشاعت اوراس کی حفاظت وصیانت، اس لئے ضروری ہے کہ مدارس میں بنیادی مضامین وہ ہوں جو طلباء کوان مقاصد کی تکمیل کے لائق بناتے ہوں، اگراس کا لحاظ نہیں رکھا گیا تو نہ وہ دین کے کام کے باقی رہیں گے اور نہ دنیوی کام میں کوئی نمایاں خدمت انجام دے سکیں گے، مثلاً اگر میڈیکل سائنس کے کسی طالب علم کو انجینئرنگ پڑھانے کی کوشش کی جائے تو نہ وہ کامیاب ڈاکٹر ہو سکے گا اور نہ کامیاب انجینئر، اس لئے مدارس کے فضلاء سے یہ مطالبہ کرنا کہ وہ ماڈرن ایجوکیشن کو بھی اپنے اداروں میں نمایاں حیثیت دیں، ایک غیر ممکن اور نا قابل عمل مطالبہ ہے، مدارس میں عالم کورس کے لئے طلباء سے آٹھ سال کا وقت لیا جاتا ہے اوراس مدت میں ان کو حسب ذیل مضامین پڑھائے جاتے ہیں :

اسلامی علوم

❖ تفسیر قرآن	❖ اُصولِ تفسیر
❖ حدیث شریف	❖ اُصول حدیث
❖ کلام وعقیدہ	❖ فقہ اسلامی

❖ اُصول تفسیر ❖ علم فرائض (میراث)

❖ سیرت نبوی ❖ تاریخ اسلام

عربی زبان سے متعلق علوم

❖ نحو ❖ صرف ❖ فن معانی وبلاغت

❖ عربی ادب ❖ عربی انشاء

دیگر علوم

❖ منطق ❖ فلسفہ ❖ انگریزی

❖ حساب ❖ تاریخ ہند ❖ فارسی

اس طرح آٹھ سال کے عرصہ میں ۲۱ مضامین اور ہر مضمون کی مختلف کتابیں پڑھائی جاتی ہیں، بنظر انصاف غور کیا جائے کہ اگر دوسرے مضامین مناسب مقدار میں شریک نصاب کئے جائیں تو یہ کس قدر بوجھل ہو جائیں گے اور اپنے اصل مقصد کے اعتبار سے کتنے بے استعداد طلباء پڑھ کر نکلیں گے؟ مدت تعلیم میں اضافہ بھی دشوار ہے، کیوں کہ جو پسماندہ اور غریب طلباء اس لائن میں آتے ہیں وہ اتنی مدت کے بھی مشکل سے متحمل ہوتے ہیں، اگر پرائمری میں ان کی تعداد پچاس ہو تو دورۂ حدیث تک ان کی تعداد پانچ رہ جاتی ہے، اس لئے ہم اپنے دانشور بھائیوں سے عرض کریں گے کہ وہ ٹھنڈے دل و ماغ کے ساتھ اور عملی نقطۂ نظر سے اس مسئلہ پر غور کریں۔

۲- کچھ لوگ مدارس کے فضلاء کے مسئلہ کو روزگار کے نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں کہ اس تعلیم سے ان کو باعزت روزگار نہیں مل سکے گا — اس سلسلہ میں یہ عرض کرنا ہے کہ اولاً تو بیروزگاری اس قدر عام ہے اور اب پرائیویٹیشن نیز آدمی کا کام مشینوں سے لینے کی وجہ سے روزگار کے مواقع محدود تر ہوتے جارہے ہیں، اس لئے یہ مسئلہ صرف دینی تعلیم حاصل کرنے والوں کا نہیں ہے، ہر طرح کی تعلیم حاصل کرنے والے اس مسئلہ سے دوچار ہیں، اگر ان میں

تھوڑی سی ٹیکنیکل ایجوکیشن شامل کر لی جائے اور انھیں الیکٹریشن، کارپنٹری وغیرہ کے کام پر لگا دیا جائے تو اس سے دو نقصان ہوں گے، ایک تو سماج میں پیشہ کے لحاظ سے ان کی کوئی خاص وقعت باقی نہیں رہے گی اور ان کا جو مقصد ہے اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ معاشرہ میں مؤقر حیثیت کے حامل ہوں، غور کیجئے کہ آپ مسجد کے امام کی بات جس عزت واحترام سے سنتے ہیں، آپ اپنے گھر میں کام کرنے والے الیکٹریشن اور پلمبر کی بات کو اس اہمیت کے ساتھ سن سکتے ہیں؟ شاید ایسا نہیں ہے، دوسری بات یہ ہے کہ دینی خدمت گزاروں کی تنخواہیں عام طور پر کم ہوتی ہیں اور وہ صبر وقناعت کے ساتھ اپنے آپ کو ایک مشن کا حصہ سمجھ کر کام کرتے رہتے ہیں، اگر وہ ان کاموں میں لگ جائیں تو ان مشاغل اور معاشی فوائد کے ساتھ خدمت دین کا کام کرنا بہت مشکل ہوگا، اس وقت صورت حال یہ ہے کہ ہزاروں دیہاتوں میں علماء کی ضرورت ہے اور لوگوں کا مطالبہ ہے لیکن بہت سے فضلاء دیہاتوں کا رُخ نہیں کرتے، جب وہ اس طرح کے کام کرنے لگیں گے تو شہروں میں بھی دینی خدمت گزاروں کا مہیا ہونا مشکل ہو جائے گا۔

اس لئے مسئلہ کا حل یہ نہیں ہے کہ ہم علماء کو خدمت دین کے کام سے ہٹا کر کسبِ معاش کی دوڑ میں لگا دیں؛ بلکہ مسئلہ کا حل یہ ہے کہ قوم اور اُمت کا یہ مزاج بنائیں کہ وہ مدارس ومساجد اور دینی کاموں کو اپنی ضرورت سمجھیں، ملی کاز کے لئے زیادہ تعاون کریں اور دینی خدمت گزاروں کے معیارِ زندگی کو بہتر بنانے کی کوشش کریں، اس سلسلہ میں عیسائی مشنریز کا نظام اور مذہبی پیشواؤں کے ساتھ ان کا حسن سلوک بہترین مثال ہے ورنہ اگر علماء کو دنیا کے دوسرے لوگوں کی طرح مادی اور معاشی دوڑ میں لگا کر اصل میدان کار سے ہٹا دیا گیا تو یہ ایسا نقصان ہوگا کہ جس کی تلافی ممکن نہیں ہوگی؛ بلکہ یہ بالواسطہ طریقہ پر سنگھ پریوار اور یہودی لابی کے عزائم کو تقویت پہنچانے اور ان کے خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے کے مترادف ہوگا۔

۳- مدارس کے بارے میں ملکی اور عالمی سطح پر دہشت گردی کی بات کہی جا رہی ہے؛ لیکن آج تک کم سے کم ہندوستان میں حکومت اور سنگھ پریوار کی طرف سے اس کی ایک مثال بھی پیش نہیں کی جا سکی، دوسری طرف ملک میں آزادی کے بعد ہی سے فسادات کا سلسلہ جاری

ہے، کئی بار گورنمنٹ کے مقرر کئے ہوئے کمیشن نے فسادات کے لئے سنگھ پریوار کے لوگوں کو ملزم ٹھہرایا ہے، گجرات کے فسادات کو سنگھ ہندو بیداری قرار دیتا ہے، اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ ایک خوں آشام گروہ ہے جسے مسلمانوں، عیسائیوں اور دلتوں کا خون پینے کی عادت ہوگئی ہے، سنگھ کے ودیا بھارتی اسکولوں کی تعداد اس وقت تیرہ ہزار ہے جن میں ۴۷ ہزار اساتذہ اور ساڑھے سترہ لاکھ طلباء ہیں، یہ سرسوتی اور شیشو مندر کے علاوہ ہیں، سنگھ پریوار نے ۱۹۹۳ء میں پروسینک سیوا پریشد قائم کی ہے جس میں سابق فوجیوں کے ذریعہ ساتویں سے نویں کلاس تک کے طلباء کو ملٹری ٹریننگ دی جاتی ہے، اس طرح تین رہائشی اسکول اس وقت ناگپور اور مہاراشٹر میں چل رہے ہیں اور نینی تال کا اسکول ان کے علاوہ ہے، ان کو جو تاریخ پڑھائی جاتی ہے، وہ مسلمانوں سے نفرت پر مبنی ہے، عجب بات ہے کہ حکومت کو سنگھ پریوار کے مدارس سے تو دہشت گردی اور تشدد کی بو نہیں آتی لیکن مدارس اسلامیہ جو امن وآشتی کا گہوارہ ہیں ان سے تشدد کی بو آتی ہے۔

مسلمانوں کے لئے لمحہ فکر یہ ہے کہ آخر اس ملک میں مسلمانوں نے اسکولس، کالجس، ٹیکنیکل تعلیم کے ادارے بھی قائم کئے گئے ہیں جو یقینا ضروری ہے اور ابھی ان میں مزید اضافہ کی ضرورت ہے؛ لیکن فرقہ پرست عناصر یا حکومت ان کے خلاف آواز نہیں اُٹھاتی اور نہ عالمی سطح پر اس کی مخالفت کی جاتی ہے، مگر یہ مدارس جو نہ حکومت سے اعانت کے طالب ہیں، نہ ملازمت کے خواست گار ہیں، یہاں تک کہ یہ بھی مطالبہ نہیں کرتے کہ ان کی سند کو مان لیا جائے، پھر بھی ان کی شدت سے مخالفت کی جارہی ہے، آخر اس کی کوئی تو وجہ ہوگی؟ وجہ صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ سنگھ پریوار چاہتا ہے کہ مسلمانوں کو اکثریتی ثقافت میں جذب کرلیا جائے، عالمی سطح پر بھی اسلامی تہذیب وثقافت اعدائے اسلام کی آنکھوں میں چبھ رہی ہے، اس لئے امریکہ بھی تہذیبی تصادم کی بات کرتا ہے، اس تہذیبی انضمام وانجذاب کے معاملہ میں دینی مدارس طاقتور اور موثر رکاوٹ بنے ہوئے ہیں، انھوں نے محسوس کرلیا ہے کہ یہ مسلمانوں کی فکر کا اصل سرچشمہ اور ملی تشخص کی شہ رگ ہے، جب تک یہ باقی رہیں گے ان کا خواب شرمندہ

تعبیر نہیں ہو سکے گا، اسی چیز نے مدارس کے خلاف نفرت اور پروپیگنڈہ کی مہم کو تیز کر دیا ہے، افسوس کہ بہت سے مسلمان تو اس نکتہ کو نہیں سمجھ سکے؛ لیکن ان کے دشمنوں نے اس بات کو خوب اچھی طرح سمجھ لیا ہے: ''فاعتبروا یااولی الابصار''۔

حضرات گرامی! یہ کنونشن اسی مقصد کے لئے بلایا گیا ہے ہم سب متحدہ طور پر مدارس کے معیار تعلیم وتربیت کو بہتر بنائیں اور ان کی حفاظت وصیانت کے لئے بنیان مرصوص بن کر کام کریں، وقت کی آواز اور نوشتہ دیوار ہے کہ ہم مسلک ومشرب، جماعتوں اور تنظیموں اور دوسرے فروعی اختلافات سے اوپر اُٹھ کر دوش بدوش اور قدم بہ قدم آگے بڑھیں کہ اسی میں ہمارا ابقاء اور ہماری کامیابی ہے۔

وبااللہ التوفیق وھو المستعان۔

دینی مدارس —— اسلام کی حفاظت گاہیں

دنیا میں ایسے بہت سے علاقے ہیں جہاں مسلمانوں کے اقتدار کا سورج طلوع ہوا، بام عروج تک پہنچا اور پھر مائل بہ انحطاط ہو کر ڈوب گیا، ایشیاء اور یورپ میں متعدد ممالک ہیں جہاں یہ کیفیت پیش آئی اور اس میں شبہ نہیں کہ یہ ہماری شامتِ اعمال اور کوتاہیوں کا نتیجہ ہے، عام طور پر جن ملکوں میں مسلمان ان حالات سے دوچار ہوئے وہاں اسلامی تہذیب کا چراغ یا تو ہمیشہ کے لئے بجھ گیا، یا اس کی لو ایسی مدھم ہوئی کہ وہ نہ ہونے کی درجہ میں ہے، وہاں لوگ اسلامی تعلیمات اور اپنے مذہبی تشخصات سے ایسے محروم ہوئے کہ ان کے دلوں سے احساس زیاں بھی جاتا رہا، انھوں نے کلی طور پر مادیت کے سامنے اپنی پیشانی خم کردی، اسپین، مغربی اور مشرقی یورپ کے بعض علاقے اور روس وچین کے مسلم اکثریتی صوبے اس کی واضح مثال ہیں، اسپین تو اس کی بدترین مثال ہے، جو کسی زمانہ میں علم وفن اور تہذیب وتمدن کا دارالخلافہ تھا اور عالم اسلام میں اس کی حیثیت کسی تاجِ گہر بار سے کم نہیں تھی؛ لیکن جب مسلمانوں کا تخت اقتدار پاش پاش ہوا تو اسلامی ثقافت کے تمام ہی نقوش نے وہاں سے رختِ سفر باندھا اور چند بے جان و بے روح عمارتوں کے سوا جو قصۂ ماضی پر نوحہ کناں تھیں، ان کی کوئی اور شناخت وہاں باقی نہیں رہی۔

ہندوستان کا معاملہ یقیناً اس سے مختلف ہے، یہاں یوں تو اسلام ابتدائی عہد میں ہی آچکا تھا اور تاریخی شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں ہی ہندوستان کے ساحلی علاقوں تک اسلام کی روشنی پہنچ چکی تھی؛ لیکن اگر مسلمانوں کے سیاسی اقتدار کی تاریخ بھی دیکھی جائے تو ہندوسندھ کے علاقہ پر انھوں نے کم وبیش آٹھ سو سال حکومت کی ہے، اس عہد کو سماجی ارتقاء اور فلاحی اعتبار سے ہندوستان کا ''عہدِ زریں'' کہا جاسکتا ہے، افسوس کہ اتنی

طویل مدت میں مسلمانوں نے سیاسی اور عسکری مہم جوئی پر جتنی توجہ کی اسلام کی دعوت وتبلیغ پر اس کا عشر عشیر بھی توجہ نہیں کی ، ورنہ یقینا اس ملک کا نقشہ بدلا ہوا ہوتا اور اللہ کے بندے مسلمانوں کو اپنی آنکھوں کا نور اور دل کا سرور بنا کر رکھتے ، بہر حال! یہ مسلمانوں کی ایسی کوتاہی ہے کہ شاید ہی اس کا کوئی کفارہ ہو سکے اور آج مسلمان جن حالات سے دوچار ہیں وہ اسی کوتاہی کی مکافات ہے۔

تاہم یہ ضرور ہے کہ مسلمانوں نے تخت وتاج سے محروم ہونے کے باوجود اس ملک میں اپنی شناخت کو باقی رکھا ہے ؛ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں میں اپنے مذہب سے جس درجہ کی وابستگی پائی جاتی ہے ، کوئی قوم نہیں جو اپنے مذہب سے اس درجہ وابستہ ہو، اس گئی گذری حالت میں بھی مسجد کی آبادی اور رمضان المبارک کے اہتمام کو دیکھئے ، زکوٰۃ وانفاق اور کثیر صرفہ کے باوجود حج وعمرہ کی ادائیگی کو سامنے رکھئے اور نکاح وطلاق وغیرہ کے مسائل میں قانون شریعت کے احترام پر نظر کیجئے تو بہ مقابلہ مسلمانوں کے دوسری اقوام میں ایک فیصد بھی اس درجہ کا اہتمام نہیں ملے گا ، کسی اور قوم میں افتاء اور قضاء کے ادارے نہیں ہیں ، جہاں لوگ اپنے معاملات ، کاروبار اور نجی زندگی کے بارے میں بھی درست ونادرست اور حلال وحرام کی بابت استفسار کرتے ہوں ، یہ بہر حال بحیثیت قوم کے مسلمانوں ہی کی خصوصیت ہے کہ انھوں نے اپنی زندگی کو اسلام سے مربوط رکھا ہے۔

ہندوستان اور دوسرے ممالک کے تئیں یہ فرق کیوں ہے؟ گذشتہ ایک صدی میں جو اسلامی تحریکات اٹھی ہیں اور تحریکی شخصیتوں نے جنم لیا ہے ، زیادہ تر ان کا منبع وسرچشمہ ہندوستان ہی ہے ، اس لئے یہ اہم سوال ہے جو سوچنے والوں کو متوجہ کرتا ہے —— اگر غور کیا جائے اور حقیقت پسندی کے ساتھ دیکھا جائے تو اس کا جواب ایک ہی ہے اور وہ ہے دینی مدارس کا نظام! ہندوستان پر جوں ہی انگریزوں کو غلبہ حاصل ہوا اور اسلام کے خلاف سیاسی اور تبلیغی کوششیں شروع ہوئیں ، تخت وتاج سے بے نیاز اور حکومت واقتدار کی حرص سے آزاد دردمند اور بلند نگاہ علماء کے دل میں یہ بات ڈالی گئی کہ صرف منفی کوششوں سے اس طوفان کا

مقابلہ ممکن نہیں، اب اسلام کی حفاظت و بقاء کے لئے مثبت تدبیر مطلوب ہے اور اس تدبیر کو انھوں نے سرکاری مداخلت سے آزاد ایسے دینی تعلیم کے نظام کی صورت میں دریافت کیا جو غریب سے غریب مسلمانوں کے گھر میں بھی علم کی شمع جلا سکے اور ہر کچے گھر میں دینی تعلیم کی شعاعیں پہنچ سکیں۔

ہمارے بزرگوں نے مدارس کے اس نظام کو نہایت ہی معمولی اور سادہ حالت میں رکھا، معمولی عمارتیں جو نگاہوں میں چبھتی نہیں، کم تنخواہیں پانے والے مدرسین وخدام جو سیدھی سادی زندگی بسر کرتے ہوں، فقیرانہ لباس میں ملبوس طلبہ جن کا سراپا ان کی سادگی اور درویشی پر گواہ ہو، یہ ادارے مستقل اور قابل بھروسہ مالی وسائل سے محروم عام مسلمانوں سے دو دو چار چار پیسے کی مدد ہی ان کا توشۂ سفر، مدارس کی یہ سادگی ایسی تھی کہ لوگ اس کی طرف مڑ کر دیکھتے بھی نہیں تھے اور سوچتے تھے کہ خس پوش جھونپڑیوں میں رہنے والے بوریہ نشیں اور دنیا کی لذتوں سے محروم اور نابلد لوگ کر ہی کیا سکتے ہیں؟ شعراء اور نئی روشنی کے لوگ تو ان کی تحقیر سے بھی نہیں چوکتے تھے اور ان کو ''تنگ نظر ملا'' اور ''دو رکعت کا امام'' جیسے الفاظ سے یاد کرتے تھے۔

لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ ان ہی درویش مزاج ملاؤں نے اس ملک میں اسلام کے پودے کی حفاظت کی ہے، انھوں نے عہد بہار سے کوئی صلہ نہیں کمایا؛ لیکن عہد خزاں میں اپنے خونِ جگر سے سینچ کر اسلام کے شجر طوبیٰ کو بچایا، اسلامی تہذیب وثقافت کا تحفظ کیا اور مسلمانوں کا اپنے دین اور مذہب سے نہ صرف رشتہ باقی رکھا؛ بلکہ اس رشتہ کو مضبوط سے مضبوط تر کرنے میں کامیاب ہوئے، یہی وجہ ہے کہ آج ہندوستان میں اسلام سے وابستگی کی جڑیں جتنی گہری ہیں اور لوگوں کے مزاج میں جتنی زیادہ مذہبیت ہے، عالم اسلام میں بھی کم ہی اس کی مثالیں مل سکیں گی، اس عجمی نژاد ملک میں علوم اسلامی کی جو خدمت ہوئی ہے، اس کی مثال بہت سے عرب اور مسلم ممالک میں بھی نہیں مل پائے گی، حکومت ختم ہونے کے باوجود لوگوں کے دینی رجحان میں جو اضافہ ہوا ہے، اس میں بنیادی کردار مدارس ہی کا ہے، تقریباً گذشتہ ڈیڑھ صدی

میں جو بھی تحریک یا جماعت اُٹھی ہے اور اسلام کی حفاظت یا اشاعت کا جو کچھ بھی کام ہوا ہے، اس میں ان مدارس اور مدارس سے پیدا ہونے والی شخصیتوں کا بڑا حصہ ہے، مدارس کی یہ اہمیت جو اس کی ظاہری خستہ سامانی اور سادگی کی وجہ سے محسوس نہیں کی جاتی تھی، اب دوست اور دشمن سب اس کا احساس کرنے لگے ہیں۔

ہندوستان میں گذشتہ پچاس سال سے فرقہ پرستوں کی کوشش ہے کہ مسلمان فکری اور تہذیبی اعتبار سے اکثریت کے ساتھ ضم ہو جائیں، جس چیز کو آج ''ہندوتوا'' کہا جاتا ہے، اسی مقصد کے لئے ایک زمانہ میں ایسی سیاسی جماعتیں جو اپنے آپ کو سیکولر کہا کرتی تھیں، بار بار مسلمانوں کو قومی دھارے میں شامل ہو جانے کی تلقین کیا کرتی تھیں اور بھارتیہ کرن کا نعرہ لگاتی تھیں، اس دعوت کا مقصد بھی اصل میں یہی تھا کہ اب مسلمان اپنی مذہبی اور تہذیبی شناخت سے آزاد ہو جائیں اور دوسری قوموں کی طرح زیادہ سے زیادہ چند مذہبی رسوم کی ادائیگی پر اکتفاء کرلیں، ان نامسعود کوششوں کی ناکامی کا سہرا دینی مدارس کے سر جاتا ہے، اس حقیقت کو ارباب اقتدار نے بھی محسوس کرلیا ہے، اس لئے دینی مدارس فرقہ پرست طاقتوں کا نشانہ ہیں، کبھی ان مدارس کو آئی ایس آئی کا مرکز قرار دیا جاتا ہے اور کبھی ان پر دہشت گردی کا الزام لگایا جاتا ہے، کبھی افغانستان کے طالبان سے ان کا رشتہ جوڑا جاتا ہے، یہ محض اپنے اندرونی عناد کو چھپانے کے لئے ایک بہانہ ہے، حقیقت کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔

کسی طبقہ میں دہشت گردی پیدا ہونے کے عام طور پر تین اسباب ہوتے ہیں، ایک یہ کہ ان کو ایسی تعلیم دی جائے جو دوسروں سے نفرت پر اُبھارتی ہو، دوسرے تعلیمی نصاب میں ایسی باتیں شامل نہ ہوں لیکن تربیت ان ہی خطوط پر کی جاتی ہو، تیسرے تعلیم وتربیت کے نظام میں تو ایسے محرکات نہ ہوں لیکن آدمی جس ماحول میں رہتا ہو ان میں جرائم اور دہشت گردی کا ماحول پایا جاتا ہو، جیسا کہ آج کل آر، ایس، ایس کا حال ہے، آر، ایس، ایس کے تعلیمی اداروں میں مسلمانوں، عیسائیوں اور دلتوں کے تئیں نفرت انگیز مضامین پڑھائے جاتے ہیں، ان کی تربیت بھی مار دھاڑ کے طریقے پر مشتمل ہوتی ہے اور ان کے شب وروز کا ماحول ہی

دوسری اقلیت سے نفرت پر مبنی ہے، دینی مدارس کا معاملہ اس سے بالکل مختلف ہے، یہاں جو مضامین پڑھائے جاتے ہیں وہ شروع سے اخیر تک انسانیت اور انسانی محبت پر مبنی ہیں، ان کا چوبیس گھنٹے کا تربیتی نظام ایثار اور تواضع کی عملی تصویر ہے، ان کے ماحول میں جرائم پیشہ عناصر کا گذر نہیں، اس لئے مدارس پر عمومی انداز سے دہشت گردی کا الزام لگانا سفید جھوٹ سے کم نہیں۔

ہندوستان میں دہشت گردی کے ایک سے ایک واقعات پیش آچکے ہیں، گاندھی جی کا قتل ناحق ہو چکا ہے، پھر محترمہ اندرا گاندھی کا قتل ہوا، راجیو گاندھی قتل کئے گئے، بابری مسجد کی شہادت کا اندوہ ناک واقعہ پیش آیا جس کو موجودہ صدر آر کے نارائنن نے گاندھی جی کے قتل کے بعد سب سے تکلیف دہ واقعہ قرار دیا، میرٹھ، بھاگلپور اور مختلف علاقوں میں خود محافظ دستہ کے ہاتھوں مسلمانوں کے قتل عام کے واقعات پیش آئے، ۱۹۸۴ء میں علانیہ سکھوں کا قتل عام ہوا اور سینکڑوں سکھ لڑکیاں تک غائب کر دی گئیں، سورت میں بے شرمی کا ایسا کھیل کھیلا گیا کہ جس کے تصور سے بھی جبین حیا عرق آلود ہوتی ہے، یہی تو دہشت گردی کے واقعات ہیں، یہ واقعات کن لوگوں کے ہاتھوں پیش آئے، دینی مدارس کے اساتذہ اور طلباء کے ہاتھوں؟ یا مسلمانوں کے ہاتھوں؟؟ —— یہ محض مسلمانوں کو مرعوب کرنے، دینی مدارس کے تئیں غلط فہمیاں پھیلانے کا ایک حربہ اور بالواسطہ طریقہ پر مسلمانوں کو ان کی شناخت سے محروم کرنے کے طویل المدت پروگرام کا ایک حصہ ہے، ضرورت ہے کہ مسلمان پورے شعور سے کام لیں، اس پروپیگنڈہ کا مقابلہ کریں اور اپنی ان دینی قلعوں کی حفاظت میں پہلے سے بڑھ کر فعال کردار ادا کریں۔

دینی مدارس — روشن نقوش، تابناک تاریخ

اسلام ایک ایسا دین ہے جو زندگی کے تمام مسائل کا احاطہ کرتا ہے، انسان جن حالات سے دو چار ہوتا ہے، ان میں سے کوئی گوشہ نہیں، جس کو اسلام نے چھوڑا ہو، ایک ایسا مذہب جو عبادت اور زندگی کے چند رسوم اور طریقوں تک محدود نہ ہو؛ بلکہ پوری زندگی کو اس نے اپنے دائرے میں لے رکھا ہو، علم کی وسعت اور تحقیق واجتہاد کے تسلسل کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا، اسی لئے اسلام میں تمام ہی علوم اور خاص کر علم دین کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔

پیغمبر اسلام ﷺ نے ہر مسلمان پر علم حاصل کرنے کو فرض قرار دیا ہے، (ابن ماجہ، حدیث: ۲۲۴) حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص حصول علم کے لئے نکلے وہ جب تک واپس نہ آجائے اللہ کے راستے میں ہے، (ترمذی، حدیث: ۲۶۴۷) علم دین دوسروں تک پہنچانے اور خود حاصل کرنے کی آپ ﷺ نے اس کثرت سے ترغیب دی کہ عہدِ نبوی ہی میں مسجدِ نبوی میں علم کے مذاکرہ کی مجلس منعقد ہونے لگیں، ایک بار آپ ﷺ مسجد نبوی میں داخل ہوئے، تو کچھ لوگوں کو ذکر میں مشغول دیکھا اور کچھ لوگوں کو علمی مذاکرہ میں مشغول پایا، آپ ﷺ نے دونوں کی تحسین فرمائی؛ لیکن خود اپنے لئے علمی مذاکرہ کی مجلس منتخب فرمائی اور فرمایا کہ میں معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں۔

ہجرت سے پہلے مکہ مکرمہ میں آپ ﷺ نے ''دارِ ارقم'' کو تعلیم وارشاد کا مرکز بنایا، جہاں آپ لوگوں کو قرآن پڑھاتے اور دین کی تعلیم دیتے (اخبار مکہ للازرقی: ۲۲۱/۲) حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہیں آکر اسلام قبول کیا اور آپ سے تعلیم پائی، مدینہ میں مسجد نبوی کی تعمیر کے ساتھ ساتھ آپ ﷺ نے ایک چبوترہ بھی تعمیر فرمایا جس پر معمولی سا چھپر بنا ہوا تھا، یہ طلبہ کی اقامتی درس گاہ تھی، جہاں دور دراز سے مسلمان آتے اور کسبِ فیض کرتے، اس کو ''صفّہ'' کہا

کرتے تھے، عام حالات میں اصحابِ صفہ کی تعداد ساٹھ، ستر ہوا کرتی تھی، جو گھٹتی بڑھتی رہتی تھی، قاضی اطہر مبارک پوری مرحوم نے ان کی تعداد چار سو تک نقل کی ہے، حضرت ابو ہریرہ، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ، حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ جیسے اکابر علماءِ صحابہ اس درس گاہ کے تربیت یافتہ اور پرداختہ تھے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سعی رہتی تھی کہ ہر قبیلہ اور علاقہ میں دینی تعلیم کا نظم ہو؛ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم مختلف قبائل میں بھی معلم متعین فرمایا کرتے تھے، مدینہ تشریف آوری سے پہلے ہی آپ نے مسلمانانِ مدینہ کی تعلیم و تربیت کے لئے حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کو بھیجا، سیرت کی اکثر کتابوں میں اس کا ذکر موجود ہے، فتح مکہ کے بعد وہاں حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو معلم مقرر کیا، (طبقات ابن سعد: ۳۴۸/۲) بنوثقیف کی تعلیم وتربیت اور نماز کی امامت کے لئے حضرت عثمان بن ابی العاص رضی اللہ عنہ کو مامور فرمایا، (طبقات ابن سعد: ۵۰۸/۵) عمان کے لوگ مسلمان ہوئے، تو ان کی تعلیم و تربیت کے لئے حضرت علاء حضرمی کو بھیجا، (طبقات ابن سعد: ۳۵۱/۱) یمن کے مسلمانوں نے معلم کی درخواست کی، تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کو متعین فرمایا، آپ ان کے معلم و مربی بھی تھے اور قاضی و مفتی بھی۔ (مستدرک حاکم: ۲۶۷/۳)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد صحابہ دنیا کے کونہ کونہ میں پھیل گئے، اور وہاں تعلیم وتعلم کی محفلیں آراستہ کیں، مدینہ، مکہ، کوفہ، بصرہ، بغداد، شام اور مصر وہ خاص مقامات ہیں جہاں صحابہ رضی اللہ عنہم کی بڑی تعداد فروکش ہوئی؛ لیکن عالم اسلام کا کوئی خطہ نہیں تھا جہاں ان برگزیدہ نفوس نے پہنچنے اور علم کا فیض جاری کرنے کی سعی نہ کی ہو، حالاں کہ ان حضرات کو ''مدینۃ النبی'' کا قیام زیادہ محبوب ومرغوب تھا؛ لیکن اسلام اور علومِ اسلامی کی اشاعت کے جذبہ نے ان کو دور دراز علاقوں تک پہنچایا اور اسی کا نتیجہ ہے کہ خود عجم کی سرزمین سے امام ابوحنیفہؒ جیسا فقیہ، امام بخاریؒ جیسا محدث اور حسن بصریؒ جیسا علومِ باطنی کا رمز آشنا پیدا ہوا۔

اسلامی علوم کا دامن بہت وسیع ہے؛ لیکن عہدِ نبوی سے آج تک ان علوم میں تسلسل قائم ہے اور کبھی اس میں انقطاع نہیں پیدا ہوا، یہ دراصل اس پیشین گوئی کی تصدیق ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم

نے فرمائی تھی کہ ہر نسل میں اس عہد کے معتبر افراد اس علم کا بار اُٹھائیں گے، جو اس دین میں کی جانے والی آمیزشوں اور باطل تاویلات سے دین کی حفاظت کریں گے۔ (مشکوٰۃ، حدیث نمبر: ۲۴۸)

مسلم سماج میں مساجد کا نظام ایک ایسا نظام ہے جس نے بنیادی دینی تعلیم کے نظام کو بہت آسان کر دیا ہے، ہر مسجد مدرسہ ہے اور امامِ مسجد معلم ومربی، ابتداءً زیادہ تر مدارس مساجد ہی میں ہوا کرتے تھے اور دین کی مبادیات کے سکھانے سے لے کر قرآن وحدیث اور فقہ وکلام کی اعلیٰ تعلیم تک کے مراکز یہی مسجدیں تھیں، امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ، امام احمدؒ اور امام بخاریؒ وغیرہ کا درس زیادہ تر مسجدوں ہی میں ہوتا تھا، بہ تقاضۂ حالات رفتہ رفتہ مدرسوں کی مستقل عمارت بننے لگی، مؤرخین کا خیال ہے کہ چوتھی صدی ہجری کے بعد مدارس کی تعمیر کا سلسلہ شروع ہوا، اور اہل نیساپور ہیں، جن کو سب سے پہلے ''مدرسہ بیہقیہ'' کے نام سے ایک دینی درس گاہ کی تعمیر کا شرف حاصل ہوا، (کتاب الخطط والآثار: ۲/۳۶۲) اس کے بعد نیساپور میں کئی مدارس قائم ہوئے، پھر پانچویں صدی کے وسط میں وہ مشہور اسلامی جامعہ تعمیر ہوئی جو ''جامعہ نظامیہ بغداد'' کے نام سے جانی جاتی ہے۔

اس زمانہ میں سلطان الپ ارسلان (متوفی: ۴۶۵ھ) بادشاہ تھا اور نظام الملک طوسی کاروبارِ حکومت میں ان کے معتمد خاص تھے، آج کی زبان میں کہا جا سکتا ہے کہ وزیر اعظم تھے، نظام الملک کی ترغیب وتحریک پر بادشاہ نے مدارس کے قیام اور اساتذہ وطلبہ کے وظائف کی منظوری دے دی؛ چنانچہ نظام الملک نے بغداد، بلخ، نیساپور اور متعدد اہم شہروں میں مدارس کی تعمیر کا آغاز کیا، خود بغداد کے جامعہ نظامیہ کی تعمیر ذی الحجہ ۴۵۷ھ میں شروع ہوئی اور ۱۰/ ذی القعدہ ۴۵۹ھ میں اس کا باضابطہ افتتاح ہوا، مشہور شافعی فقیہ ابواسحاق شیرازی (متوفی: ۴۷۶ھ) جن کی کتاب ''المہذب'' جو فقہ شافعی کی مستند ترین کتاب سمجھی جاتی ہے اور فقہ واُصولِ فقہ اور کلام وجال کے فنون میں متعدد معروف ومنقول کتابیں جن کے قلم فیض رقم کی رہین منت ہیں، وہ اس جامعہ کے استاذ رہے۔

خود ہمارے ملک ہندوستان میں مسلم عہدِ حکومت میں دینی مدارس بڑی تعداد میں قائم تھے، قشقلندی نے اپنی مشہور کتاب ''صبح الاعشیٰ'' میں لکھا ہے کہ صرف دلی میں ایک ہزار مدرسے تھے، جن میں ایک فقہ شافعی کا تھا اور باقی فقہ حنفی کے، (صبح الاعشیٰ: ۶۹/۵) مشہور محقق مولانا مناظر احسن گیلانیؒ نے مغربی سیاح ہملٹن سے نقل کیا ہے کہ اورنگ زیب عالمگیرؒ کے عہد میں صرف شہر ٹھٹھ میں مختلف علوم وفنون کے چار سو مدارس قائم تھے، (نظام تعلیم وتربیت: ۴۱۷/۱) بیجاپور میں محمود گانواں نے جس درس گاہ کی تعمیر کی تھی اس کے ٹوٹے کھنڈرات سے آج بھی اس کی عظمت نمایاں ہے، بیجاپور کے سلاطین میں محمد عادل شاہ ایسا علم پرور بادشاہ تھا کہ اس نے مدرسہ کے طعام خانہ میں روزانہ طلبہ کے لئے بریانی کا نظم رکھا تھا اور ہر طالب علم کو اس کے علاوہ ایک ''ہون'' (اس زمانہ کا سکہ) بطور وظیفہ دیا جاتا تھا۔ (نظام تعلیم وتربیت: ۴۱۹/۱)

جب ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت کا سورج غروب ہوا، تو دین اور اُمت کے لئے گھلنے والے بزرگوں کو فکر ہوئی کہ کسی طرح اس ملک میں مسلمانوں کے ایمان کی حفاظت کا سروسامان کیا جائے، اس مقصد کے لئے خوب سوچ سمجھ کر دینی مدارس کے قیام کی کوشش کی گئی اور شہر شہر، گاؤں گاؤں ان مدارس و مکاتب کا جال بچھایا گیا، اس سعی محمود اور جہد مسعود میں حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی کے خلفاء اور مجازین پیش پیش رہے، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی جو بلند پایہ عالم بھی تھے اور ہندومت، عیسائیت اور مذاہب باطلہ کے مقابلہ دندان شکن مناظر بھی اور عظیم سماجی مصلح بھی، انھوں نے ۱۸۶۶ء میں مشہور دینی درس گاہ دارالعلوم دیوبند کی بنیاد رکھی، جو ازہر ہند کے نام سے جانا جاتا ہے اور جس کے فیض کی شعاعیں دنیا کے کونہ کونہ کو روشن کررہی ہیں —— اسی دور میں ہندوستان کے جنوبی علاقہ میں فضیلت جنگ حضرت مولانا حافظ محمد انوار اللہؒ نے حیدرآباد میں جامعہ نظامیہ اور حضرت مولانا عبدالوہاب ویلوری نے ویلور میں مدرسہ باقیات صالحات کی بنیاد رکھی اور ان دونوں مدارس نے جنوبی ہند کو خوب خوب فیض یاب کیا، اسی طرح ہندوستان کے شمالی مشرقی علاقہ ''بہار'' میں حضرت مولانا حاجی منور حسینؒ نے ''مدرسہ امدادیہ'' دربھنگہ قائم فرمایا، علامہ سید سلیمان ندویؒ اور علامہ ابراہیم

بلیاویؒ جیسے محقق علماء اس مدرسہ کے طالب علم رہ چکے ہیں، یہ عجیب اتفاق ہے کہ یہ سبھی بزرگ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کے خلفاء اور تربیت یافتہ ہیں۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ جاں گسل حالات کے باوجود آج اس ملک میں اس شان وبان کے ساتھ اسلام کا باقی رہنا دینی مدارس ہی کی دین ہے، اللہ کا شکر ہے کہ مسلمانوں نے اس حقیقت کو سمجھ لیا ہے اور آج ملک کے گوشہ گوشہ میں مخلص اور دین دار مسلمانوں کے تعاون سے ایسی درس گاہیں چل رہی ہیں، یہ ہمارے لئے لال قلعہ سے زیادہ مضبوط، چار مینار سے زیادہ بلند اور تاج محل سے زیادہ خوب صورت میراث ہے۔!

لڑکیوں کی دینی تعلیم
وقت کی ایک اہم ضرورت!

خواتین انسانیت کا نصف حصہ ہیں، وہ نصف جس سے ماں کی ممتا، بیٹی اور بہن کی محبت اور بیوی کا سکون ملتا ہے، جو انسانیت کے لئے تسکین دل وجان ہے: ''لِتَسْکُنُوْا اِلَیْھَا'' (الروم :۲۱) اور جو اس رنگارنگ کائنات میں اصحابِ دل نگاہ اور اربابِ ایمان وصلاح کی نظر میں'' خیر متاع الدنیا'' کا مصداق ہے، شاید اسی حقیقت کی طرف اقبال مرحوم نے اشارہ کیا ہے کہ :

وجودِ زن سے ہے تصویر کائنات میں رنگ

اگر عورت ایک طرف صنفِ نازک اور جنس لطیف ہے اور اس لئے شریعت نے اس کو بہت سے فرائض و واجبات سے بریٔ الذمہ اور ذمہ داریوں سے فارغ رکھا ہے، تو دوسری طرف یہ بھی حقیقت ہے کہ فطرت نے اس کے اندر اثر انداز ہونے کی غیر معمولی صلاحیت ودیعت فرمائی ہے، اسی لئے عورت جو سماج کا جذام اور معاشرہ کا ایک عضو ناکارہ سمجھی جاتی تھی، اسلام نے اس کو سماج میں بلند مقام دیا، اس کی صلاحیتوں کو سماج کی تعمیر میں صرف کرنے کی راہ نکالی، اس کے لئے فعال ومؤثر کردار فراہم کیا اور اس نے عورت کے وجود کو ''مستقل حیثیت'' دی۔ (نسائی: ۱۲۴)

اس نے عورت کو اظہارِ رائے کی ایسی آزادی عطا کی کہ ایک معمولی خاتون خلیفۂ وقت کا برسر عام محاسبہ کر سکتی تھی، (تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۶۷-۴۶۶) اس نے عورت کے لئے تعلیم کا راستہ کھولا اور خود پیغمبر اسلام ﷺ نے ہفتہ میں ایک دن اور مقام ان کے لئے متعین فرمادیا، جہاں وہ جمع

ہوتیں اور آپ ﷺ ان کو دین کی تعلیم دیا کرتے، (بخاری و مسلم عن ابی سعید الخدریؓ) باوجود کہ عورتوں کے لئے ایسے مقام پر جانا شریعت میں عمومی طور پر پسند نہیں کیا جاتا جہاں لوگوں کا اجتماع ہو، مگر عید الفطر اور عید الاضحیٰ کے مواقع پر آپ ﷺ نے خواتین کو عید گاہ میں جمع ہونے کا حکم فرمایا، تاکہ وہ بھی آپ ﷺ کی تعلیمات سے مستفید ہوسکیں، (بخاری و مسلم، عن ام عطیہ انصاریہؓ) اور خود صحابیات میں طلبِ علم کی ایسی چنگاری آپ ﷺ نے سلگادی تھی کہ وہ اس میں حیاء کو بھی حجاب نہ بننے دیتی تھیں، اس سلسلہ میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے خواتین انصار کی تعریف کی کہ ''خواتین انصار بہترین عورتیں ہیں کہ حیاء کو دین کے سمجھنے میں رکاوٹ نہیں بننے دیتیں''۔

(بخاری، کتاب العلم)

لڑکیوں کی تعلیم کی طرف آپ ﷺ کی توجہ خاص کا یہ حال تھا کہ باندیوں تک کو علم سے آراستہ کرنے کی ترغیب دی اور فرمایا:

جو اپنی باندی کی بہتر تربیت کرے اور اچھی تعلیم دے، پھر اسے آزاد کردے اور اس سے نکاح کرلے، اس کو دوہرا اجر ملے گا۔ (بخاری، عن ابی بردہؓ)

حضرت ابو وائل رضی اللہ عنہ کی ایک روایت میں بیٹی کی تربیت کرنے کی صراحت موجود ہے۔ (مجمع الزوائد: ۸/۱۵۸)

اس ترغیب نے قرنِ اول ہی میں خواتین میں ایک تعلیمی انقلاب پیدا کردیا، علومِ اسلامی میں سب سے اہم فن حدیث کا ہے، حدیثیں جن لوگوں سے ایک ہزار سے زیادہ مروی ہیں وہ مکثرین کہلاتے ہیں، علامہ سخاویؒ کی تحقیق کے مطابق حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی احادیث کی تعداد (۲۲۱۰) اور مکثرین میں دوسرا نام انھیں اُم المومنین کا ہے، تفسیر میں جن صحابہ کو ید طولیٰ حاصل تھا، ان میں ایک اہم نام حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا بھی ہے؛ جنھوں نے بعض اکابر صحابہ پر علمی گرفت فرمائی ہے اور اساطین اُمت نے اُم المومنین کی گرفت کو قبول کیا ہے۔

فقہ و افتاء میں ابن قیمؒ نے کثرت وقلت کے لحاظ سے جو تین درجات قائم کئے ہیں، ان میں اول درجہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا، دوسرے درجہ میں اُم المومنین حضرت اُم سلمہ رضی اللہ عنہا اور

تیسرے درجہ میں حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا ، حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا ، حضرت اُم حبیبہ رضی اللہ عنہا ، حضرت اُم عطیہ رضی اللہ عنہا ، اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا ، حضرت اُم شریک رضی اللہ عنہا ، حضرت خولہ رضی اللہ عنہا ، حضرت اُم درداء رضی اللہ عنہا ، حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا ، حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا ، حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا ، حضرت عاتکہ رضی اللہ عنہا ، حضرت یعلی بنت قائم رضی اللہ عنہا ، حضرت فاطمہ بنت قیس رضی اللہ عنہا ، حضرت زینب بنت اُم سلمہ رضی اللہ عنہا اور حضرت اُم ایمن رضی اللہ عنہا کے اسماء گرامی موجود ہیں ، (اعلاء السنن :۱/۹-۱۱) بلکہ سیدنا حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فوجیوں کے لئے گھر سے باہر رہنے کی جو مدت مقرر کی اس میں حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کی رائے پر فیصلہ کیا ، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ عورتوں سے متعلق مسائل میں خواتین اہل افتاء کی رائے کو ترجیح دی جاسکتی ہے۔

کتابت سے مکہ میں بہت کم لوگ واقف تھے ، اہل تاریخ نے ۹، ۱۳ اور ۳۰ کے اعداد بتائے ہیں جو تحریر سے واقف تھے ؛ لیکن عہد رسالت مین نہ صرف مرد بلکہ عورتوں میں بھی کتابت کا ذوق پیدا ہوا ، حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا نے شفاء بنت عبداللہ رضی اللہ عنہا سے کتابت سیکھی ، (ابو داؤد ، عن شفاء) اسماء بنت مخرمہ رضی اللہ عنہا عطر فروخت کرتی تھیں اور اُدھار رقم کا کھاتہ لکھ لیا کرتی تھیں ، (طبقات ابن سعد : ۸/ ۲۱۲) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا شاید کتابت سے واقف نہ تھیں ؛ لیکن تحریریں پڑھتی تھیں ؛ چنانچہ انھوں نے اپنے غلام ابو یونس سے قرآن کے نسخہ کی کتابت کرائی تھیں۔

(مؤطا امام مالک عن ابی یونس)

حفظِ قرآن مجید کا ذوق بھی خواتین میں عام تھا ، اُم ورقہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں ملتا ہے کہ وہ باضابطہ حافظہ تھیں ، علوم اسلامی سے اس دلچسپی نے صحابیات میں ادبی ذوق اور زبان شناسی بھی پیدا کی ، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی جامع الصفات ذات اس باب میں بھی ممتاز تھی ، ان کے بعض شاگردوں کا بیان ہے کہ میں نے ان سے زیادہ فصیح نہیں دیکھا ، (ترمذی عن موسی بن طلحہ) خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سراپا کا حضرت اُم معبد نے جو لطیف اور حقیقت ترجمان نقشہ کھینچا ہے ، (سیرت ابن ہشام : ۲/ ۵۵) وہ ادب عربی کا ایک نمونہ ہے ، خواتین صرف تعلیم حاصل ہی نہیں کرتی تھیں ؛ بلکہ علوم اسلامی کی امانتِ عظمٰی دوسروں تک بھی پہنچاتی تھیں ، صرف مسند احمد ہی

میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ۲۱۲ شاگردوں کا ذکر موجود ہے۔ (سیرت ابن ہشام، ص:۲۶)

علاوہ دینی علوم کے عورتوں کے حسب حیثیت دوسرے ضروری علوم کی بھی قدر افزائی کی جاتی تھی، چرخہ کاتنے کی آپ ﷺ نے خود ترغیب دی ہے، حضرت اُم سلمہ رضی اللہ عنہا خنجر بناتی تھیں، (مسلم عن انس) حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی زوجہ ذاتی صنعت وکاریگری اور اس کی کمائی سے اپنے علاوہ شوہر اور بال بچوں کی کفالت کرتی تھیں، (طبقات ابن سعد: ۸/ ۲۱۲) حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کا پکوان ممتاز تھا، شوہر کے پیسے صحیح طور خرچ کرنے اور بچوں کی نگہداشت پر توجہ دینے کی خود آپ ﷺ نے خواتین کو ترغیب دی ہے، یہ گویا اُمور خانہ داری کی تعلیم وتربیت کی اساس تھی، طب وعلاج سے بھی خواتین دلچسپی لیتی تھیں، غزوات میں خواتین نے مجاہدین کی مرہم پٹی کی ہے، ہشام بن عروہؒ کا بیان ہے کہ میں نے کسی کو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے بڑھ کر ماہر طب نہیں پایا، خود حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اپنی ان طبی معلومات کی بابت فرمایا کہ جب آپ ﷺ بیمار رہتے تو اطباء عرب آتے تھے، میں ان کے نسخے یاد کر لیتی تھی۔ (مسند احمد: ۶/ ۶۷)

اور یہ کچھ عہدِ رسالت ہی پر موقوف نہیں، بعد کے ادوار میں بھی خواتین اسلام میں اہل فضل کی ایک طویل فہرست ملتی ہے، ابن قیمؒ نے عہد اسلام کی افاضل روزگار خواتین کا ذکر کیا ہے، جن میں چند ہی صحابیات ہیں، باقی بعد کی ہیں، ان میں بشر حافی کی بہن مخۃ جیسی متورع خاتون بھی ہیں، جو امام احمد سے دریافت کرتی ہیں کہ میں چراغ میں بھی سوت کاتتی ہوں اور چاندنی کی روشنی میں بھی، تو کیا مجھے فروخت کرتے ہوئے ان دونوں کی بابت فرق بھی واضح کر دینا ضروری ہے؟ حفصہ بنت سیرین جیسی یگانۂ روزگار محدثہ بھی ہیں، جن کو بجا طور پر اہل زمانہ ابن سیرین کا علمی جانشین تصور کرتے تھے، امۃ الواحد سکینہؒ بھی ہیں دار قطنیؒ جیسے محدث جن کے تلامذہ میں تھے اور ان کے احسان شناس خاص اور فضل وعلم کے معترف تھے اور جو بہ قول ابن جوزی ''**احفظ الناس للفقه علی مذهب الشافعی**'' تھیں، (کتاب احکام النساء باب: ۱۱۰) عمر رضا کحالہ جیسے صاحبِ نظر فاضل نے خواتین اسلام وعرب کی جو موسوعہ تیار کی ہے، وہ چوبیس سو سے زیادہ فاضل وممتاز خواتین کے ذکر سے مزین ہے، یہ سب کچھ اسی نبی ﷺ اُمی کا

فیض ہے، جس نے عرب کی جہالت کی زمین میں علم کا صور پھونکا اور علم ونظر کو ایسی جاودانی بخشی کہ انسانیت کا کوئی طبقہ اس کے فیض عام سے محروم نہ رہا۔

آپ ﷺ کا دورِ نبوت علم کا دور ہے اور یہ جوں جوں آگے سفر کرتا جائے گا، علم کی نئی نئی راہیں کھلتی جائیں گی اور علم کی اشاعت وابلاغ کے نت نئے وسائل وذرائع پیدا ہوتے جائیں گے، اس دور نے خواتین میں حصول علم کی ایک نئی لہر پیدا کی ہے اور چوں کہ علماء وزعماء پے بہ پے پیش آنے والے واقعات کی گرہ کشائی میں اس طرف توجہ نہ کر سکے، اس لئے جن مسلم گھرانوں نے خواتین کی تعلیم کی موجودہ تحریک میں حصہ لیا، ان کے لئے مخلوط وآزادانہ فضا کی درسگاہوں کو قبول کرنے کے سوا چارہ نہ تھا، گو ادھر ایک دو دہائی سے اب لڑکیوں کے علاحدہ اسکول قائم ہوئے ہیں؛ لیکن تربیت اور ذہن سازی کی کیفیت کے اعتبار سے ان دونوں میں کوئی بڑا فرق نہیں ہے، اس نے خواتین کی ایک ایسی نسل تیار کردی ہے جو مغرب کے نعرۂ آزادی کی مسحور، مغربی تہذیب کی اسیر اور اسلامی تعلیم اور مشرقی اخلاق واقدار کے احساس سے عاری ہے اور یہ ایک حقیقت ہے کہ مسلم سماج کا مضبوط حصار آڑے نہ آئے تو اس سماج میں بہت سی ''تسلیمہ نسرین'' منظر عام پر آجائیں، ان حالات میں لڑکیوں کی دینی تعلیم وتربیت پر غور اور علمی اقدام غالباً اسی قدر ضروری ہے، جتنا ضروری اپنے زمانہ میں لڑکوں کی درسگاہوں کا قیام تھا، اس لئے لڑکیوں کی دینی تعلیم کی طرف توجہ وقت کی اہم اور اولین ضرورت ہے۔

یہ بھی ایک سازش ہے!

جس دین کے ہم حامل ہیں، یہ ہم تک واسطوں سے پہنچا ہے، ایسا نہیں ہوا کہ ہر شخص پر براہ راست اللہ تعالیٰ نے اپنے احکام نازل کئے ہوں؛ بلکہ فرشتوں کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی کتاب اللہ کے پیغمبروں تک پہنچی، پھر انبیاء نے خدا کا پیغام اپنے رفقاء کو سنایا، رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ دین حق کا آخری، مکمل اور بے آمیز ایڈیشن انسانیت کو ملا، سب سے پہلے اس امانت کا بوجھ صحابہ رضی اللہ عنہم کی برگزیدہ جماعت نے اُٹھایا، یہ ایسے پاکباز، ایثار پیشہ اور بےنفس لوگ تھے، کہ کسی اور نبی کے حصہ میں ایسے رفقاء میسر نہ آئے، اور اس میں مبالغہ نہیں کہ انبیاء کے سواء چشم فلک نے ان کی نظیر نہیں دیکھی، پھر ہر عہد کے بہتر لوگ اس امانت نبوی کے حامل اور امین بنتے رہے، اسی کو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ہر نسل کے بہتر لوگ اس بارِ امانت کے حامل بنیں گے، (مشکوٰۃ: ۱/۳۶، باب العلم) چوں کہ یہ آخری دین ہے، اور اسے قیامت تک انسان کی رہنمائی کا فریضہ انجام دینا ہے، اس لئے من جانب اللہ اس کا نظم ہوتا رہا کہ ہمیشہ اُمت میں ایسی شخصیتیں پیدا ہوتی رہیں، جو ایک طرف علم وفضل کے اوجِ کمال پر تھیں اور دوسری طرف ورع وتقویٰ اور خشیتِ الٰہی میں بھی وہ اپنے اہل زمانہ پر فوقیت رکھتی تھیں، یہی وہ حقیقت ہے جس کی طرف رسول اللہ ﷺ نے اشارہ فرمایا کہ ہر صدی میں ایسا شخص یا ایسے اشخاص پیدا ہوتے رہیں گے، جو اہل باطل کی تاویلات اور آمیزشوں سے دین کی حفاظت فرمائیں گے، (ابوداؤد: ۲/۵۸۹، باب مایذکر فی قرن) چنانچہ محدثین، فقہاء اور ائمۂ متبوعین اور ہر عہد کے مصلحین یقیناً اس پیشین گوئی کے مصداق ہیں اور ہر دور کے دین کے مزاج شناس علماء اس میراث کے حامل رہے ہیں۔

ان واسطوں پر اعتبار واعتماد ضروری ہے، اگر ان پر اعتماد ختم ہوجائے اور مسلمانوں کی نظر میں ان کی عظمت باقی نہ رہے تو یقیناً اس دین کا اعتبار و استناد بھی مجروح ہوگا، جو ان

واسطوں سے ہم تک پہنچا ہے، اسی لئے حضرت جبرئیل علیہ السلام جو وحی لے کر آتے تھے، قرآن نے خاص طور پر ان کی امانت و دیانت کی گواہی دی: ''نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنَ'' (الشعراء: ۱۹۳) رسول اللہ ﷺ کی صرف اتباع و پیروی ہی کو کافی قرار نہیں دیا گیا؛ بلکہ آپ کی محبت بھی شرط ایمان ٹھہری اور آپ ﷺ کی تعظیم بھی واجب قرار دی گئی، شخصیت کی عظمت اس کا احترام اور اس پر مکمل اعتماد و اعتبار نہ ہو تو اس کی کامل اطاعت اور مکمل پیروی بھی نہیں ہوسکتی۔

جو لوگ اسلام پر حملہ کرنا چاہتے ہیں اور براہ راست اسلام پر اعتراض کرنے کی جرأت نہیں پاتے، وہ ان واسطوں کو مجروح کرتے ہیں، جن واسطوں سے لوگوں تک دین پہنچا ہے، یا پہنچ رہا ہے، ایسے عناصر محسوس کرتے ہیں کہ اگر قرآن کے خلاف کوئی بات کہی جائے، مسلمان اسے ہرگز برداشت نہیں کریں گے، مسلمان جیسا کچھ بھی ہو، رسول اللہ ﷺ کی محبت میں اس کے رگ گلو کٹا لے گا؛ لیکن آپ ﷺ کی ادنیٰ بے احترامی کو برداشت نہیں کرے گا، اس لئے معاندین اسلام نے دین کے دوسرے واسطوں پر حملہ کرنے کی کوشش کی ہے، بعضوں نے حدیث کے دلیل و حجت ہونے کا انکار کیا؛ کیوں کہ اگر حدیثیں ہی نامعتبر ٹھہریں، تو دین کے نام پر بد دینی میں کوئی رکاوٹ باقی نہیں رہے گی اور قرآن کی من مانی اور من چاہی تفسیر کا راستہ کھل جائے گا، کچھ لوگوں نے صحابہ رضی اللہ عنہم کی شخصیت کو مجروح کرنے کی ناروا کوشش کی؛ کیوں کہ صحابہ رضی اللہ عنہم تو دین کے حامل اول ہیں، اگر وہی نامعتبر ٹھہریں گے تو اس دین پر کیا اعتبار باقی رہے گا؟ کچھ لوگوں نے فقہاء سلف پر طعن و تشنیع کی زبان کھولی اور کوشش کی کہ اُمت میں وہ ناقابل اعتماد، کم فہم اور اجتہاد و استنباط میں کوتاہ کار اور کوتاہ فکر سمجھے جائیں؛ کیوں کہ فقہ فقہاء کی کوئی طبع زاد چیز نہیں ہے؛ بلکہ یہ کتاب وسنت کا نچوڑ ہے، جس میں اللہ اور اس کے رسول کے مقصد و منشاء کو ایک مکمل نظام زندگی کی حیثیت سے مرتب کر دیا گیا ہے اور اس طرح عام لوگوں کے لئے دین تک رسائی اور دین پر عمل آسان ہوگیا ہے، گویا یہ کتاب وسنت کے مقصد و منشا کے ترجمان اور اس کے بے آمیز شارح ہیں، اگر ان پر اعتماد ختم ہوجائے اور ان کے اجتہادات یکسر قابل رد قرار پائیں تو پھر ہر شخص کے لئے کتاب وسنت کی حسبِ خواہش تشریح و

توضیح کا موقع نکل آئے گا اور دین بازیچۂ اطفال بن جائے گا۔

اب اس وقت عالمی سطح پر اس بات کی کوشش کی جارہی ہے، کہ علماء کو مجروح کیا جائے، ان کو نکما، کم فہم، اُمت کے لئے بوجھ، جذباتی اور مشتعل مزاج، نیز شدت پسند ثابت کیا جائے، اس سلسلہ میں صہیونی لابی اور ہندوستان کی فسطائی طاقتیں خاص طور پر سرگرم ہیں؛ بلکہ اس سلسلہ میں اس مہم کے لئے ایک دوسرے کا بھرپور تعاون کررہی ہیں، دینی مدارس پر جو اعتراضات کئے جارہے ہیں اور ان کو ہدف طعن بنایا جارہا ہے، یہ اسی ناروا کوشش کا ایک حصہ ہے اور اب طالبان کی آڑ میں اس موضوع کو اور بھی ہوا دی جارہی ہے۔

اعداء اسلام کی طرف سے مدارس اور علماء کے خلاف یہ مہم جوئی خود اس حقیقت کو ظاہر کرتی ہے کہ اسلامی عقیدہ، اسلامی ثقافت اور اسلامی تشخصات کی حفاظت اور مسلمانوں کو مسلمان باقی رکھنے میں اس طبقہ کا کتنا بڑا حصہ ہے، جو آج دشمنوں کی نگاہ میں سب سے زیادہ کھٹک رہا ہے اور وہ یہ محسوس کررہے ہیں کہ جب تک یہ درویش صفت اور مادی وسائل کے اعتبار سے خستہ حال؛ لیکن اسلام کے لئے ہر طرح کی قربانی پر آمادہ گروہ باقی رہے گا، ممکن نہیں کہ مسلمانوں کے عقیدہ وایمان کو اغوا کیا جاسکے اور انھیں مغربی یا زعفرانی تہذیب میں جذب کیا جاسکے، یا ایسا سخت جان گروہ ہے کہ اسے بیگانے بھی برا کہتے ہیں اور جو اپنے ہیں وہ بھی اس پر تحقیر وملامت کا تیر پھینکنے سے نہیں چوکتے، بے گھر، یا خستہ حال گھر کے مالک، بہت سے اسبابِ عیش جو آج زندگی کی ضرورت کہلاتے ہیں، ان کے کام تو کیا، نام سے بھی نابلد، جہاں دو چار گھر مسلمان موجود ہوں، خواہ سڑکیں نہ ہوں، بجلی نہ ہو اور دوسری سہولتیں بھی نہ ہوں، مسجد کے چبوترے پر بوریہ بچھائے وہیں فروکش، خاموش اور غیر محسوس طریقہ پر کام میں مصروف؛ لیکن آہستہ آہستہ اس کی تعلیم اور اس کی صحبت سے پوری آبادی کا رنگ ڈھنگ بدل جاتا ہے، عقیدہ کی اصلاح ہوتی ہے، لوگ فسق اور گناہ سے توبہ کرتے ہیں، چھوٹے چھوٹے بچے اسلامی وضع کا نمونہ بن جاتے ہیں، جو بوڑھی پیشانیاں سجدہ کی لذت سے ناآشنا تھیں، وہی اتباعِ سنت کا مظہر بن جاتی ہیں، ان کے ذریعہ نہایت خاموش، ٹھوس، دوررس اور وسیع الاثر انقلاب

پورے سماج میں آتا ہے اور آہستہ آہستہ نیچے سے اوپر تک کی سطح پر ایک ایسا انقلاب رونما ہوتا ہے، کہ چند سال پہلے تک اس کا تصور بھی دشوار تھا، یہی وہ حقیقت ہے جو اسلامی تشخصات سے بیر رکھنے والوں کی آنکھوں میں چبھتی ہے۔

روس میں جب کمیونسٹ انقلاب آیا تو اس کی ابتداء اسی طرح ہوئی کہ علماء کے خلاف بہتان باندھے گئے، بدگمانیاں پھیلائی گئیں، ان کے بارے میں بے سروپا باتیں مشتہر کی گئیں اور عوام اور علماء کے درمیان ایک خلیج پیدا کردی گئی، یہ خلیج اتنی بڑھی کہ مریدوں نے اپنے پیر اور مصلیوں نے اپنے امام کے کام خود تمام کئے، اس کے بعد دشمنانِ دین کے لئے کوئی رکاوٹ باقی نہیں رہی اور انھوں نے بہت آسانی سے دلوں میں الحاد و دہریت کا تخم بودیا اور اس طرح وہ اشتراکی انقلاب رونما ہوا، جس کی خونچکاں داستان اہل نظر کی نظر سے مخفی نہیں، اب عالمی سطح پر اسی تجربہ کو دہرانے کی کوشش کی جارہی ہے اور چوں کہ ہندوستان مدارس کا مرکز اور علم دین کا سرچشمہ ومنبع بنا ہوا ہے، اس لئے یہاں بھی ایسی سعی نامسعود جاری وساری ہے۔

غیروں کی عیاری اور اپنوں کی سادگی دیکھ کر افسوس ہوتا ہے کہ ہمارے بہت سے اچھے خاصے پڑھے لکھے اور بہ ظاہر زمانہ آگاہ لوگ بھی بے تکلف اس سازش کا شکار بن جاتے ہیں، اور وہ بھی ان مدارس کے خدام اور ان کے فضلاء کو اپنی کم نگاہی کی وجہ سے کم نگاہی سے دیکھنے لگتے ہیں، مولویوں پر اعتراض کرنے کو بہت سے لوگ گویا پیدائشی حق سمجھتے ہیں، مگر یاد رکھنا چاہئے کہ علماء کے اعتماد کو مجروح کرنا دراصل دین کو مجروح کرنے کے مترادف ہے، اس میں شبہ نہیں کہ بہت سی کمزوریاں اس طبقہ میں ہوسکتی ہیں، ممکن ہے کسی خاص مدرسہ سے آپ کی شکایت بجا ہو، ہوسکتا ہے کہ کسی خاص عالم پر آپ کی خفگی برحق ہو؛ لیکن اس شخصی اور جزوی کوتاہی کو پورے طبقۂ علماء اور مدارس سے بدگمانی کا ذریعہ بنانا یہ اپنے گھر کو آپ آگ لگانے کے ہم معنی ہے، دیکھنا یہ چاہئے کہ بہ حیثیت مجموعی اس گروہ سے کیا نفع پہنچ رہا ہے؟ تھوڑی دیر کے لئے غور کیجئے کہ :

اگر ہندوستان میں یہ مدارس اور ان کے فضلاء نہیں ہوتے تو مسلم

حکومت کے زوال کے بعد سے آج تک ہم کس حشر میں ہوتے ، ہمارے نام اور کام میں کہیں اسلام کا ادنیٰ سا رنگ بھی ہوتا ؟ ہمیں حلال وحرام کے بنیادی مسائل کی رہنمائی بھی کسی سے حاصل ہوسکتی ؟ اور ہمیں فکری وتہذیبی ارتداد سے بچنے کا کوئی سامان مہیا ہوتا ؟ یقینا اس کا جواب نفی میں ہے، مسلمان اس ملک میں خون کے دریاؤں سے تیر کر باہر نکلے ہیں، انھوں نے ظلم وجور کا برہنہ رقص نہ جانے کتنی بار دیکھا ہے، معیشت کے نقصان اُٹھائے ہیں، تعلیم میں پسماندگی کو سہا ہے، گاہے اپنی آنکھوں سے اپنے بچوں کو تڑپتے ہوئے اور اپنی عزت وآبرو کو سرِ بازار نیلام ہوتے ہوئے بھی دیکھا ہے، ان پر تحریض کے ہتھیار بھی آزمائے گئے ہیں اور مال وجائداد سے لے کر عزت وجاہ اور کرسی واقتدار کی طمع بھی انھیں دلائی گئی ہے، کہ وہ دین کی حبل متین کو چھوڑ دیں ؛ لیکن یہ سارے ہتھیار کیوں ناکام ہوئے اور غارت گرانِ ایمان کو کیوں کفِ افسوس ملنا پڑا ؟ یقینا یہ انھیں مدارس اور ان کے فضلاء کی بے لوث کاوشوں اور انتھک محنتوں کا نتیجہ ہے۔

علماء کی عظمت اور ان پر اعتماد قائم رہے، اسی مقصد کے لئے رسول اللہ ﷺ نے اپنے ارشادات اور عمل کے ذریعہ مسلمانوں کے ذہن میں اس سبق کو راسخ فرمایا، قرآن نے کہا کہ علماء اور دوسرے لوگ برابر نہیں ہوسکتے : '' قُلْ هَلْ يَسْتَوِى الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَايَعْلَمُوْنَ '' (الزمر:۹) نماز کی امامت سب سے معزز کام تھا، جسے زندگی بھر حضور ﷺ نے انجام دیا، آپ کے بعد خلفاء راشدین نے امامت کی اور مسلم دور میں عرصہ تک امراء اور گورنر امامت کیا کرتے تھے، اس کے لئے رسول اللہ ﷺ نے علم ہی کو معیار بنایا ہے اور فرمایا کہ سب سے زیادہ امامت کا مستحق عالم قرآن ہے، پھر عالم حدیث : '' یؤم القوم اقرؤھم بکتاب اللہ ،

فان کانوا فی القرأۃ سواء فاعلمھم بالسنہ'' (مسلم، حدیث نمبر: ٦٧٣) نماز میں بھی ہدایت تھی کہ آپ سے قریب اہل علم رہا کریں: ''**لیلینی منکم اولوا الاحلام والنھی**'' (مسلم، حدیث نمبر: ٤٣٢) یہاں تک کہ موت کے بعد بھی آپ نے تعظیم واحترام کے اس مقام کو باقی رکھا، غزوۂ اُحد کے دو دو شہید ایک ساتھ دفن کئے جاتے، آپ تحقیق فرماتے کہ ان میں سے کون زیادہ قرآن کا حافظ تھا، جس کو قرآن زیادہ یاد ہوتا، اسے قبلہ کی سمت میں آگے کی جانب رکھتے، (بخاری، عن جابرؓ) حضرت عمرؓ نے باوجود کم سنی کے اکابر صحابہؓ کے ساتھ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کو مجلس شوریٰ میں جگہ دی، علم اور علم میں اشتغال کو نفل نماز سے بھی آپ ﷺ نے افضل قرار دیا، رسول اللہ ﷺ کے ان اشارات کا مقصد یہ بھی ہے کہ علماء دین کے حاصل کرنے اور دین کو سمجھنے کے لئے واسطہ ہیں، اگر یہ واسطہ مجروح ہوجائے تو دین پر اعتماد باقی نہیں رہے گا۔

پس؛ موجودہ عالمی حالات اور خود ہمارے ملک کے بدلتے ہوئے رجحانات کے پس منظر میں اس بات کو سمجھنے کی ضرورت ہے کہ علماء کو مجروح کرنے کی کوشش بالواسطہ خود اس دین پر تیشہ چلانے اور مسلمانوں کا اسلام سے رشتہ کمزور کرنے کی ایک سازش ہے، اگر اسے نہ سمجھا گیا تو ایسا نقصان ہوگا کہ جس کی تلافی بھی ممکن نہ ہوگی۔

دینی مدارس کے فضلاء

صبر و برداشت ضروری ہے!

رسول اللہ ﷺ نے علماء کو چودھویں کے چاند سے تشبیہ دی اور بعض روایتوں میں انھیں ستاروں کے مانند قرار دیا گیا ہے، اس میں غور وفکر کا ایک پہلو یہ ہے کہ دنیا میں بعض چیزیں ایسی ہوتی ہیں، جن کا نفع اس کے قریبی دائرہ تک محدود رہتا ہے اور بعض چیزوں کا نفع پوری کائنات کو محیط ہوجاتا ہے، دریا اپنے گرد وپیش پانی فراہم کرتا ہے، درخت اپنے سایہ میں رہنے والوں کو ٹھنڈک پہنچاتا ہے، دنیا کی اکثر چیزیں اسی نوعیت کی ہیں؛ لیکن سورج اپنا سینہ جلاکر پوری کائنات کو تمازت بخشتا ہے، چاند اپنی خنک بار روشنی سے پوری زمین کو چاندنی کی سفید چادر اُوڑھاتا ہے، تاروں کا حال یہ ہے کہ وہ اپنے چشم وابرو کے اشارہ سے مشرق سے مغرب تک لوگوں کو منزل مقصود کا راستہ بتاتے ہیں، پس، علماء کو چاند اور ستاروں سے تشبیہ دینے میں بھی اس بات کی طرف اشارہ موجود ہے کہ ان کے علم کی روشنی کسی ایک علاقہ کے لئے مخصوص نہیں، اس کا دائرہ غیر محدود اور بے پناہ ہے،

ایسا نہیں ہوتا کہ چاند اور ستارے شہر کی پُر رونق آبادیوں میں اپنی روشنی بکھیرتے ہوں ؛لیکن دیہات کی تنگ اور میلی کچیلی پگڈنڈیوں سے آنکھیں موند لیتے ہوں، کہ ان گندی بستیوں اور دور افتادہ آبادیوں تک اپنی کرنیں کیوں پہنچائی جائیں؟ یہی بات فضلاء مدارس کے سوچنے کی ہے، اس وقت صورتِ حال یہ ہے کہ علماء کی ساری تعلیمی اور دعوتی سرگرمیاں شہروں تک محدود ہوکر رہ گئی ہیں، شہر میں نہ صرف یہ کہ ہمارے دینی تعلیمی ادارے کام کررہے ہیں؛ بلکہ اگر یہ کہا جائے تو بے جانہ ہوگا کہ بعض مقامات پر جو زائد از ضرورت ادارے قائم ہورہے ہیں،

چھوٹے چھوٹے محلوں میں ایک سے زیادہ درس گاہیں قائم ہیں، وہاں طلبہ کی تعداد اتنی کم ہے کہ ایک ادارہ ان کے لئے کافی تھا، پھر ان اداروں میں باہم کمرشیل اداروں کی طرح رقابت اور منافست کی کیفیت بھی ہے، بعض دفعہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ کمیٹی میں اختلاف ہوگیا، ایک گروہ مدرسہ پر قابض ہوگیا، دوسرے گروہ نے قریب ہی دوسرا مدرسہ کھول لیا، گویا ادارے کسی ضرورت یا خدمت کی کسی نئی جہت کے لئے قائم کرنے کے بجائے محض مقابلہ اور تفاخر کے جذبہ سے بھی قائم کئے جارہے ہیں، یہ کس قدر افسوس ناک بات ہے کہ ایک دینی کام دینی جذبہ سے خالی ہوکر انجام دیا جائے!

اس کے برخلاف دیہاتوں کا حال دیکھئے، بہت سے دیہات ایسے ہیں جہاں کوئی نماز جنازہ پڑھانے والا میسر نہیں اور بہت سی لاشیں بغیر نماز کے دفن کردی جاتی ہیں، کہیں قادیانیت حملہ زن ہے، کہیں ہندو فرقہ پرست تنظیمیں مسلمانوں کو مرتد کرنے پر کمر بستہ ہیں، کہیں عیسائی مشنریز ایمان پر ڈاکہ ڈال رہی ہیں، جہالت کا حال یہ ہے کہ محرم رشتوں کا پاس ولحاظ بھی اُٹھ چکا ہے، ہندو رسم ورواج سے متاثر ہوکر ماموں بھانجی میں نکاح ہوتا ہے اور چچازاد بھائی سے نکاح نہیں ہوتا، مسلمان طرح طرح کی اخلاقی اور سماجی برائیوں میں مبتلا ہیں اور سورۂ فاتحہ اور سورۂ اخلاص تک نہیں پڑھ سکتے؛ بلکہ کتنے ہی لوگ ہیں، جو کلمۂ طیبہ اور کلمۂ شہادت سے بھی محروم ہیں، آخر ان ناواقف مسلمانوں کی اصلاح وہدایت کی ذمہ داری کن پر ہے؟ کیا علماء اس ذمہ داری سے سبکدوش ہوسکتے ہیں؟

حقیقت یہ ہے کہ ان دیہاتوں میں مکاتب کے قیام کی ضرورت ہے، ان مکاتب میں چھوٹے بچوں کی تعلیم بھی ہو اور تعلیم بالغان کا بھی انتظام ہو، جس کے ذریعہ ضروریات دین سے لوگ واقف ہوجائیں، سب سے اہم مسئلہ ان دیہاتوں میں کام کرنے والے لوگوں کا ہے، اس وقت صورت حال یہ ہے کہ ہمارے فضلاء شہر کی رونقوں کو چھوڑ کر دیہاتوں میں جانے اور کام کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتے، یہاں تک کہ جو لوگ دیہاتوں میں پیدا ہوئے اور دیہات کے ماحول میں ان کی نشوونما ہوئی، وہ بھی شہر کی آب وتاب پر اس قدر ریجھ جاتے

ہیں کہ دیہات کی طرف واپس جانے کو تیار نہیں ہوتے ، یہ نہایت ہی افسوس ناک صورتِ حال ہے، مقام حیاء ہے کہ عیسائی مشنریز تو یورپ اور امریکہ سے آ کر ہندوستان کے پسماندہ ترین دیہاتوں میں کام کریں اور عیسائیت کو پھیلانے میں اپنی پوری قوت صرف کر دیں، اس کا نتیجہ آپ خود آندھرا کے دیہاتوں میں جا کر دیکھ سکتے ہیں، جہاں جگہ جگہ نو تعمیر شدہ چرچ آپ کو نظر آئیں گے، قادیانی ختم نبوت کے باغی ہیں اور اسلام کو سخت نقصان پہنچانے کے درپے ہیں؛ لیکن صورتِ حال یہ ہے کہ کشمیر اور پنجاب جیسے دور دراز علاقوں سے ان کے مبلغین آتے ہیں اور ایسے گاؤں میں کام کرتے ہیں، جہاں موٹر اور بس کے پہنچنے کے لئے راستے تک میسر نہیں؛ بلکہ بعض اوقات یہ گورے چٹے نوجوان دیہات کی کالی کلوٹی، اَن پڑھ اور غیر مہذب لڑکیوں سے نکاح کر لیتے ہیں، تا کہ انھیں جائے پناہ میسر آ جائے اور وہ اسے اپنے مشن کے لئے تیار کریں؛ لیکن ہمارے فضلاء جو یقیناً حاملین حق ہیں اور جن کا مقصد زندگی ہی اسلام کی حفاظت واشاعت ہے، وہ ایسے مقامات پر جانے کے لئے تیار نہ ہوں اور شہر وقصبات سے آگے قدم نہ بڑھائیں!!

اگر یہ مدارس عام درس گاہوں کی طرح محض درس گاہ نہیں؛ بلکہ حفاظت اسلام کی ایک زندہ تحریک ہیں اور اگر یہ مدارس کسب معاش کے پیشوں میں سے ایک پیشہ نہیں؛ بلکہ یہ آخرت کی ''تجارت رابحہ'' ہیں، اگر ہم احیاء اسلام کی مساعی کا ایک حصہ ہیں اور اس کاروان عزیمت سے نسبت رکھتے ہیں، جس نے اس ملک میں دین کے بقاء وارتقاء کے لئے سر دھڑ کی بازیاں لگا دی تھیں، تو یہ ہمارے لئے ایک امتحان ہے کہ کیا ہم زندگی کی معمولی سہولتوں کی قربانی کو بھی دین اور اُمت کے لئے گوارا نہیں کر سکتے ؟ کیا ہم ان اہل باطل سے بھی گئے گذرے ہیں، جو اپنے فاسد عقیدے کی سوغات لے کر سماج کو بے روح بنانا چاہتے ہیں! یہ وقت کا نہایت اہم مسئلہ ہے کہ فضلاء مدارس دیہاتوں میں کام کریں وہاں تعلیمی ادارے قائم کرنے کو تیار ہوں اور اس کو اپنا فریضۂ منصبی سمجھیں۔

فضلاء مدارس کے لئے ایک ضروری وصف جو مطلوب ہے وہ حلم و بردباری ہے، جیسے

بوئے گل پھیلنے اور لوگوں کو عطر بار کرنے کے لئے بادِ نسیم کی محتاج ہوتی ہے، اسی طرح علم اس وقت نافع ہوتا ہے اور اللہ کے مخلوق تک اس کا نفع پہنچتا ہے جب عالم کے اندر تحمل اور بردباری ہو، وہ ناموافق باتوں کو سہہ سکتا ہو اور مشتعل کرنے والی باتوں پر بھی بے برداشت نہ ہوتا ہو، قرآن مجید میں انبیاء اور ان کی اقوام کا تذکرہ اس پہلو سے دیکھئے تو حیرت ہوتی ہے کہ مقام نبوت سے ناآشنا لوگ کیسی کیسی جسارتیں کر جاتے تھے؛ لیکن انبیاء کا جواب کبھی بھی متانت وسنجیدگی اور محبت وہمدردی کے تقاضے کے خلاف نہیں ہوتا۔

یہ نہایت ضروری وصف ہے، جو علماء کے میدانِ عمل میں مؤثر ہونے اور ان کی کاوشوں کے نتیجہ خیز ہونے کے لئے ضروری ہے، مشہور ہے کہ ایک جیوتشی نے ایک بادشاہ سے کہا کہ آپ کے تمام اعزہ آپ کی موجودگی میں مرجائیں گے، بادشاہ اس بات سے بہت خفا ہوا اور اس نے اسے قتل کرادیا، پھر اس نے دوسرے جیوتشی سے رجوع کیا، اس نے کہا اللہ تعالیٰ آپ کے تمام ترشتہ داروں کے مقابلہ آپ کو عمر دراز عطا فرمائیں گے، بادشاہ اس کے جواب سے بہت خوش ہوا اور اسے انعام واکرام سے نوازا، بات ایک ہی تھی؛ لیکن تعبیر کے فرق نے ایک کو تختہ دار پر پہنچایا اور دوسرے کو انعام شاہی سے ہمکنار کیا۔

بردباری کا پہلا اثر زبان اور گفتگو پر ہی ظاہر ہوتا ہے، ایک ہی بات کو سخت لب ولہجہ میں کہا جائے تو اس کا اثر اور ہوتا ہے، اسی بات کو نرم زبان میں محبت آمیز تبسم کے ساتھ کہا جائے تو اس سے دشمن دوست اور بیگانے اپنے بن جاتے ہیں، ایک معرکہ پر رسول اللہ ﷺ نے کچھ لوگوں کو بھیجا، اتفاق سے اس معرکہ میں مسلمانوں کو پسپائی ہوئی، جو لوگ واپس ہوئے وہ اتنے شرمسار تھے کہ رسول اللہ ﷺ کا سامنا کرنے سے بھی گریزاں تھے اور مارے حیا کے کہتے تھے، کہ ہم تو بھاگے ہوئے لوگ ہیں: ''**نحن الفرارون**'' رحمتِ عالم ﷺ کو اس کی اطلاع ہوئی تو آپ ﷺ نے ان کا حوصلہ بڑھاتے ہوئے فرمایا: ''**بل انتم الکرارون**'' یعنی تم پیچھے ہٹ کر دوبارہ حملہ کرنے والے ہو، اس سخن دل نواز کو دیکھئے کہ اس نے کس قدر جاں نثاروں کا حوصلہ بڑھایا ہوگا!

نوجوان فضلاء جب نہی عن المنکر یعنی برائی سے روکنے کا کام کرتے ہیں تو اکثر حلم کا پہلو نگاہ سے اوجھل ہو جاتا ہے؛ بلکہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ بعض دفعہ معمولی منکر کے لئے سخت لب ولہجہ اختیار کرلیا جاتا ہے، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اصلاح کے بجائے ضد کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے، موقع ومحل کی رعایت، سن وسال کا خیال اور مخاطب کی حیثیت عرفی کا لحاظ طریقۂ انبیاء رہا ہے، نہی عن المنکر کا مقصد کسی مسلمان کی تذلیل یا اپنی اَنا کی تسکین نہیں؛ بلکہ ایک مسلمان کو گناہ سے بچانا اور برائی سے روکنا ہے، یہ بات ہمیشہ ملحوظ رہنی چاہئے، جو لوگ ان پڑھ اور کم تعلیم یافتہ ہوں، وہ بعض دفعہ ناشائستہ گفتگو کر گذرتے ہیں، بعض لوگ تعلیم یافتہ ہوتے ہیں؛ لیکن علماء کے بارے میں ان کے ذہن میں غلط فہمیاں اور شکوک وشبہات ہوتے ہیں، وہ اپنی ناواقفیت اور ناسمجھی کی وجہ سے تحقیر آمیز لب ولہجہ اختیار کر لیتے ہیں، اگر ان کے ساتھ ترکی بہ ترکی جواب کا معاملہ رکھا جائے تو یقیناً ان سے اس کی زبان گنگ ہو سکتی ہے؛ لیکن ایسے جواب سے دل میں محبت کے پودے نہیں اُگائے جاسکتے، ایسے مواقع پر تحمل اور برد باری کی ضرورت ہے، کہ ہماری گفتگو کانٹوں کے مقابلہ پھول اور پتھر کے مقابلہ موم جیسی ہو، اس طرح بظاہر ایک بار ان کی بات سہنی پڑے گی؛ لیکن یہ متانت وسنجیدگی اور کلمۂ نصح ومحبت انھیں مجبور کرے گا کہ وہ اپنے رویہ پر نظر ثانی کریں، ایسی بہت سی مثالیں موجود ہیں، کہ ایک شخص نے کسی عالم دین سے تلخ کلامی کی؛ لیکن ان کے تحمل اور صبر کے رویہ کی وجہ سے وہی شخص اس کا ایسا گرویدہ ہو گیا کہ اب وہ اپنا کوئی فیصلہ ان کے مشورہ کے بغیر نہیں کرتا، میٹھا پھل کھانے اور اپنی محنت وصول کرنے کے لئے صبر وبرداشت ضروری ہے اور یہی نظامِ فطرت ہے!

کس سے کہوں کہ زہر ہے میرے لئے مئے حیات؟

شعبان کا مہینہ برصغیر میں ایک خاص روایت کا حامل ہوگیا ہے؛ کیوں کہ دینی مدارس کا آغاز شوال سے ہوتا ہے اور شعبان پر تعلیم اور حساب و کتاب کا اختتام عمل میں آتا ہے، جو مدارس ابتدائی تعلیم کے ہیں، ایک خاص حد تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد طلباء وہاں سے نسبتاً بڑے مدارس میں منتقل ہوجاتے ہیں، جن درس گاہوں میں حفظ قرآن کی تعلیم کا نظم ہے، وہاں یہی تکمیل درس قرآن کا موسم ہوتا ہے، جہاں دورۂ حدیث تک یا تخصصات کی تعلیم کا انتظام ہے، وہاں سے طلباء سندِ فراغت حاصل کرتے ہیں، یہ ان کی زندگی میں ایک نیا مرحلہ اور نیا موڑ ہوتا ہے، اب انھیں اُمت کے مختلف کاموں کی ذمہ داری انجام دینی ہوتی ہے، عام طور پر امامت، خطابت، مکتب کی تعلیم یا نسبتاً اونچی جماعتوں کی تدریس ان سے متعلق ہوتی ہے؛ لیکن ان کی جدوجہد کا دائرہ اسی میں محدود نہیں ہوتا، وہ ان کاموں کو کرتے ہوئے دوسرے اُمور بھی انجام دیتے ہیں اور اُمت کی دوسری دینی ضروریات بھی ان ہی سے پوری ہوتی ہیں، مسلمانوں میں اختلاف ہوجائے تو ان کے درمیان صلح کرانا، اور سماج میں جو بھی مسئلہ پیش آئے ان کے بارے میں شرعی احکام کی رہنمائی کرنا، سماج کو نیکی کی طرف بلانا اور برائی سے روکنا، ہر عالم اس کو اپنا فریضہ سمجھتا ہے، اور اپنی صلاحیت اور توفیق کے مطابق اسے انجام بھی دیتا ہے، اس لحاظ سے ان کی ذمہ داریاں بڑی اہم ہیں اور بحیثیت مجموعی اُمت کو اسلام سے مربوط رکھنے اور ان کے شیرازہ کو بکھراؤ سے بچانے میں ان فضلاء کا بڑا اہم رول ہے۔

ان مدارس کا نظام سادگی پر رکھا گیا ہے، سادہ عمارت، سادہ رہن سہن، خورد ونوش کا سادہ انتظام، پہننے اوڑھنے میں سادگی، ہر طرح کے تکلفات اور تعیّشات سے دور، ابتداءً ان مدارس کا یہی مزاج تھا اور بہت سے دینی درس گاہیں اپنے زمانہ کے معیار زندگی کے اعتبار سے

اسی روش پر قائم ہیں، ایسا لگتا ہے کہ تحریک مدارس کے مؤسسین نے قصداً یہ طرزِ عمل اختیار کیا تھا، تاکہ ان مدارس میں تعلیم حاصل کرنے والے لوگ مشکل حالات میں کام کرنے کے عادی رہیں اور دین کی خدمت انجام دے سکیں، یہ نہایت اہم پہلو ہے، اور ہمارے فضلاء کے لئے ضروری ہے کہ وہ ہمیشہ اس کو ملحوظ رکھیں۔

اللہ تعالیٰ کو جن لوگوں سے اپنے دین کا کام لینا مقصود ہوتا ہے، ان کی تربیت کا بھی انتظام کیا جاتا ہے اور اس کا سب سے اہم حصہ یہ ہوتا ہے کہ انھیں مشقتیں جھیلنے اور خلاف طبیعت باتیں برداشت کرنے کی عادت ہوجائے، قرآن مجید نے انبیاء کرام کے واقعات کو تفصیل سے بیان کیا ہے، ان میں زیادہ تر واقعات انبیاء اور ان کی اقوام کے درمیان کشمکش اور مخالفین حق کی جانب سے ایذاء رسانی کے ہیں، رسول اللہ ﷺ آخری نبی اور انسانیت کے لئے اسوۂ کاملہ تھے، اس لئے آپ اور زیادہ ابتلاؤں سے گذارے گئے اور آپ کو اوروں سے بڑھ کر آزمائش کی بھٹیوں میں تپایا گیا، غور کیجئے! کیا خدا اس پر قادر نہیں تھا کہ جو غلبہ آپ کو فتح مکہ کے بعد حاصل ہوا وہ نبوت کے پہلے ہی دن حاصل ہوجاتا، اور جن لوگوں نے ۸ ہجری میں آپ کے شوکت وجلال کو دیکھ کر سرِ تسلیم خم کیا وہ اول دن ہی اسلام کے سامنے سر جھکا دیتے؛ لیکن ایسا نہیں ہوا، آپ نے پتھر بھی کھائے، گالیاں بھی سنیں، چوٹیں بھی سہیں، بھوکے بھی رہے، طائف کی سڑکوں سے بھی گذارے گئے، بدر واُحد کے معرکوں میں بھی آزمائے گئے، چہرۂ انور بھی لہولہان ہوا، منافقین مدینہ کی ستم انگیزیوں اور جفا کاریوں کو بھی برداشت کرنا پڑا، پھر جاکر اسلام کو فتح وکامرانی حاصل ہوئی، کیا خدا اس بات پر قادر نہیں تھا کہ اول دن سے ہی اہل مکہ کے قلوب کو آپ کے لئے نرم کردیتا اور وہ ایمان لے آتے؟ اللہ یقینا اس بات پر قادر تھے ؛لیکن اس کے ذریعہ تربیت اور امتحان کے مراحل سے آپ کو گذارنا مقصود تھا۔

علماء جب انبیاء کے وارث ہیں تو یقینا انھیں بھی آزمائشوں سے گذرنا ہوگا، انھیں زندگی کا ایک سادہ نقشہ تیار کرنا ہوگا، جس میں معمولی کھانے، پینے، معمولی مکان، معمولی لباس اور معمولی طرز زندگی کی ہی گنجائش ہوگی، لوگوں کے طعنے بھی سننے پڑیں گے، تکلیف دہ باتوں کو

بھی انگیز کرنا ہوگا اور زندگی کی بہت سی نعمتوں سے اپنے آپ کو دور رکھنے پر آمادہ رکھنا ہوگا، یہ مشقتیں اوروں کے لئے مشقت ہے اور کاروانِ عشق کے لئے حاصل حیات، بقول اقبالؒ کے :

کس سے کہوں کہ زہر ہے میرے لئے مئے حیات
کہنہ ہے بزم کائنات ، تازہ ہیں میرے واردات
صدقِ خلیل بھی ہے عشق ، صبر حسین بھی ہے عشق
معرکۂ وجود میں بدر و حنین بھی ہے عشق

اس مئے حیات کو بچانا وقت کی ضرورت ہے، جہاں پوری فضاء مادیت کی پرستار اور دلدادہ ہو، وہاں قناعت وتوکل کی بات مضحکہ خیز سمجھی جاتی ہے؛ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ قناعت ہی کی خمیر سے ان مدارس کا وجود اُٹھا ہے اور جس قدر اس کی اہمیت کل تھی اس سے زیادہ آج ہے، اس وقت صورتِ حال یہ ہے کہ بہت سے علاقے شہر کی رونقوں اور راحتوں سے دور ہیں ، وہاں ہمارے خاندان کا ایک حصہ آباد ہے، ان میں بعض مسلمان ایسے ہیں جن کے کانوں نے آج تک اللہ اکبر کی صدا بھی نہیں سنی ہے اور جن کی زبانیں جہالت کی وجہ سے اللہ اور رسول کا نام بھی صحیح طریقہ پر نہیں لے سکتیں، ہمارے نوجوان فضلاء وہاں کام کرنے سے گریزاں ہیں ؛ کیوں کہ وہاں وہ سہولتیں نہیں ہیں اور معاشی اعتبار سے بھی وہاں کے حالات بہت مایوس کن ہیں —— اگر ان مقامات پر ہم جا کر اپنی قوم کی خدمت نہیں کریں تو کون ان کے ایمان کی حفاظت کرے گا اور کیوں کر ان کو اسلام پر قائم رکھنا ممکن ہوگا ؟ اگر ایسی جگہوں پر عیسائی مشنریز اور قادیانیت پہنچتی ہے، تو ہمارے لئے شکوہ سنج ہونے کا کوئی جواز نہیں، یہ کیسے ممکن ہے کہ کسی طبقے کو آپ ٹھکرائیں اور اسے کوئی اور بھی نہ اپنائے ؟

دوسری اہم بات یہ ہے کہ علماء کا اُمت سے تعلق محض ایک قانونی تعلق نہیں ہے؛ بلکہ روحانی اور ایمانی تعلق ہے، قانونی تعلق میں انسان اپنے آپ کو ڈیوٹی تک محدود رکھتا ہے، مقررہ کام کے سوا اور وہ کوئی اور کام کرنا نہیں چاہتا؛ کیوں کہ اس کا اسے معاوضہ نہیں ملتا؛ لیکن عالم کی حیثیت ایک ایسے چوکیدار کی ہے جو صرف اللہ کی رضا کے لئے دین کی حفاظت کی ذمہ

داری لیتا ہے، وہ ملازم نہیں؛ بلکہ رضا کار ہے، اس کے فرائض غیر محدود ہیں، اس کی خدمات کا دائرہ بہت وسیع ہے اور وہ تمام اُمور اس کے فرائض میں داخل ہیں جو اس اُمت سے اللہ کو مطلوب ہیں، اگر کوئی شخص فسادِ عقیدہ میں مبتلا ہو تو اس کے عقیدہ کی اصلاح، بے نمازی ہو تو نماز کی دعوت، کسی برائی میں مبتلا ہو تو اس کو برائی سے بچانے کی کوشش، مسلمان خاندان یا شوہر اور بیویوں میں اختلاف ہو، تو رفع اختلاف کی سعی، بچوں اور بڑوں کی تعلیم کا انتظام نہ ہو، تو ان کی تعلیم کا انتظام، کوئی آفت سماوی آجائے تو لوگوں کی مدد کے لئے اُٹھ کر کھڑا ہونا، الیکشن ہو رہا ہو تو مسلمانوں کے مفاد کی رعایت کے ساتھ لوگوں کی رہنمائی، اگر وہاں برادرانِ وطن کی آبادی بھی ہو تو ان کے ساتھ داعیانہ ربط وضبط، فرقہ وارانہ منافرت پھیل رہی ہو تو امن وامان قائم کرنے کی کوشش، غرض اُمت کا کوئی مسئلہ ہو، عالم کا فرض ہے کہ وہ کسی دنیوی منفعت کی طمع کے بغیر محض ملی مفاد اور دینی تقاضہ کے تحت اُٹھ کھڑا ہو، یہ نہایت اہم ضرورت ہے اور یہی علماء سلف کا طریقہ تھا، افسوس کہ اب فضلاء مدارس نے اپنے دائرہ عمل کو مسجد اور مدرسہ تک محدود کردیا، اس کی وجہ سے مسلمانوں میں صالح اور بے لوث قیادت کا خلا پیدا ہوگیا ہے، یہاں تک کہ بعض جگہ جاہل اور غیر سماجی عناصر نے مسلمانوں کے مسائل کو اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے اور ان کے عمل دخل سے جن نتائج کی توقع کی جاسکتی ہے، وہی نتائج ظہور میں آرہے ہیں۔

تیسری اہم بات مصلحت اندیشی اور زمانہ شناسی ہے، ہمارے نوجوان فضلاء میں بہ تقاضۂ عمر جوش اور زود رنجی زیادہ ہوتی ہے اور وہ زمین کے تیار ہونے سے پہلے پودا لگانے کی کوشش کرتے ہیں، اگر زمین نرم نہ کی گئی ہو اور اس میں بیج ڈال دیا جائے، اگر توا گرم نہ ہوا اور اس پر روٹی رکھ لی جائے، پھل تیار نہ ہو اور اسے مصنوعی طور پر پکایا جائے تو مطلوبہ نتیجہ حاصل نہیں ہوسکتا، اسی طرح اگر کوئی برائی جڑ پکڑ چکی ہے اور مدت دراز سے اس کی خو چلی آتی ہو، تو بیک لمحہ اس کی اصلاح نہیں ہوسکتی اور ایسی اصلاح سے اندیشہ ہے کہ فائدہ کم اور نقصان زیادہ ہو، اسی لئے احکام شریعت میں تدریج کا لحاظ رکھا گیا ہے، اکثر محرمات بہ تدریج حرام قرار دی گئیں اور شراب کا معاملہ تو بالکل واضح ہے، وہ تین مرحلوں میں حرام ہوئی، اس لئے یہ بات

ضروری ہے کہ حکمت و مصلحت کے پہلو کو ہمیشہ ملحوظ رکھا جائے، انسان جو کچھ کہے حق کہے؛ لیکن ہر حق بات کا ہر وقت کہہ دینا ضروری نہیں بعض دفعہ مرحلہ وار حق کا اظہار زیادہ مفید ثابت ہوتا ہے —— اگر علماء اس بات کو ملحوظ رکھیں تو بہت سے باہمی اختلاف جو مسجدوں اور دینی کاموں میں پیدا ہو جاتے ہیں، ان کی نوبت نہ آئے۔

چوتھی اہم بات اُمت کی وحدت کی حفاظت اور اس کو انتشار سے بچانا ہے، اتحاد کی ضرورت کب نہیں رہی ؟ لیکن موجودہ حالات میں اس کی اہمیت اور بڑھ گئی ہے، یوں تو اختلاف کے مختلف اسباب ہیں، سیاسی، خاندانی، کاروباری وغیرہ؛ لیکن مذہبی اختلاف کا مسلم سماج پر زیادہ گہرا اثر پڑتا ہے اور اس کا افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ مساجد، دینی درس گاہیں اور دینی اجتماعات اور مذہبی تقریبات جن کو اُمت کے اتحاد و اتفاق کا نمونہ ہونا چاہئے، وہی اختلاف و انتشار کا سبب بن جاتے ہیں اور جو لوگ اُمت کو جوڑنے کا کام کرتے، وہی اختلاف کے علمبردار بن کر کھڑے ہو جاتے ہیں، تو ایسی صورت میں کون ہے جو ان بکھرے ہوئے تسبیح کے دانوں کو پرو سکے، اور شکستہ دلوں پر مرہم رکھ سکے ! —— ہمارے فضلاء کو اس پر ضرور توجہ دینی چاہئے کہ وہ اُمت کے کسی ایک طبقہ کے رہنما نہیں ہیں؛ بلکہ پوری اُمت کے لئے دواءِ دل کا درجہ رکھتے ہیں، ان کو تمام مسلمانوں سے بحیثیت مسلمان محبت رکھنی چاہئے اور اس بات کی کوشش کرنی چاہئے کہ ان کی زبان اور قلم کہیں اُمت میں انتشار کا باعث نہ بنے۔

پانچویں اور بہت ہی اہم بات یہ ہے کہ اُمت کا ایک بہت بڑا طبقہ وہ ہے جس نے جدید علوم کو حاصل کیا ہے، جیسے ہمارے علماء دین کا وجود ایک ضرورت ہے ویسے ہی عصری علوم کے ماہرین بھی ہمارے لئے بہت بڑی ضرورت ہیں، ہم ان کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کر سکتے، یہ قوم کا بہت بڑا اثاثہ ہیں، یہ عام طور پر اسلام کے بارے میں مخلص بھی ہیں، اگر کچھ لوگ ایسی باتیں کرتے ہوں جو دین کے مزاج و مذاق کے خلاف ہیں، تو یہ زیادہ تر ان کی ناواقفیت اور ناآگہی کی وجہ سے ہے اور باہمی غلط فہمی کی وجہ سے علماء اور جدید تعلیم یافتہ طبقہ کے درمیان ایک خلیج سی پیدا ہوتی جا رہی ہے۔

یہ بہت افسوس ناک ہے اور اس میں زیادہ تر محض باہمی دوری اور غلط فہمی کو دخل ہے، علماء کا فریضہ ہے کہ وہ اس طبقہ کو اُمت کی بہترین امانت سمجھ کر قریب کریں، ان کے شکوک وشبہات کو تحمل کے ساتھ سنیں اور محبت کے ساتھ ان شکوک کے کانٹوں کو ان کے دلوں سے نکالیں، اُمت میں جو لوگ فکری اعتبار سے راہ مستقیم سے منحرف ہوں، ان کے ساتھ ہمارا سلوک وہی ہونا چاہئے جو ایک ہمدرد اور فرض شناس معالج کا اپنے ناسمجھ مریض کے ساتھ ہوتا ہے، ہمارا رویہ ان کے ساتھ فریق اور رقیب کا نہ ہو؛ بلکہ رفیق اور صدیق کا ہو۔

یہ ہمارے نوجوان فضلاء کے لئے ان کے ایک ایسے بھائی کی گذارشات ہیں جو اس راہ سے بہ مقابلہ ان کے کسی قدر پہلے گذر چکا ہے، یہ ایسی حقیقتیں ہیں کہ جن پر دھیان دینا وقت کی بہت بڑی ضرورت ہے اور جن سے پہلو تہی اُمت اور علماءِ اُمت دونوں کے لئے نقصان دہ ہے۔

علماء — دعوت دین اور خدمتِ خلق کی ذمہ داری

رسول اللہ ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ اپنے قریبی رشتہ داروں کو ایمان کی دعوت دیں: ''وَ اَنْذِرْ عَشِیْرَتَکَ الْاَقْرَبِیْنَ'' (الشعراء: ۲۱۴) آپ ﷺ کا تعلق قریش کی شاخ بنو ہاشم سے تھا، بنو ہاشم اور بنو مطلب مکہ کے قبائلی نظام میں ہمیشہ ایک دوسرے کے معاون و مددگار رہتے تھے، یہ باہمی نفرت وتعاون کا تعلق زمانۂ جاہلیت میں بھی تھا اور زمانۂ اسلام میں بھی رہا، آپ ﷺ نے اس حکم خداوندی کی تعمیل کے لئے یہ تدبیر کی کہ ان کے لئے دعوتِ طعام کا نظم کیا، انھیں کھانا کھلایا اور کھلانے کے بعد ان پر اسلام پیش کیا، ابولہب نے تو اس کو قبول کرنے سے علانیہ انکار کر دیا، دوسرے لوگ خاموش رہے؛ لیکن حضرت علی رضی اللہ عنہ نے — جو اس وقت کم عمر تھے — آپ ﷺ کی دعوت پر لبیک کہا، اس سے معلوم ہوا کہ خدمتِ خلق کسی گروہ تک پہنچنے کا مؤثر ذریعہ ہے اور اپنے جائز اور بہتر مقاصد کے لئے انسانی خدمات کے وسائل کو اختیار کرنا عین سنت نبوی ہے، یہ تقاضۂ دین کے خلاف نہیں۔

آپ ﷺ کے مدینہ ہجرت فرما جانے کے بعد مکہ میں ایک موقع پر سخت قحط آیا، سارے لوگ اس سے پریشان تھے، اہل مکہ کی عداوت کوئی ڈھکی چھپی بات نہ تھی اور اس عداوت کی قیادت ابوسفیان کے ہاتھ میں تھی؛ لیکن اس کے باوجود آپ ﷺ نے ایک خطیر رقم مکہ کے قحط زدہ لوگوں کی مدد کے لئے روانہ فرمائی اور بھیجا بھی ابوسفیان اور صفوان بن اُمیہ کے پاس، جو اس وقت اسلام اور پیغمبر اسلام کی مخالفت میں پیش پیش تھے، ظاہر ہے اس میں انسانی ہمدردی کے ساتھ ساتھ یہ فکر بھی کارفرما تھی کہ اہل مکہ کے دل کی زمین اسلام کے حق میں نرم اور بار آور ہو۔

قرآن مجید نے اسی مقصد کے لئے زکوٰۃ کی ایک مستقل مد ''مؤلفۃ القلوب'' کو بتایا

ہے، یعنی غیر مسلموں کو ترغیب اور نو مسلموں کو دین پر استقامت کے لئے مالی مدد دینا، اسی طرح آپ ﷺ مالِ غنیمت میں سے بھی غیر مسلموں کی گاہے گاہے مدد فرمایا کرتے تھے، حدیث و تفسیر کی کتابوں میں اس طرح کے متعدد واقعات مذکور ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ معروف کی دعوت اور منکرات سے روکنے کے لئے انسانی خدمت بھی بہت بڑا ذریعہ ہے اور بہتر مقاصد کے لئے اس ذریعہ کو استعمال کرنا عین منشاء نبوی ہے، اولاً تو مسلمان خدمت خلق کے کاموں میں بہت پیچھے ہیں اور جو کچھ کر رہے ہیں، ان میں علماء کا حصہ بہت کم ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ خدمتِ خلق کے جو کام مسلمانوں کی جانب سے ہو رہے ہیں، ان کو لوگ محض تجارتی بنیاد پر کرتے ہیں اور کسبِ معاش کا ذریعہ بنائے ہوئے ہیں، اس سے کوئی دینی اور دعوتی فائدہ حاصل نہیں ہو رہا ہے۔

مثلاً موجودہ دور میں خدمت خلق کے دو اہم ذرائع ''علاج اور تعلیم'' ہیں، مسلمانوں کے ہسپتال کم ہیں؛ لیکن جو ہیں، وہ کمرشیل بنیاد پر کام کرتے ہیں، مریض مانوس تو کیا ہوگا، مالی گراں باری اور ہسپتال کے لوگوں کے رویہ کی وجہ سے الٹا اثر لے کر جاتا ہے، ہماری جو تعلیم گاہیں ہیں، ان کا بھی یہی حال ہے، تعلیمی معیار کے پست ہونے کی شکایت عام ہے، ذمہ داروں کا رویہ ایسا ہے کہ غیر مسلم تو کیا بہت سے مسلمان بھی بعض درس گاہوں کے نام سے گھبراتے ہیں اور تجارتی ذہن ان سب سے سوا ہے، یقیناً بعض دواخانے اور درس گاہیں اس سے مستثنیٰ بھی ہیں؛ لیکن ان کی مقدار آٹے میں نمک کی سی ہے، اس کے برخلاف عیسائی مشنریز ان ہی دوا خانوں اور تعلیم گاہوں کو نہایت کامیابی کے ساتھ اپنے مذہب کی تبلیغ و اشاعت کے لئے استعمال کر رہی ہیں اور اس میں انھیں کامیابی بھی حاصل ہو رہی ہے، اس کی ایک بنیادی وجہ یہ ہے کہ عیسائیوں کے یہاں یہ ادارے مذہبی عناصر، مذہبی مقاصد اور تبلیغی تحریک سے مربوط ہیں، اس لئے وہ اپنی خوش اخلاقی اور مروت و رواداری کی وجہ سے لوگوں کے دل بھی جیتتے ہیں، اگر وہ کچھ لوگوں سے پیسے وصول بھی کرتے ہیں تو ایک بہت بڑے غریب طبقہ پر اپنے مقاصد کے لئے انھیں خرچ بھی کرتے ہیں اور اس طرح خدمتِ خلق کے

ان اداروں کو سکہ ڈھالنے کی مشین بنانے کے بجائے افکار واذہان کو اپنے سانچہ میں ڈھالنے کی مشین بنائے ہوئے ہیں۔

اس وقت علماء نے عام طور پر مساجد و مدارس، دارالافتاء ودارالقضاء اور وعظ وتقریر نیز تصنیف و تالیف کی ذمہ داریاں سنبھال رکھی ہیں، یقیناً یہ بہت اہم کام ہیں؛ لیکن عام مسلمانوں اور غیر مسلموں تک رسائی اور ان تک اللہ کے دین کو پہنچانے کے لئے ضروری ہے کہ علماء خدمتِ خلق کے میدان میں اُتریں اور رسول اللہ ﷺ کی اس سنت کو بھی اپنے لئے مشعل راہ بنائیں، اس سے دو بڑے فائدے ہوں گے، ایک یہ ہے کہ ان کاموں کا تجارتی رُخ بننے کے بجائے جذبۂ خدمت کی کیفیت ان میں زیادہ نمایاں ہوگی اور غریب وپسماندہ لوگوں کو اس سے فائدہ اُٹھانے کا موقع مل سکے گا، اس کی مثال دینی مدارس ہیں، آج دینی مدارس جتنے کم اور واجبی اخراجات میں عام لوگوں تک علم کی روشنی پہنچا رہے ہیں، اس کی کوئی مثال نہیں مل سکتی اور وجہ اس کی ظاہر ہے کہ ان اداروں کے خدام خدمتِ دین اور خدمتِ قوم وملت کے جذبہ سے اس کام کو انجام دیتے ہیں۔

دوسرا فائدہ یہ ہوگا کہ یہ ادارے دعوتی اور تبلیغی کام میں معاون بن سکیں گے، نہ صرف عام مسلمانوں بلکہ غیر مسلم بھائیوں میں بھی کام کا موقع بہم پہنچے گا اور اسلام جس جذبہ کے تحت خدمتِ خلق کے کام کی تائید کرتا ہے، اس جذبہ کے مطابق خدمت انسانیت کا کام ہوگا، یہ وقت کی بہت بڑی ضرورت ہے، اور علماء کو اس جانب توجہ کرنا چاہئے، بحمد اللہ کہیں کہیں علماء نے اس سلسلہ میں قدم بڑھائے ہیں، فنی تعلیم کے ادارے قائم کئے ہیں، عصری تعلیم کی درس گاہیں قائم کی ہیں، یا ہسپتال کھولے ہیں، وہاں یہ بات محسوس کی جارہی ہے کہ ان درس گاہوں میں پڑھنے والے طلبہ اپنے فن میں کامیابی حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ اسلامی تہذیب وثقافت کے بھی حامل ہیں، ان کی وضع قطع اور طور وطریق سے مذہبیت نمایاں ہے، ان میں جذبۂ خدمت ہے، نسبتاً خدا ترسی کی کیفیت ہے، جو غیر مسلم طلبہ ان درس گاہوں میں آتے ہیں وہ بھی اسلامی اخلاق کے بارے میں اچھے تصور کے ساتھ واپس ہوتے ہیں، اگر ملک کے

مختلف علاقوں میں علماء خدمتِ خلق کے ادارے قائم کریں، قدرتی حادثات کے مواقع پر ریلیف کے کاموں میں آگے بڑھ چڑھ کر حصہ لیں اور اپنے اس کام میں اسلامی اخلاق، جذبۂ خدمت اور مقصدِ دعوت کو ملحوظ رکھیں، تو اس کے نہایت ہی گہرے اثرات مرتب ہوں گے اور جیسے علماء نے مساجد و مدارس کے واسطہ سے عوام میں رسوخ حاصل کیا ہے، کہ مسلمانوں کی کوئی تحریک ان کی شمولیت کے بغیر کامیابی سے ہمکنار نہیں ہو پاتی، اسی طرح غیر مسلم بھائیوں اور دین سے بے بہرہ مسلمانوں میں بھی وہ رسائی حاصل کرلیں گے۔

علماء انبیاء کے وارث ہیں اور انبیاء اصل میں غیر مسلموں کو اللہ کی طرف بلانے کے لئے آئے تھے، قرآن میں مختلف انبیاء اور ان کی اقوام کے واقعات کو پڑھ جایئے، ہر جگہ اس عہد کے غیر مسلم ہی ان کے اولین مخاطب نظر آتے ہیں، اس میں شبہ نہیں کہ رسول اللہ ﷺ مسجد نبوی کے امام وخطیب بھی تھے، مقدمات کے فیصلے بھی فرماتے تھے، لوگوں کے سوالات پر فتوے بھی دیتے تھے، احکام واخلاق کے درس بھی دیتے تھے، میدانِ کارزار کے سپہ سالار اور مملکت اسلامی کے قائد باتدبیر بھی تھے؛ لیکن آپ ﷺ کا اصل مشن گم گشتہ راہ بندوں کو اللہ کی طرف بلانا تھا، اسی کے لئے آپ ﷺ راتوں میں اپنے مالک کے سامنے دستِ التجا پھیلاتے تھے، اور دن میں بندگانِ خدا کی خوشامد کر کے انھیں اللہ کی طرف بلاتے تھے، مکہ کی تیرہ سالہ زندگی کی ہر ساعت اسی مہم میں گذری، پھر صلح حدیبیہ کے بعد سے وفات تک آپ اسی کام میں لگے رہے، کسی قبیلہ میں خود جاتے، کہیں اپنے رفقاء کو بھیجتے اور بہت سے قبائل وہ تھے جنھوں نے خود اپنے وفود خدمت اقدس میں بھیجے، فتح مکہ کے بعد ان وفود کی ایسی کثرت ہوئی کہ سن نو ہجری کا نام ہی ''عام الوفود'' قرار پایا۔

پس انبیاء کی میراث میں یقیناً غیر مسلم بھائیوں تک دعوت حق پہنچانا بھی شامل ہے، اسلام میں ایسی کوئی تقسیم نہیں کہ جب تک مسلمان پوری طرح نیک وصالح نہ بن جائیں، اس وقت تک غیر مسلموں کو اسلام کی دعوت نہ دی جائے، یہ بات نہ قرآن میں ہے نہ حدیث میں، نہ صحابہ وسلف صالحین نے اس سوچ کے ساتھ کبھی کام کیا، غور کیجئے! کہ اُمتِ مسلمہ میں فرق

باطلہ کا ظہور حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے آخری عہد میں شروع ہوا اور عہد عباسی تک یہ فتنہ بڑھتا ہی گیا، نیز فلاسفہ یونان کی کتابوں کے عربی زبان میں منتقل کئے جانے اور بہت سے مجوسیوں کے نیم دلی کے ساتھ اسلام میں داخل ہونے کی وجہ سے الحاد و دہریت کی ایک نئی بلا مسلمانوں میں داخل ہونی شروع ہوئی؛ لیکن اسی عہد میں مسلمانوں نے دور دراز علاقوں تک اسلام کی دعوت پہنچائی، انھوں نے یہ نہیں سوچا کہ جب تک موجودہ مسلمانوں کی پوری طرح اصلاح نہ ہو جائے اور فرق باطلہ کا استیصال نہ کر لیا جائے، اگلے محاذ پر توجہ نہ دی جائے؛ بلکہ انھوں نے ایک ساتھ دونوں کوششیں جاری رکھیں۔

گذشتہ دو تین صدیوں پہلے تک ہر عہد میں ایک نیا خون اس اُمت کا جزء بنتا رہا ہے، جس نے ایک نئے حوصلہ اور جوش عمل کے ساتھ اسلام کی دعوت کو آگے بڑھایا اور اس کے پیغام کو اونچا اُٹھایا، جیسے جسم کو نئے اور تازہ خون کی ضرورت ہوتی ہے، اسی طرح قوموں اور اُمتوں کو بھی تازہ دم خون کی ضرورت ہوتی ہے، جس میں بھرپور ولولہ، محکم عزم، جان پر کھیل کر اپنے مقصد کو حاصل کرنے اور طوفانوں سے گذر کر ساحل مراد تک پہنچنے کا مصمم ارادہ موجود ہوتا ہے، علماء کے لئے ضروری ہے کہ وہ جس سماج میں رہتے ہوں، وہاں برادرانِ وطن سے قربت پیدا کریں، اپنے پروگراموں میں انھیں مدعو کریں اور خود ان کے پروگراموں میں جائیں، ایسے مواقع پیدا کریں جن میں ان کو اپنی بات سمجھانے اور کہنے سننے کا موقع ملے، اس سے غلط فہمیاں دور ہوں گی، فاصلے کم ہوں گے، دعوتی کاز کو تقویت حاصل ہوگی اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ ہم ایک فریضۂ منصبی کو ادا کر پائیں گے، دعوت کے کام کو قرآن وحدیث اور سیرت سے آگاہ علماء جس بہتر طریقہ پر انجام دے سکتے ہیں، کوئی طبقہ انجام نہیں دے سکتا۔

فضلاءِ دینی مدارس کی ذمہ داریاں

حضرت ابوالدرداءؓ نے رسول اللہ ﷺ سے روایت کیا ہے :

جوطلب علم کی راہ میں چلے، اللہ تعالیٰ اسے جنت کی راہ فراہم کرتے ہیں، طالبِ علم کی خوشنودی کے لئے فرشتے اپنے پر بچھاتے ہیں، عالم کے لئے زمین وآسمان کی تمام چیزیں دُعاء مغفرت کرتی ہیں، یہاں تک کہ پانی کی آغوش میں رہنے والی مچھلیاں بھی ، عالم کی فضیلت عبادات گذار شخص پر ایسی ہی ہے جیسے چودھویں شب کے چاند کی فضیلت تمام ستاروں پر، علماء انبیاء کے وارث ہیں، کہ انبیاء نے درہم ودینار کی میراث نہیں چھوڑی ؛ بلکہ علم کی میراث چھوڑی ہے، جو علم سے سرفراز ہوا، اس نے (انبیاء کی میراث سے) بڑا حصہ پایا۔ (ترمذی، حدیث نمبر: ۲۶۸۲)

اس ارشاد نبوی ﷺ میں علم دین کے حاملین اور طالبین کی بڑی فضیلت بیان کی گئی ہے، یہاں تک کہ فرمایا گیا کہ کائنات کی تمام چیزیں ان کے لئے دعاگو ہوتی ہیں، عبادت وبندگی مشقت طلب عمل ہے اور ہر مذہب میں عبادتوں اور ریاضتوں کو خاص اہمیت حاصل رہی ہے ؛ لیکن عالم کو نمایاں طور پر عبادت گذار سے افضل قرار دیا گیا اور کہا گیا کہ اگر عابد ستارہ ہے تو عالم چودہویں کا چاند، پھر علماء کو میراثِ نبوت کا حامل قرار دیا گیا، اس سے بڑھ کر کیا فضیلت ہوگی ؟ لیکن اگر اس حدیث پر گہرائی سے غور کیا جائے اور جن الفاظ وکلمات سے عالم کی فضیلت بیان کی گئی ہے، اس کے دائرہ کو ملحوظ رکھا جائے ، تو اس حدیث سے عمل کا پیغام بھی ملتا ہے اور صاف معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ نے نہایت خوش اُسلوبی اور حکمت کے ساتھ

مدح وستائش کے پیرایہ میں علماء کو ان کی ذمہ داریوں کی طرف متوجہ فرمایا ہے۔

چاند کا کام کیا ہے؟ اندھیروں کو روشن کرنا، راہ گیروں کے لئے راستہ کی پہچان کو آسان کرنا، راہ بھٹکے ہوؤں کو گم گشتہ راہی سے بچانا اور اپنا سینہ جلا کر ایک عالَم کو روشنی پہنچانا، اس سے صاف معلوم ہوا کہ عالم کا یہ فریضۂ منصبی ہے کہ وہ اُمت بلکہ پوری انسانیت کے لئے رہنمائی کا فریضہ انجام دے، وہ اپنے ماحول اور سماج کے لئے قبلہ نما کی حیثیت رکھتا ہے، جس کے ذریعہ لوگ اپنے کعبۂ مقصود کو جان سکیں، اسی لئے بہ مقابلہ عابد کے اس کی فضیلت زیادہ ہے؛ کیوں کہ عبادت کرنے والے کے عمل کا جو کچھ نفع ہے وہ اس کی ذات تک محدود ہوتا ہے اور عالم ایک چاند کی طرح ہے جس کی روشنی سے پوری دنیا مستفید ہوتی ہے۔

جو لوگ علم دین حاصل کرتے ہیں، وہ دراصل حق کے چوکیدار ہیں، ان کا کام صرف اس قدر نہیں کہ کسی مدرسہ میں بچوں کو تعلیم دیں، کسی مسجد میں امامت کرلیں اور سمجھیں کہ ہماری ذمہ داری پوری ہوگئی، یقیناً بچوں کی تعلیم اور مسجد کی امامت بھی بڑا کام ہے اور ان ہی وسائل کے صدقہ بہ ظاہر اس ملک میں ہر چہار طرف سے آتش عناد سلگنے کے باوجود اسلام کا شجرۂ طوبیٰ سرسبز وشاداب صورت میں موجود ہے؛ لیکن علماء کی ذمہ داریاں اس سے زیادہ ہیں، جو لوگ مدارس میں نہیں آتے، ان میں طلبِ علم کی پیاس کیوں کر پیدا ہوگی؟ جو لوگ بارگاہِ خداوندی میں سجدہ کی لذت سے محروم ہوں، انھیں کس طرح خدا کی چوکھٹ تک لایا جائے گا؟ جن کی زندگیوں میں حلال وحرام کی سرحدیں ٹوٹ چکی ہیں، یہاں تک کہ شعائر اسلام کے تعظیم واحترام کی توفیق سے بھی وہ محروم وتہی دامن ہیں، ان کے ایمان کی سرد انگیٹھیوں کو کیوں کر سلگایا جائے گا؟ جو مسلمان انسانی حقوق کے تقاضوں سے بے گانہ ہوتا جارہا ہے اور ایثار کی جگہ خود غرضی، اُخوت ومحبت کی جگہ نفرت وعداوت، عدل کے بجائے ظلم، تواضع وانکسار کے بجائے کبر ونخوت، اسلامی بھائی چارہ کے بجائے طرح طرح کے تعصّبات اور شرافت وحیاء کی جگہ تہذیب وثقافت کے نام پر بے حیائی نے لے لی ہے، آخر ان سماجی اور روحانی بیماریوں کا علاج کون کرے گا؟ ظاہر ہے کہ یہ سب کچھ علماء کا منصبی فریضہ ہے، رسول اللہ ﷺ نے اس حقیقت کو

ایک اور موقع پر کس خوبصورتی سے بیان فرمایا ہے، حضرت انس رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :

> زمین میں علماء کی مثال ایسی ہی ہے جیسے آسمان میں ستاروں کی، جن سے خشکی اور تری کی تاریکیوں میں راستے کی رہنمائی حاصل کی جاتی ہے، پھر اگر ستارے ڈوب جائیں تو قریب ہے کہ راہ چلنے والے راستہ سے بھٹک جائیں۔ (مسند احمد، حدیث نمبر: ۱۲۱۸۹)

یہ تعبیر کتنی بلیغ ہے! کہ جیسے ستارے رات کی تاریکی میں سفر کرنے والے راہ رووں کے لئے راستہ بتانے کا کام کرتے ہیں، اسی طرح جو لوگ بے دینی، بے عملی اور فسادِ عقیدہ کی تاریکیوں میں بھٹک رہے ہوں، انھیں منزلِ مقصود تک جانے والا راستہ دکھانا علماء کی ذمہ داری اور ان کا منصبی فریضہ ہے، موجودہ حالات میں جب کہ اسلام پر چومکھا حملہ ہو رہا ہے اور بیک وقت کئی جہتوں سے دین حق پر یورشیں کی جا رہی ہیں، علماء اور دینی مدارس کے فضلاء کے لئے اس حقیقت کو جان لینا ضروری ہے کہ ان کی حیثیت کسی اسکول اور جز وقتی آفس کے ملازم کی نہیں؛ بلکہ ان کی حیثیت سرحد پر مقرر حفاظتی فوجیوں کی ہے، ایک ایسے سپاہی کی ہے جو صرف خدا سے اجر پانے کے لئے کام کرتا ہے اور جو اپنی سرحد کی ایک ایک انچ کی حفاظت کے لئے خونِ جگر کا تحفہ پیش کرنے کو تیار رہتا ہے، اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اہل مصر سے کہا تھا کہ تم مسلسل سرحد کی حفاظت پر مامور رہو، گویا جنگ کی حالت میں ہو، حالاں کہ اس وقت مصر کی سرحدوں کو کوئی قابل ذکر خطرہ درپیش نہیں تھا، یہ کون سی جنگ تھی؟ یہ جنگ تہذیب وتمدن کی جنگ تھی، یہ جنگ مسلمانوں کو شعائر اسلام پر باقی رکھنے کی جنگ تھی اور یہ جنگ ان ہزاروں لوگوں کے ایمان وعقیدہ کی حفاظت کی جنگ تھی، جو ابھی دامن اسلام میں آئے تھے۔

یہی جنگ ہے جو اس وقت مسلمانوں کو اس ملک میں لڑنی ہے اور اس کی کمان علماء کو اپنے ہاتھ میں لینی ہے، یہ جنگ تیغ وشمشیر اور توپ وتفنگ کی نہیں؛ بلکہ دعوت و اصلاح

اور اُمت کے مسائل کے بارے میں فکرمندی اور دردمندی کی ہے، جو لوگ انبیاء کے وارث بنیں، ان کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس درد کی میراث میں بھی حصہ دار ہوں، کہ یہ انبیاء کی خصوصیت رہی ہے، انسانیت کے بے راہ لوگوں کے لئے ان کی آنکھیں رات رات بھر خدا کے سامنے اُبلتی رہتی تھیں، ان کا سوز دروں لوہے جیسے دلوں کو بھی پگھلا کر رکھ دیتا تھا اور جیسے کوئی مچھلی پانی کے لئے اور کوئی مریض جاں بہ لب صحت وشفاء کے لئے بے چین ہوتا ہے، اسی طرح وہ بے چین ہوتے تھے کہ کیوں کر محرومانِ ہدایت کو ایمان کا آبِ حیات پلا دیں اور کس طرح مریضانِ روح کو صحت وشفا سے شاد کام کریں! یہی کسک جب تک کلیجوں کو بے سکون نہیں کرے، ممکن نہیں کہ عالم اس فریضہ کو انجام دے سکے جو وارث نبوی ﷺ کی حیثیت سے اس کے ذمہ آتی ہے، اس لئے اس بات کی ضرورت ہے کہ علماء اور مشائخ موجودہ حالات میں اس حقیقت کو سمجھ لیں، کہ درس گاہوں کی چھتوں اور خانقاہوں کی خلوت گاہوں میں بیٹھ کر مسلمانوں کے ایمان کی حفاظت نہیں ہوسکتی، اگر علماء، اُمت کے دوسرے مسائل سے پہلوتہی کرنے لگیں تو یہ ایسا خسارہ ہوگا جس کی تلافی ممکن نہیں ہوگی۔

یہی ہندوستان میں علماء کا طریقۂ کار رہا ہے، سید احمد شہیدؒ اور شاہ اسماعیل شہیدؒ کے کارواں کو دیکھئے کہ کلکتہ کے ساحل سمندر سے سرحد کے میدانِ کارزار تک کہاں کہاں اس کے نقش پا ثبت ہیں؟ مولانا محمد قاسم نانوتویؒ دیوبند کی درس گاہ میں بھی ہیں، شاملی کے کارزار میں بھی اور میلۂ خدا شناسی میں حق کی ترجمانی کا حق بھی ادا کر رہے ہیں، مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ عیسائیت کا تعارف کرنے کے لئے آگرہ سے حجاز ومصر اور ترکی تک پہنچتے ہیں، مولانا محمد علی مونگیریؒ اپنے شیخ کے حکم پر کانپور کے راحت کدہ کو چھوڑ کر مونگیر پہنچتے ہیں اور فتنۂ قادیانیت سے ایک بڑے علاقہ کے مسلمان کی حفاظت کرتے ہیں، مولانا انور شاہ کشمیریؒ ایک بلند پایہ محقق اور ایسے محدث ہیں کہ علماء کے درمیان ان کے علم کا طوطی بولتا ہے، لیکن حضور ﷺ کی ختم نبوت کی حفاظت کے لئے کہاں کہاں کی خاک چھانتے ہیں؟ اور اپنے خلوت کدہ کو خیر باد کہہ کر فتنۂ قادیانیت کی عین جائے پیدائش پنجاب پہنچ کر اس نامراد فتنہ کی سرکوبی فرماتے ہیں، مولانا ابو

المحاسن محمد سجادؒ مدرسہ سبحانیہ الٰہ آباد کے مقبول عام وخاص مدرس تھے، لیکن اُمت کی حفاظت اور ایمان کی تڑپ نے بہار کے چھوٹے چھوٹے گاؤں کی آبلہ پائی پر مجبور کیا، شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ استاذ الاساتذہ ہیں، لیکن اپنے گوشۂ عافیت کو چھوڑ کر کہاں کہاں کی صحرا نوردی کی؟ یہاں تک کہ جرم بے گناہی میں مالٹا کے قید خانہ تک پہنچے۔

پھر ذرا اور اوپر نگاہ اُٹھا کر دیکھئے، حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ، خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ، خواجہ نظام الدین اولیاءؒ، حضرت شرف الدین یحییٰ منیریؒ اور ملک کے کونہ کونہ میں آسودۂ خواب صوفیاء کی تاریخ پڑھئے، یہ سب اپنے عہد کی مشہور ومقبول درس گاہوں کے تربیت یافتہ تھے، وہ کہاں پیدا ہوئے؟ کہاں سے فیض حاصل کیا؟ کہاں کہاں جا کر خیمہ زن ہوئے؟ اور کہاں خود ان کے ذریعہ چشمۂ فیض جاری ہوا؟ اسی شہر حیدرآباد کو جن بزرگوں کی نسبت سے عزت حاصل ہے، ان میں ایک بابا شرف الدین سہروردیؒ ہیں، جو عراق میں پیدا ہوئے اور کتنے ہی دشت و بیابان سے گذر کر دکن میں اولین داعیٔ اسلام کی حیثیت سے فروکش ہوئے اور ۷۸۵ھ میں یہیں وفات پائی، اگر اس نقطۂ نظر سے صوفیاء کے احوال کا مطالعہ کیا جائے، تو اسلام کی تاریخ دعوت کا ایک نیا پہلو سامنے آتا ہے اور یہ علماء کے لئے متاعِ عبرت ہے۔

سلف صالحین میں کم ہی ایسے لوگ ملیں گے، کہ جس مٹی میں وہ پیدا ہوئے ہوں اسی مٹی کو اپنی ابدی خواب گاہ بھی بنایا ہو، غرض علماء زندگی کے تمام مسائل میں اُمت کے رہنما ہیں، انھیں اپنے مقام کا ادراک کرنا ہوگا، جب ہی وہ حالات کے بھنور سے اس سفینہ کو ساحل مراد تک پہنچا سکیں گے، ایمان وعقیدہ کی حفاظت کا مسئلہ ہو، عبادات اور شعائر اسلامی میں کوتاہی کی صورت ہو، سماجی زندگی میں حق تلفی اور ظلم وناانصافی کی بات ہو، مسلمانوں کی سیاسی اور سماجی زندگی کی مہمات ہوں، ہر محاذ پر انھیں ایک مخلص سپاہی کی طرح آگے بڑھنا ہوگا، اس کے بغیر وہ بدلتے ہوئے حالات میں اس اُمت کی رہنمائی کا فریضہ ادا نہیں کر سکتے اور اگر علماء نے اس کو نظر انداز کیا، تو پھر کوئی طبقہ نہیں جو اس ذمہ داری کو اس کے حدود وآداب اور تقاضوں کے ساتھ ادا کر سکے۔

❁❁❁

دینی مدارس کا نصابِ تعلیم — ایک مخلصانہ مشورہ!

دینی مدارس اشاعت علم اور تربیت اخلاق کا جو کام کررہے ہیں، وہ کسی عام سے عام آدمی کی نظر سے بھی پوشیدہ نہیں، برصغیر میں مدارس کا جو منفرد نظام ہے، اس نے سماج کے غریب طبقات کو اونچا اُٹھانے میں نہایت اہم کردار ادا کیا ہے، اسلام کے تحفظ، مسلمانوں کے عقیدہ وعمل کی اصلاح اور دور دراز کے دیہاتوں تک کتاب وسنت کی روشنی پہنچانے میں ان درس گاہوں کا جو عظیم رول ہے، وہ اسلامی تاریخ کا ایک روشن باب ہے اور گذشتہ ڈیڑھ سو سال سے مغربی استعمار اور مغربی ثقافت کے بڑھتے ہوئے اثرات کے باوجود نہ صرف برصغیر؛ بلکہ پوری دنیا میں مسلمانوں کے اندر اسلامی روح کو بیدار رکھنے بلکہ اس کو مزید طاقتور بنانے کا سہرا ''نظام مدارس'' ہی کے سر ہے۔

لیکن ظاہر ہے کہ ''ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں'' کوئی بھی نظام ہو، وقت اور حالات کے لحاظ سے، اس میں جزوی تبدیلی ضروری ہوجاتی ہے، پھر ہر عہد میں جو نئے وسائل پیدا ہوتے ہیں، ان کو یکسر نظر انداز نہیں کیا جاسکتا، اس پہلو سے بھی مدارس کے ذمہ داروں کو غور وفکر کی ضرورت ہے اور یہ تبدیلی وقتاً فوقتاً ہوتی بھی رہی ہے، مثلاً اس وقت زیادہ تر مدارس میں ملا نظام الدین سہالوی کا نصاب جاری وساری ہے اور انہی کی نسبت سے یہ ''درسِ نظامی'' کہلاتا ہے، اس وقت درس نظامی کا سب سے نمائندہ ادارہ دارالعلوم دیوبند کو خیال کیا جاتا ہے، خود دارالعلوم دیوبند نے مدارس کے نظام پر جو گہرے اثرات ڈالے ہیں؛ بلکہ ایک نئے نظام کو وجود بخشا ہے، وہ ایک ایسی حقیقت ہے کہ کوئی حقیقت پسند شخص اس سے انکار نہیں کرسکتا، آج نہ صرف ایشیا بلکہ افریقہ ویورپ اور امریکہ تک دیوبند کے طرز پر مدارس کا جال سا بچھا ہوا ہے اور انھیں اسلام کی حفاظت واشاعت میں ایک نمایاں مقام حاصل رہا ہے۔

لیکن کیا دیوبند کا نظام تعلیم وہی ہے جو ملا نظام الدین سہالوی کا تھا؟ حقیقت یہ ہے کہ دیوبند کے نصاب پر ملا نظام الدین سے زیادہ شاہ ولی اللہؒ دہلوی کی چھاپ ہے، اصل درس نظامی میں زیادہ بلکہ اغلب ترین حصہ معقولات کی کتابوں کا تھا، حدیث میں صرف مشارق الانوار اور تفسیر میں صرف مدارک التنزیل پڑھائی جاتی تھی، فقہ کی کتابوں میں قدوری اور شرح وقایہ؛ لیکن اب دیوبند کے نصاب میں صرف دورۂ حدیث میں حدیث کی ۹/ کتابیں شامل نصاب ہیں، ان کے علاوہ دورہ سے پہلے مشکوٰۃ شریف اور ریاض الصالحین یا اس سے مماثل کوئی اور کتاب نصاب میں شامل ہے اور بعض درس گاہوں میں آثار السنن بھی پڑھائی جاتی ہے، اس طرح صرف حدیث کی ۱۴ کتابیں ہوگئیں، فقہ میں ہدایہ کی ۴/ جلدیں، شرح وقایہ، کنز الدقائق، قدوری، نور الایضاح یا اس کے مماثل کوئی اور کتاب داخل نصاب ہے، تفسیر میں متن قرآن کا مکمل ترجمہ مع تفسیر، نیز جلالین مکمل اور بعض مدارس میں بیضاوی کے اسباق بھی ہوتے ہیں اور مجموعی طور پر تین چار سالوں میں پانچ تا سات گھنٹیاں تفسیر کے مضمون کے لئے دی جاتی ہیں، اس طرح یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ دیوبند کے نصاب پر ذوق ولی اللہی کی چھاپ غالب ہے!

اصل درس نظامی میں بھی معقولات کی بعض ایسی کتابیں —— جن کے مصنفین ملا سہالوی کے بعد کے ہیں —— شامل تھیں، اس لئے زمانہ اور حالات کے لحاظ سے نصاب تعلیم میں جزوی طور پر کمی بیشی کوئی نامناسب بات نہیں ہے، مدارس کے موجودہ نصاب کے بارے میں بعض حضرات یہ خیال رکھتے ہیں کہ دینی مدارس میں مکمل عصری تعلیم ہونی چاہئے، یعنی ایک شخص عالم بھی ہو اور ڈاکٹر بھی، عالم بھی ہو اور انجینئر بھی، عالم بھی ہو اور میکانک بھی، وغیرہ وغیرہ ، یہ ایک غیر فطری اور غیر عملی خواہش ہے، یہ ایسے ہی ہے جیسے کسی درخت سے چاہا جائے وہ آم کا پھل بھی دے اور سیب کا بھی، اب یہی دیکھئے کہ کسی ڈاکٹر سے آج تک یہ خواہش نہیں کی گئی کہ وہ انجینئر بھی ہو اور نہ کسی انجینئر پر اعتراض کیا جاتا ہے کہ وہ قانون داں کیوں نہیں؟ اس لئے کہ اب علوم وفنون کی شاخ در شاخ ہوگئی ہے اور ایک شخص کے لئے بیک وقت ایک سے زیادہ

علمی شعبوں کی مکمل تحصیل عادتاً ممکن نہیں، یہ بات کہ ایک طالب علم عربی زبان میں بھی استعداد حاصل کر لے اور انگریزی زبان پر بھی اس کو بڑی حد تک دسترس ہو جائے، عمومی طور پر دشوار ہے؛ اس لئے یہ ایسی باتیں ہیں جو کانوں کو یقیناً بھلی لگتی ہیں اور بادی النظر میں بہت اچھی معلوم ہوتی ہیں؛ لیکن یہ ہیں غیر عملی، جن اداروں میں اس کا تجربہ کیا گیا ہے، وہاں لوگوں نے محسوس کیا ہے کہ اس طرح کا نصاب تعلیم دونوں طرف آدمی کو ادھورا رکھتا ہے، اس سے نہ تو طالب علم اچھا عالم دین بن سکتا ہے اور نہ دوسرے علوم میں کوئی مفید اور کام کا آدمی، ہاں یہ بات ممکن ہے کہ کسی عالم کو آپ موٹر میکانک یا الکٹریشن بنا دیں؛ لیکن سوچئے کہ اس کا حاصل کیا ہے؟ اگر اس کا مقصد یہ ہے کہ وہ ان پیشوں سے ذریعۂ معاش حاصل کر لے تو یقیناً یہ مقصد حاصل ہو سکتا ہے۔

لیکن جو لوگ ان پیشوں میں لگ جاتے ہیں، وہ بہ حیثیت عالم دین سماج میں اپنا کردار ادا نہیں کر پاتے، اس کی بہت سی مثالیں ہم لوگوں کی نگاہ میں ہیں، اس لئے یہ پیشے علماء کے لئے موزوں نہیں اور سماج میں ان کے کام کرنے کے لئے جو وقار مطلوب ہے، اس سے ہم آہنگ بھی نہیں، اس سے بہتر تو یہ ہے کہ قوم کے جو بچے ان پیشوں میں تربیت پا رہے ہوں، ان کے لئے ضروری حد تک دینی تعلیم کا نظم کر دیا جائے تا کہ وہ اپنا کام کرتے ہوئے بہتر مسلمان ثابت ہوں، محض دین دار میکانک تیار کرنے کے لئے سات آٹھ سال ان کی تعلیم کے لئے وقت لینا اور ان کی پرورش پر قوم کی کثیر اعانت کو خرچ کرنا ایک بے معنی بات ہوگی، نصابِ تعلیم میں ایسی تبدیلی مدارس کے کردار کو ختم کر کے رکھ دے گی؛ چنانچہ برصغیر کے نہج سے ہٹ کر بعض ممالک، جیسے مصر، شام، عراق اور ترکی وغیرہ میں دینی تعلیم کا جو نظام ہے، وہاں اس کیفیت کو واضح طور پر محسوس کیا جا سکتا ہے، سب سے افسوس ناک بات یہ ہے کہ جیسے آج کے سماج میں ایک ڈاکٹر کو خدمت خلق کے جذبہ سے زیادہ کسب زر کی خواہش بے چین رکھتی ہے، اسی طرح اُن علماء کے اندر دینی حمیت، حفاظت دین کا جذبۂ ایمانی غیرت اور اسلامی شعائر سے محبت کا عنصر بہت کم نظر آتا ہے، وہ اس لئے پڑھاتے ہیں کہ یہ ان کا ذریعہ معاش ہے، وہ

اس لئے تصنیف وتالیف کا کام کرتے ہیں کہ اس سے ان کے معاشی واخلاقی مفادات متعلق ہیں، ورنہ عوام سے ان کا کوئی ربط ہے اور نہ عوام میں پھیلی ہوئی عقیدہ وعمل کی کمزوریوں کے بارے میں کوئی گہری فکر۔

برصغیر میں مدارس کا جو تعلیمی نظام ہے، وہ صرف دماغ ہی کو روشنی فراہم نہیں کرتا؛ بلکہ فکر کی ارجمندی کے ساتھ ساتھ دل کی دردمندی بھی عطا کرتا ہے، یہ اس تعلیم کے ساتھ علاقہ کے عوام پر بھی اپنی گرفت رکھتا ہے، ان کے عقیدہ وعمل کے اصلاح کے لئے جگہ جگہ جا کر بیانات کرتا ہے، کہیں مسلمان بچے تعلیم حاصل نہیں کررہے ہیں، تو وہاں قیام مکاتب کی تحریک بیدار کرتا ہے، کہیں دبے پاؤں کوئی مخالف اسلام فتنہ سر اُٹھارہا ہے، تو اس کی سرکوبی کے لئے سرگرم عمل ہوجاتا ہے، یہ اسی نظام تعلیم کا اثر ہے۔

لیکن علماء کے اپنے عہد کے تقاضوں سے باخبر رہنے کے لئے مدارس کو اپنے نظام میں کچھ تبدیلیاں لانے کی بھی ضرورت ہے، اس میں سب سے اہم مسئلہ زبان کا ہے، انگریزی زبان اس وقت عالمی رابطہ کی زبان ہے، یہ زبان نہ صرف غیر مسلموں تک اسلام کی دعوت پہنچانے کے لئے ضروری ہے؛ بلکہ خود مسلمانوں کی نئی نسل بھی تیزی سے اُردو کی گرفت سے باہر ہوتی جارہی ہے، اس لئے ہمیں ایک طرف اُردو زبان کی ترویج کی کوشش کرنی چاہے اور دوسری طرف علماء کو انگریزی زبان سے آراستہ کرنا چاہئے، یہ اس لئے بھی ضروری ہے کہ آج اسلام کے خلاف جو کچھ لکھا جارہا ہے اور علمی وفکری جہت سے دین حق پر جو یلغار ہورہی ہے، وہ زیادہ تر اسی زبان میں ہے، اگر علماء اس زبان کے سمجھنے اور اسی میں اپنا مافی الضمیر ادا کرنے کے لائق نہ ہوسکے، تو وہ اسلام کی حفاظت واشاعت کا فریضہ صحیح طور پر انجام نہیں دے سکتے، یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کو نظر انداز کرنا چڑھتے سورج سے آنکھیں موندنے کے مترادف ہوگا، ایک صاحبِ علم نے لکھا ہے کہ انگریزی زبان سے ناواقفیت کی وجہ سے علماء اس صدی میں مقام احترام پر تو فائز ہوئے لیکن مقام قیادت پر فائز نہیں ہوسکے، میرا خیال ہے کہ یہ بات بڑی حد تک درست ہے!

زبان محض ایک ذریعۂ اظہار ہے، اس کا صحیح وغلط اور مناسب ونامناسب استعمال مفید یا مضر ہوا کرتا ہے، کوئی بھی زبان اسلام کی نگاہ میں بذات خود ناپسندیدہ نہیں، اس لئے انگریزی زبان پر دسترس آج وقت کی اہم ضرورت ہے، مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے دیوبند کے ابتدائی نصابِ تعلیم میں سنسکرت کو بھی داخل نصاب کیا تھا، یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ علماء نے کبھی بھی انگریزی زبان کی مخالفت نہیں کی، سرسید احمد خاں مرحوم کے بعض افکار جمہورِ اُمت کے خلاف تھے اور وہ انگریزی زبان کے ساتھ ساتھ انگریزی تہذیب وثقافت کی طرف بھی جھکاؤ رکھتے تھے، علماء نے اس میلان ورجحان سے اختلاف کیا تھا، موجودہ حالات میں خاص طور پر انگریزی زبان کی ایک خاص اہمیت ہوگئی ہے جس سے کسی بھی طرح صرفِ نظر نہیں کیا جاسکتا۔

انگریزی کے علاوہ معاشیات، سیاسیات کی مبادی، تاریخ، جغرافیہ، اور حساب وغیرہ کے بارے میں بھی ضروری حد تک آگہی علماء کے لئے ضروری ہے، اس لئے کہ بہت سے شرعی مسائل اور دینی حقائق انھیں مضامین سے متعلق ہیں، آج کے فقہاء اور ارباب افتاء کو خاص طور پر نظام معیشت کے بارے میں جاننا ناگزیر ہے، جب ہی وہ اپنے عہد کے مسائل کے بارے میں صحیح رائے دے سکتے ہیں۔

ان مضامین کے لئے جگہ نکالنے کی دو صورتیں ہیں، ایک صورت تو یہ ہے کہ موجودہ نظام تعلیم میں چھ کے بجائے سات گھنٹیاں کردی جائیں اور ایک گھنٹی ان مضامین کے لئے رکھی جائے اور اس کے لئے کچھ اور گنجائش پیدا کرنے کی غرض سے منطق اور فلسفہ کی قدیم کتابوں میں کچھ کمی کی جاسکتی ہے، اس لئے کہ منطق میں مرقات، شرح تہذیب، قطبی اور سلم العلوم اکثر مدارس میں پڑھائی جاتی ہیں، گویا چار سال یہ مضمون پڑھائے جاتے ہیں، اسی طرح قدیم فلسفہ میں ہدایۃ الحکمۃ، ہدیہ سعیدیہ اور میبذی کے اسباق ہوتے ہیں، ان تین کتابوں کے لئے دو سال میں ایک ایک گھنٹی دی جاتی ہے، اب اگر منطق کے لئے دو گھنٹی اور قدیم فلسفہ کے لئے ایک گھنٹی پر اکتفا کردیا جائے، تو مزید تین گھنٹیاں نکل آتی ہیں، اسی طرح عربی کی ابتدائی جماعتوں میں بعض اسباق جو روزانہ ہوا کرتے ہیں، اگر ہفتہ میں چار دن ہوں تب بھی کتاب

پوری ہوسکتی ہے، اس طرح ہفتہ میں دو دن کا وقت خالی کیا جاسکتا ہے ـــــ اگر ہم اس طرح وقت نکالیں تو معمولی تبدیلی کے ساتھ ان ضروری مضامین کے لئے وقت فراہم ہوسکتا ہے۔

دوسری اور اس سے اعلیٰ صورت یہ ہے کہ میٹرک تک تعلیم ہر طالب علم کو دی جائے ؛ البتہ اس میں شروع سے دو تین گھنٹیاں اسلامیات کے لئے لے لی جائیں اور میٹرک کے بعد جیسے پانچ سال میں انٹر اور گریجویشن ہوتا ہے، اسی طرح پانچ سال میں عالم کورس کو مکمل کیا جائے، اگر میٹرک تک عربی نحو وصرف، ادب وغیرہ کی مبادیات طلبہ پڑھ چکے ہوں تو اس پانچ سال میں جو عربی واسلامی علوم ہی کے لئے مخصوص ہوں، بہ سہولت درس نظامی کی تکمیل کر سکتے ہیں، اور چوں کہ یہ ساری تعلیم مدرسہ کے ماحول میں ہوگی، اس لئے اسلامی خطوط پر ان کے ذہن ومزاج کی نشوونما ہوتی رہے گی، مدارس کا موجودہ نصاب نوسالہ عالم کورس اور چار تا پانچ سالہ شعبہ ابتدائی پر مشتمل ہے، گویا تیرہ چودہ سال کا عرصہ اس کورس کی تکمیل پر لگتا ہے اور اگر میٹرک کے ساتھ عالم کورس ہو تو اس کی مدتِ تعلیم ۱۵ سال ہوجائے گی، یعنی ۲۰/۱۹ سال کے عرصہ میں لڑکے میٹرک کرنے کے ساتھ ساتھ عالم کورس مکمل کرلیں گے، گویا یہ اسلامی علوم میں گریجویشن کرنے کے مماثل ہوگا، اب جو طلبہ باصلاحیت ہوں وہ تخصص اور تحقیق کے شعبوں میں پڑھ سکتے ہیں، یہ دوسری صورت زیادہ بہتر ہے اور اس طرح جدید وقدیم کے درمیان جو فاصلہ محسوس کیا جاتا ہے، اسے بہتر طریقہ پر پُر کیا جاسکے گا۔

ذمہ داران مدارس سے دردمندانہ درخواست ہے کہ وہ اس سلسلہ میں غور کریں اور موجودہ حالات کے تناظر میں مدارس کے موجودہ نصابِ تعلیم کا جائزہ لیں ؛ کیوں کہ تعلیم کا مقصد ایسے افراد کی تیاری ہے جو اپنے عہد میں اسلام کی حفاظت واشاعت کی خدمت انجام دے سکیں، مدارس بر قول مولانا علی میاںؒ میوزیم اور عجائب خانہ نہیں ہیں، جہاں مداحت کی حامل از کار رفتہ یادگاریں محفوظ کی جاتی ہیں، اگر اس نقطۂ نظر سے نصاب میں کچھ مضامین بڑھائے اور کچھ گھٹائے جائیں، تو یہ عین اس مقصد ومزاج کے مطابق ہے جس کے لئے مدارس کا قیام عمل میں آیا ہے، اسی لئے تو منطق وفلسفہ کو علماء نے داخل نصاب کیا تھا، یہ ایسے فنون نہیں ہیں جن کا

اسلام سے براہ راست رابطہ ہو؛ بلکہ ان کے بعض نظریات تو اسلامی نقطۂ نظر سے متعارض ہیں، اس کے باوجود ان علوم کو شریک نصاب رکھا گیا؛ کیوں کہ ایک زمانہ میں ان ہی علوم کے ذریعہ اسلام کے خلاف اعتراضات کئے جاتے تھے، آج کے دور میں انگریزی زبان اور بعض عصری مضامین کی ضرورت اس سے کہیں زیادہ ہے۔

دینی مدارس میں فقہ اسلامی کا نصاب*

اسلامی تعلیمات کے دو سرچشمے ہیں: کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ — قرآن مجید میں اصل بحث اعتقاد اور اساسیاتِ دین سے کی گئی ہے، زندگی کے عملی مسائل پر بہت کم اظہار خیال فرمایا گیا ہے؛ چنانچہ محققین کا خیال ہے کہ قرآن مجید میں احوالِ شخصیہ سے متعلق ستر، شہری قوانین سے متعلق ستر، قانون جرم وسزا سے متعلق تیس، عدالتی قانون سے متعلق تیرہ، مالی اور اقتصادی قانون سے متعلق دس، دستوری اور آئینی قوانین سے متعلق بھی دس اور بین الاقوامی معاملات سے متعلق پچیس آیات نازل ہوئی ہیں، ہاں، یہ ضرور ہے کہ قرآن نے ہر شعبۂ حیات سے متعلق بنیادی اُصول وقواعد متعین فرما دیئے ہیں اور شریعت کے اساسی مقاصد اور مقتضیات کو واضح کر دیا ہے۔

حدیث میں نسبتاً عملی احکام پر زیادہ روشنی ڈالی گئی ہے اور زندگی کے ایک ایک گوشہ کے لئے عملی نمونہ فراہم کر دیا گیا ہے؛ لیکن حدیث میں بھی عبادات اور اخلاقیات کی تو پوری طرح تحدید کر دی گئی ہے؛ لیکن معاملات کے باب میں کچھ ضروری اور اُصولی احکام پر ہی اکتفاء کیا گیا ہے؛ اس لئے ہر دور میں پیدا ہونے والے مسائل کے لئے قرآن وحدیث میں بنیادی ہدایات تو مل جاتی ہیں؛ لیکن ان کے قطعی حل کے لئے غور وفکر کی حاجت باقی رہ جاتی ہے اور ایسا کیا جانا ضروری بھی تھا کہ اگر یہ صورت اختیار نہ کی جاتی تو اُمت کے لئے بڑی تنگی پیدا ہو جاتی اور بعض دفعہ

* یہ مقالہ دار العلوم حیدر آباد میں منعقدہ دینی تعلیمی کانفرس میں پیش کیا گیا، جس کی صدارت مولانا ابوالعرفان ندوی نائب مہتمم دار العلوم ندوۃ العلماء فرما رہے تھے، اور حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانیؒ، حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ، مولانا وحید الدین خان (مدیر الرسالہ) اور ہندوستان بھر سے آئے ہوئے مؤقر علماء اس میں شریک تھے۔

بدلے ہوئے حالات میں جزوی تفصیلات پر عمل کرنے کی وجہ سے شریعت کے بنیادی مقاصد مجروح ہوکر رہ جاتے۔

اسی غور وفکر کا نام ''اجتہاد'' ہے اور علماء کے اجتہادات کی مرتب شکل کا نام ''فقہ'' ہے؛ گویا فقہ ایک طرف کتاب وسنت سے ماخوذ اور اس کی تعلیمات کا عطر وخلاصہ ہے اور دوسری طرف انسانی زندگی سے اس کا گہرا رشتہ ہے؛ اسی لئے کہا جاسکتا ہے کہ علوم اسلامی میں سے کوئی اور فن انسانی زندگی سے اس درجہ مربوط نہیں ہے، جیسا فقہ ہے، یہ قرآن وحدیث کی روشنی میں ایک مرتب نظام نامۂ حیات اور شریعت کے منشاء ومقصود کی عملی تشکیل ہے، اس لئے علماء اور دینی علوم کے حاملین کے لئے فقہ میں مہارت اور درک ومعرفت ناگزیر ہے۔

اس وقت ہمارے مدارس میں فقہ کا جو نصابِ تعلیم ہے، وہی ہمارا موضوع ہے اور نصابِ تعلیم اور طریقۂ تعلیم دونوں پہلوؤں سے دو چار باتیں عرض کرنی ہیں۔

فقہ کے فن کو تین حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے: ایک فقہ، دوسرے اُصولِ فقہ اور تیسرے قواعد فقہ — فقہ میں علامہ ابوالحسن مرغینانی کی ''ہدایہ'' ایک بے نظیر کتاب ہے، مرغینانی نے امام قدوری کی مختصر اور امام محمد کی الجامع الصغیر دونوں کو ملا کر فقہ کا نہایت جامع متن تیار کیا اور پھر اس کی نہایت طویل ومبسوط شرح ''کفایۃ المنتہی'' کے نام سے لکھی، پھر اس کی نہایت جامع اور ''قلّ و دلّ'' کا مصداق تلخیص ''ہدایہ'' کے نام سے کی، جو اہل علم اور ارباب ذوق کے لئے صدیوں سے چشم عقیدت کا سرمہ ہے، مصنف کو بعضوں نے ''مجتہد فی المذہب'' قرار دیا ہے اور بعضوں نے ''اصحاب ترجیح'' کے زمرہ میں رکھا ہے، واقعہ ہے کہ مؤلف کو ''مجتہد فی المذہب'' قرار دینا قرین انصاف ہے، مسائل کے احاطہ، منقول ومعقول دلائل کے انتخاب، طرزِ استدلال کی قوت اور ایجاز میں اس کا جواب نہیں، اس کتاب کا ایک امتیازی پہلو یہ ہے کہ یہ اپنے قارئین کو غور وفکر کا ایک نہج عطا کرتی ہے اور استنباط واستنتاج کی صلاحیت پیدا کرتی ہے، اگر یہ تقاضۂ بشریت اس میں یہ کمزوری نہیں ہوتی کہ احادیث سے استدلال میں صحیح روایات کے ساتھ بہت سی سقیم روایات بھی آگئی ہیں، جس کے بارے میں شیخ عبدالحق

محدث دہلویؒ کو کہنا پڑا:

مصنف دے دراکثر بناء کار بر دلیل معقول نہادہ واگر حدیث آوردہ
نزد محدثین خالی از ضعفے نہ غالباً اشتغال گوں اسناد در علم حدیث کم
تر بودہ است۔(شرح سفر السعادۃ:۱۲۳)

تو شاید فقہ اسلامی کے پورے ذخیرہ میں اس کے مماثل ہی نہیں؛ بلکہ اس سے قریبی درجہ پانے کی بھی کوئی اور کتاب مستحق نہیں ہوتی، دینی مدارس کے نصابِ تعلیم میں اس کتاب کا جگہ پانا: ''حق بہ حقدار رسید'' کے مصداق ہے، مگر صورتِ حال یہ ہے کہ ہدایہ کے چار حصوں میں عملاً صرف پہلا حصہ ہی مکمل ہو پاتا ہے، جو عبادات پر مشتمل ہے اور جس کی بحثیں مختلف کتبِ فقہ کے علاوہ کتبِ حدیث میں بھی کثرت وتکرار کے ساتھ آتی رہتی ہیں، ہدایہ کی بقیہ جلدیں جو معاشرتی احکام، بین ممالک قانون اور اقتصادی قوانین سے متعلق ہیں، تشنۂ تکمیل رہتی ہیں، یہ وہ مسائل ہیں جن میں احکام کی بنیاد نصوص سے زیادہ قیاس اور عرف ومصلحت پر ہے، ان سے طلبہ کا ناآشنارہ جانا، زندگی کے مختلف گوشوں میں اسلامی تعلیمات وہدایات سے ان کی محرومی کے ہم معنی ہے، اس لئے اس حقیر کا خیال ہے کہ دو سال میں چار کے بجائے پانچ گھنٹوں میں اگر یہ کتاب مکمل کردی جائے تو طلبۂ فقہ پر احسان عظیم ہوگا۔

ہمارے نصاب میں اس سلسلہ کی دوسری کتاب ''المختصر للقدوری'' پڑھائی جاتی ہے، اس کے مصنف امام ابوالحسین احمد بن محمد قدوری (م، ۴۲۹ھ) ہیں، جو پانچ واسطوں سے امام محمد کے شاگرد ہیں، قدوری مسائل کے احاطہ وانتخاب، تعبیر کی سلاست ووضاحت، استناد کے اعتبار سے تثبت واحتیاط، نیز حسن ترتیب میں نہایت اعلیٰ درجہ کی تالیف ہے اور فقہی متون میں اس کی نظیر کم ہی ملتی ہے، یہ کتاب عربی تعلیم کے ابتدائی سالوں میں پڑھائی جاتی ہے اور غالباً اکثر مدارس میں یہ بھی تشنہ تکمیل ہی رہتی ہے۔

ان دو کتابوں کے علاوہ تین اور کتابیں اس موضوع پر داخل درس ہیں، ابتدائی جماعت میں ''نورالایضاح'' جو ابوالاخلاص حسن بن عمار شرنبلالی (۱۰۶۹ھ) کے قلم سے ہے،

اس کا موضوع عبادات یعنی ارکان اربعہ ہیں، شرنبلالی کو فقہاء میں وہ درجہ نہیں دیا گیا ہے جو مرغینانی اور قدوری نے پایا ہے اور اس کی مثال خود یہ کتاب ہے جس میں سنن وآداب وغیرہ کے نقل کرنے میں جابجا تسامح ہوا ہے، عبارت میں بھی وہ سلاست و برجستگی نہیں ملتی، جو امام قدوری کے متن میں ہے، اور نصابی نقطۂ نظر سے سب سے قابل توجہ امر یہ ہے کہ کتاب کی ابتداء ہی میں غسل واستنجاء وغیرہ کے مسائل میں ایسی وضاحت کا اُسلوب اختیار کیا گیا ہے، جو کم سن اور شعور کی دہلیز پر قدم رکھنے والے طلبہ کے سادہ ذہن کے لئے کسی طرح موزوں نہیں ہے۔

دوسری کتاب ''کنز الدقائق'' ہے، ابوالبرکات نسفی (۷۱۰ھ) نے حنفیہ کی مستند آراء پر مشتمل نہایت جامع متن اس کتاب کی صورت میں مرتب فرمایا ہے، خود نسفی نے اس کو ظاہر روایت سے ثابت شدہ احکام کا مجموعہ بتایا ہے: ''**لانه موضوع لظاهر الرواية**'' (البحر الرائق: ۲۳۲/۷) — علامہ نسفی کے علمی مقام ومرتبہ کی شاہد تفسیر میں ''مدارک التنزیل'' اور اُصول میں ''المنار'' ہیں، کہ ان کو جو شہرت عام اور نقش دوام اپنے فن میں حاصل ہوا، اس کی مثال کم ہی مل پاتی ہے۔

لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ یہ اس دور وسطیٰ کی تالیف ہے جب فن پر توجہ دینے اور اس میں اضافہ کرنے کے بجائے ایسی تحریروں کا رواج پڑ گیا تھا، جس میں مختصر سے مختصر عبارت میں بیش از بیش معانی کو سمیٹ لیا جائے، خواہ الفاظ وعبارت کی اس کفایت کے نتیجہ میں قارئین کا وقت کتنا بھی صرف ہو جائے اور ایک ایک سطر کی عقدہ کشائی میں بے چارے شارحین کے صفحات کے صفحات بھی کافی نہ ہو پائیں، افسوس کہ خود ''کنز الدقائق'' بھی اسی مزاج کی کتاب ہے اور اس کے اختصار نے حد ایجاز کو پار کر کے اغلاق کی صورت اختیار کر لی ہے۔

تیسری کتاب تاج الشریعہ محمود کے فقہی متن ''وقایہ'' پر ان کے پوتے صدر الشریعہ الاصغر عبید اللہ بن مسعود (م، ۷۴۷ھ) کی مفصل شرح ہے، جو ''شرح وقایہ'' کے نام سے معروف ومتداول ہے، ''شرح وقایہ'' کو فتاویٰ وغیرہ میں ''ہدایہ'' و ''قدوری'' اور ''کنز''

کا سا استناد حاصل نہیں، بہت سے مقامات پر طول بیان ہے اور درازنفسی کا احساس ہوتا ہے، اور اس کے بعض مقامات پر مزید اُلجھاؤ پیدا ہوگیا ہے۔

یہ دو کتابیں ایسی ہیں کہ ان کا متبادل موجود ہے، ''شرح وقایہ'' کی جگہ ملا علی قاری کی ''شرح نقایہ'' بڑی عمدہ چیز ہے، ملا علی قاری بلند پایہ محدث ہیں اور جب کسی مصنف کے ذوق میں حدیث وفقہ کا ''قران السعدین'' ہو جائے تو اس کی آب وتاب ہی اور ہوتی ہے، میں نے سنا کہ شیخ الادب حضرت مولانا اعزاز علی صاحبؒ کی رائے بھی یہی تھی، بہتر ہوگا کہ شرح وقایہ کی جگہ اس کتاب کو شریک نصاب کیا جائے —— نور الایضاح کی جگہ مولانا شفیق الرحمن ندوی نے ''الفقہ المیسر'' کے نام سے اس سن وسال کے طلبہ کے لئے بڑی اچھی چیز تیار کردی ہے، زبان سہل ہے، چھوٹے فقرے ہیں، تراکیب بھی آسان ہیں، مسائل وضاحت کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں، ترتیب بھی اچھی ہے، ان مسائل سے صرف نظر کیا گیا ہے جن کی ابھی ان طلبہ کو ضرورت نہیں، ساتھ ہی نئے طریقہ پر ''تمرینات'' بھی قائم کردی گئی ہیں، ضرورت ہے کہ ''دینی مدارس'' اسے قبول کریں، مگر افسوس کہ بعض دفعہ گروہی حد بندیاں اور تنگنائیاں اعتراف وتسلیم میں رکاوٹ ہو جاتی ہیں۔ وإلی اللہ المشتکی۔

تقابلی مطالعہ

تقابلی مطالعہ وبحث کا ذوق واقعہ ہے کہ دوسرے اہل فن کے مقابلہ فقہاء کے ہاں زیادہ ہے، اہل سنت کے چاروں دبستانِ فقہ پر متعدد کتابیں اس موضوع کی لکھی گئی ہیں، قدیم علماء نے بھی لکھی ہیں اور ماضی قریب میں بھی بعض عرب اہل علم نے اس پر بڑا قیمتی کام کیا ہے، ضرورت اس بات کی ہے کہ فقہ پر ایک ایسی کتاب بھی شریکِ نصاب ہو جو مختلف فقہی آراء کا معروضی اور غیر جانبدارانہ مطالعہ کراتی ہو، اس سے نگاہ میں وسعت اور فکر وخیال میں فراخی پیدا ہوگی اور نقد وتحقیق کی صلاحیت اُبھرے گی، اس سلسلہ میں ابن رشد قرطبی کی ''**بدایۃ المجتہد**'' کی عظمت شان اور قدر وقیمت سے کسے انکار ہوگا؟ پوری کتاب نہ سہی کچھ ابواب بھی پڑھا دیئے جائیں تو مسائل میں فقہی جزئیات پر قناعت کی بجائے ان کی بنیاد واساس کو

سامنے رکھ کر سوچنے کا ذوق پیدا ہوگا۔

طریقۂ تعلیم

لیکن مسئلہ کتاب سے زیادہ کتاب پڑھانے کے اُسلوب ونہج کا ہے، اساتذہ کا ذوق اوران کی محنت اصل میں طلبہ کے ذہن وفکر کی تعمیر کرتی، ذوق کو پروان چڑھاتی اور آتش شوق کو سلگاتی اور بھڑکاتی ہے، فقہ کی تعلیم میں دو بنیادی تبدیلیوں کی ضرورت ہے، ایک یہ کہ کتاب اور مسائل کے حل میں طلبہ کو شریک کیا جائے، کتاب کی عبارت ان سے حل کرائی جائے، گاہے گاہے دلائل پر ان کو بحث کا موقع دیا جائے، ان سے کہا جائے کہ اس پر تنقیدی نظر سے غور کریں، استحسانی مسائل میں خود طلبہ سے یہ بات نکلوائی جائے کہ اس سلسلۂ میں قیاس جلی اور قیاس خفی کیا ہے اور وجہ استحسان کیا ہے؟ اس سے ان میں نقل وروایت کے بجائے مسائل کی روح پر غور کرنے اور سوچنے کا ذوق پیدا ہوگا۔

دوسری اس سے زیادہ ضروری بات یہ ہے کہ اس دور میں جو مسائل پیدا ہو رہے ہیں، وہ بالعموم فقہاء کے قدیم اجتہادات سے کسی نہ کسی طرح تعلق رکھتے ہیں، تو جہاں ایسے مسائل آئیں جن سے موجودہ زمانہ کے کسی نو پید مسئلہ کا تعلق ہو، وہاں خصوصی اہتمام اور شرح وبسط کے ساتھ اس پر بھی روشنی ڈالیں، جیسے: ربا کے تحت بینک انٹرسٹ کا، قمار کے تحت انشورنس کا بیع کے تحت موجودہ زمانہ کی بیع کی بہت سی نت نئ شکلوں کا، جہاد وسیر کے ابواب میں ہندوستان کی شرعی حیثیت کا، بیع صرف کے ذیل میں زر کی حقیقت اور زر اصطلاحی اور فی زمانہ مروج کرنسی نوٹوں کا، اگر اس بیدار مغزی اور چوکسی کے ساتھ تعلیم دی جائے تو طلبہ مسائل عصر سے بے بہرہ نہ رہ پائیں گے، مگر ہر مدرس سے اس کی توقع رکھنا مشکل ہے؛ اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ مدرسین کے لئے ایک ایسی ''کلید'' مرتب کی جائے جو ان کی رہنمائی کرتی ہو کہ ان کو کسی نصابی کتاب کے کس مسئلہ کے ذیل میں کن نئے مسائل پر بحث کرنی ہے؟ ممکن ہے اس طرح اس دشواری کا حل نکل سکے۔

ہمارے موجودہ طرز تدریس میں علوم شرعیہ میں مختلف فنون کی تعلیم کے لئے یکساں انداز اختیار کیا جاتا ہے، مثلاً حدیث کے درس اور فقہ کے درس میں کوئی اجنبی شخص بیٹھے تو کم ہی فرق کر پائے، فقہ کے درس کا بھی یہی حال ہے ابواب وفصول کے درمیان باہمی ارتباط کی بحث، مصنف سے کہیں تسامح ہوگیا ہے تو اس کے لئے بہ ہزار تکلف تاویل وتوجیہ —— اس طرح کی بحثوں کی بجائے ضرورت اس بات کی ہے کہ فقہی باب کو پڑھانے سے پہلے اس باب فقہی سے متعلق فقہ کے بنیادی ضوابط وقواعد طلبہ کو بتادئے جائیں، تاکہ طلبہ کے لئے تطبیق میں آسانی ہو اس مقصد کے لئے بھی مدرسین کو کلید فراہم کرنا ہوگی، اس کے لئے شیخ حمزہ دمشقی کی ''الفوائد البهية فى القواعد الفقهية'' بڑی عمدہ چیز ہے، جس میں قواعد فقہ کو ابواب فقہیہ کی ترتیب سے مرتب کیا گیا ہے، اس سے ہر باب میں شریعت کا مزاج ومذاق اور بنیادی اُصول سامنے آجاتے ہیں۔

جدید فنون کی مبادیات

فقہ — جیسا کہ عرض کیا گیا — محض کوئی نظری اور خیالی فن نہیں ہے؛ بلکہ وہ انسان کی عملی زندگی سے مکمل طور پر مربوط وہم رشتہ ہے؛ اس لئے زندگی کے نت نئے تجربات اور انسانی زندگی پر اثر انداز ہونے والے افکار وخیالات سے آگہی ضروری ہے، اس مقصد کے لئے ضروری ہے کہ معاشیات، سیاسیات، جغرافیہ، جنرل سائنس، عالمی قانون کی مبادیات پر مشتمل کتابیں مرتب کی جائیں اور مختلف جماعتوں میں اس طرح ان مضامین کو پڑھا دیا جائے کہ دوسرے مضامین کی تعلیم متاثر نہ ہو، منطق اور فلسفہ کی کتابوں میں تخفیف کرکے بہ سہولت اس کی گنجائش فراہم کی جاسکتی ہے۔

غور کیجئے کہ جو شخص زر کی حقیقت سے واقف نہ ہو وہ سکوں کی فقہی جہت کیوں کر متعین کرسکتا ہے؟ جو بین الاقوامی قوانین سے آگاہ نہ ہو وہ مسلم اور غیر مسلم ممالک کے تعلقات اور اُن کی شرعی حیثیت پر کیا بحث کرسکتا ہے؟ جو ملک کے دستور وآئین سے بے خبر ہو وہ کس

طرح ہندوستان کی شرعی حیثیت متعین کرسکتا ہے؟ اسی طرح کے بے شمار مسائل ہیں جو ان جدید فنون کے جاننے پر موقوف ہیں۔

اسرار شریعت

کسی بھی قانون میں محض جزئیات اور عام مقررہ اُصول کو جان لینا کافی نہیں ہے؛ بلکہ اس کے ساتھ اس کی حکمت ومصلحت، باہمی ربط وانتظام اور اس کی بنیادی اور اساسی فکر کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے، ایسا ممکن ہے کہ شریعت کے عام اُصول اور عام احکام کے مقابلہ کسی خاص مسئلہ میں شریعت کے مقصد اور مصلحت کی تکمیل کے لئے الگ راہ اختیار کی جائے، اہل علم نے استحسان کی بہت سی تعریفیں کی ہیں؛ لیکن اس فقیر کا خیال ہے کہ اصل میں جہاں علت اور حکمت کا رشتہ ٹوٹ جاتا ہے اور قیاس ظاہر پر عمل کرنے کی وجہ سے شریعت کے بنیادی مقصد ومنشا اور مزاج و مذاق کی رعایت نہیں ہو پاتی، وہاں علت پر حکمت کی ترجیح اور ظاہری قیاس سے عدول کر کے شریعت کے اساسی مقصد ومنشا کی تکمیل کا نام ''استحسان'' ہے، استحسان کی مثالوں کا بنظر غائر مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت پوری طرح واضح ہوجائے گی۔

اس مقصد کی تکمیل کے لئے اسرار شریعت سے آگہی ضروری ہے، افسوس کہ اس فن پر مستقل کتابیں کم لکھی گئیں ہیں، امام غزالیؒ نے ''احیاء العلوم'' میں اور حافظ ابن قیم نے ''اعلام الموقعین'' میں نیز حافظ عزالدین ابن عبدالسلام نے ''قواعد الاحکام'' میں اس موضوع پر اچھی گفتگو کی ہے؛ لیکن چوں کہ ان کتابوں میں اسرار شریعت کا ذکر ضمنی طور پر ہوا ہے؛ اس لئے یہ بحثیں منتشر ہیں اور یکجا نہیں ہیں۔

شاہ ولی اللہ صاحب کی ''حجۃ اللہ البالغہ'' بے ریب اس موضوع پر اپنی مثال آپ ہے، ضرورت اس بات کی ہے کہ اسرار شریعت کے فن کو جس کو ہم ''فلسفہ شریعت اسلامی'' بھی کہہ سکتے ہیں، ایک مستقل موضوع کی حیثیت سے داخل نصاب کیا جائے، اختصاص وافتاء کے درجہ میں تو ''حجۃ اللہ البالغہ'' کے منتخب ابواب پڑھائے جائیں اور اصل نصاب کے لئے مذکورہ

کتابوں کو سامنے رکھ کر ایک مختصر کتاب آسان عربی زبان میں مرتب کی جائے، اُمید ہے کہ اس سے بڑا فائدہ ہوگا۔

نصابی کتابوں پر بعض ضروری کام

یہ ایک حقیقت ہے کہ اس وقت ہمارے نصاب میں جو کتابیں داخل ہیں، وہ اصل میں عام استفادہ کے لئے لکھی گئیں تھیں، شاید مصنف کے حاشیہ خیال میں بھی یہ بات نہ رہی ہو کہ ان کی یہ کتب کبھی داخل نصاب ہوگی؛ اس لئے ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ جیسے سلف صالحین نے شروح وحواشی کے ذریعہ ان کتابوں کی خدمت کی ہے، نصابی نقطۂ نظر سے آج ان پر کچھ کام کیا جائے۔

اور وہ کام یہ ہے کہ ذیلی عناوین قائم کئے جائیں، فقروں کی ترقیم کی جائے، پیراگراف متعین کیا جائے، کتاب کو مضمون کے اعتبار سے دروس میں تقسیم کیا جائے، ہر درس کے ختم پر تمرینی سوالات تحریر کئے جائیں، کتاب پر ایک نہایت مختصر ایسی تعلیق لکھی جائے، جس میں شخصیات، کتب، مقامات اور نسبتوں پر مختصر نوٹس لکھے جائیں، کتاب کے شروع میں مؤلف کے حالات، کتاب کی خصوصیات، موضوعِ کتاب کا تعارف اور اس کتاب کے طریقہ تدریس سے متعلق مختصراً صفحہ ڈیڑھ صفحہ کے نوٹس مرتب کر دیئے جائیں اور کتاب کے مسائل و احکام کی مفصل فہرست بندی کر دی جائے۔

اگر ہماری متداول نصابی کتب پر اس طرح کا کام کیا جائے، تو یہ کارنہیں ’’ کارنامہ‘‘ ہوگا اور اساتذہ وطلباء کو اس سے بڑا فائدہ ہوگا، نیز اس سے طریقہ تعلیم میں بھی مفید اور مثبت تبدیلی پیدا ہوگی۔

وما أريد إلا الإصلاح والله ولی التوفيق وهو المستعان۔

ہندوستان کی دینی جامعات میں
اُصولِ فقہ اور قواعدِ فقہ کی تعلیم *

کسی بھی قانون میں اُصولِ قانون کو ایک خاص اہمیت حاصل ہوتی ہے؛ کیوں کہ قانونی جزئیات وتفصیلات وقت اور حالات کے لحاظ سے بدلتی رہتی ہیں؛ لیکن اُصول کو ثبات واستمرار اور بقاء ودوام حاصل ہوتا ہے، اللہ جزاء خیر دے ہمارے سلف صالحین کو، کہ انھوں نے فقہ اسلامی کے اُصول کو مرتب ومنقح کرنے میں اتنی دیدہ وری وژرف نگاہی سے کام لیا کہ تاریخ قانون میں شاید ہی اس کی مثال مل سکے، یہاں تک کہ مستشرقین بھی اس بات کے معترف ہیں کہ اُصولِ فقہ اور بین ملکی قوانین (جن کو فقہ اسلامی میں ''قانونِ سیر'' کہا جاتا ہے) کی ترتیب وتدوین میں فقہاء اسلام کو اولیت کا شرف حاصل ہے۔

علوم اسلامی میں ''اُصولِ فقہ'' کی تدریس کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے؛ کیوں کہ اس فن کا تعلق صرف فقہ ہی سے نہیں؛ بلکہ کتاب اللہ سے بھی ہے، حدیث سے بھی ہے اور ایک گونہ عقیدہ وکلام سے بھی؛ اسی لئے ہندوستان کے مدارس میں اس موضوع کو خصوصی اہمیت دی گئی ہے اور اُصولِ فقہ کی متعدد کتابیں داخل درس کی گئی ہیں —— تاہم ہندوستان کے مدارس اسلامیہ میں اُصولِ فقہ کی تدریس کے مسئلہ پر گفتگو کرنے کے لئے بہ طور تمہید کے دو نکات کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے، اول ان مضامین کی جو اس فن میں زیر بحث آتے ہیں، دوسرے ان مناہج کی جو مصنفین نے اس فن کی ترتیب وتوضیح میں اختیار کئے ہیں۔

* یہ تحریر اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا اور المعہد العالمی للفکر الاسلامی امریکہ کے باہمی تعاون سے منعقد ہونے والے ''مقاصدِ شریعت ورکشاپ'' کے لئے مرتب کی گئی، جو ہمدرد سیمینار ہال دہلی میں ۲۱ تا ۲۵ ر دسمبر ۲۰۰۳ء کو منعقد ہوا تھا اور جس میں علماءِ ہند کے علاوہ امریکہ سے ڈاکٹر صلاح الدین سلطان بھی شریک ہوئے تھے۔

اُصولِ فقہ کے مباحث

اُصولِ فقہ میں جو مباحث آتے ہیں، ان کو بنیادی طور پر پانچ حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے :

(۱) ''حاکم'' یعنی حکم دینا اور حلال وحرام کرنا کس کا حق ہے؟ یہ بات تو ظاہر ہے کہ شریعتِ اسلامی میں حکم کا اصل سرچشمہ اللہ تعالیٰ کی ذات والا صفات ہے: **''اِنِ الْحُکْمُ اِلاَّ لِلّٰہ''** (یوسف:۶۷)، **''اَلاَ لَہُ الْحُکْمُ''** (انعام:۶۲)، **''اَلاَ لَہُ الْخَلْقُ وَ الْاَمْر''** (اعراف:۵۴)؛ لیکن ایک بحث فقہاء اور متکلمین کے یہاں یہ آتی ہے کہ کسی شئ کا حکم متعین کرنے میں عقل کا کیا مقام ہے؟ اور اس سلسلہ میں اشاعرہ، ماتریدیہ اور معتزلہ کے درمیان جو مشہور اختلاف ہے، آپ حضرات اس سے بخوبی واقف ہیں؛ اس لئے یہ بحث بیک وقت فقہ اور علم کلام دونوں سے مربوط ہے اور اسی لئے اس میں فقہ کے مختلف مکاتب فقہ کے بجائے، علم کلام کے مختلف مکاتب کے درمیان اختلاف زیادہ اُبھر کر سامنے آیا ہے۔

(۲) دوسری بحث ''حکم شرعی'' کی آتی ہے، چاہے حکم تکلیفی ہو یا حکم وضعی، حکم کا بنیادی مقصد بندوں سے صادر ہونے والے افعال کے وصف شرعی، حلال وحرام، مباح ومکروہ وغیرہ کو ظاہر کرنا ہے اور ہر مسلمان اپنی عملی زندگی میں اس کی واقفیت حاصل کرنے کا زیادہ ضرورت مند ہوتا ہے۔

(۳) **''أدلۃ الأحکام''** — یہ اُصولِ فقہ کی سب سے اہم بحث ہے، جسے ''ادلہ شرعیہ'' سے تعبیر کیا جاتا ہے، اس میں چار ادلہ کتاب اللہ، سنت رسول ﷺ، اجماع اور قیاس متفق علیہ ہیں، آٹھ کے بارے میں معتبر ہونے یا نہ ہونے میں فی الجملہ اختلاف پایا جاتا ہے، وہ یہ ہیں: ''قولِ صحابی، شرائع ما قبل، استحسان، مصالح مرسلہ، سد ذرائع، استصحاب، عرف وعادت، تعامل اہل مدینہ'' چوں کہ یہی مصادر تمام احکام شرعیہ کے لئے مآخذ ہیں، اس لئے اُصولِ فقہ میں اس باب کو جو اہمیت حاصل ہے، وہ ظاہر ہے۔

(۴) ''مقاصد و مدارج احکام'' مقاصد سے مراد احکام شرعیہ کے عمومی مقاصد خمسہ،

حفظ دین، حفظ نفس، حفظ نسل، حفظ مال اور حفظ عقل ہیں اور مدارج سے مراد اہمیت کے اعتبار سے احکام کے مدارج یعنی ضرورت و حاجت اور تحسین ہے، جیسے بعض اہل علم نے تین کے بجائے پانچ اور بعض نے ہر درجہ کے ساتھ ایک مکمِّل کا اضافہ کر کے چھ درجات مقرر کئے ہیں، اُصولِ فقہ کا یہ حصہ نہایت اہم ہے اور مجتہد کے لئے اجتہاد و استنباط کے حدود اربعہ کو متعین کرتا ہے؛ لیکن کم ہی مصنفین نے اس موضوع پر گفتگو کی ہے۔

(۵) **''دلالت کلام''** — دین کا اصل ماخذ کتاب اللہ اور سنت رسول ﷺ ہے اور اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی یہ امانت عربی زبان میں محفوظ ہے؛ اس لئے جو شخص احکام شرعیہ کا استنباط کرنا چاہتا ہو، اس کے لئے عربی زبان اور اس کے اسالیبِ تعبیر سے واقف ہونا ضروری ہے، مثلاً یہ کہ امر کی دلالت وجوب پر ہوتی ہے یا استحباب و اباحت پر؟ نہی کا صیغہ کب تحریم کے لئے آتا ہے اور کب بطور ارشاد کے وارد ہوتا ہے؟ عام اور مطلق کی دلالت اپنے افراد پر قطعی ہوتی ہے، یا وہ بیان کا محتاج ہوتا ہے؟ ''وٗ'' صرف جمع کے لئے ہے، یا جمع و ترتیب دونوں کے لئے ہے؟ ''ب، ف، ثم، الی، حتی اور مِن'' یہ کلمات کب کن معنوں میں استعمال ہوتے ہیں؟ وغیرہ ان تمام مباحث کا تعلق اصل میں عربی زبان کے قواعد سے ہے؛ لیکن چوں کہ کتاب وسنت کی زبان بھی عربی ہی ہے؛ اس لئے یہ موضوعات اُصولِ فقہ کا بھی اہم حصہ ہیں؛ بلکہ علامہ بزدویؒ اور سرخسیؒ وغیرہ کی ترتیب میں کتاب کا ابتدائی بڑا حصہ اسی بحث پر مشتمل ہے۔

منہجِ تالیف

اُصولِ فقہ کے موضوع پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں، وہ طریقۂ تالیف اور ترتیب کے لحاظ سے تین طرح کی ہیں: ایک ''**طریق الشافعیة**'' جس کو ''**طریق المتکلمین**'' بھی کہتے ہیں، دوسرے ''**طریق الحنفیة**'' جس کو ''**طریق الفقهاء**'' بھی کہتے ہیں اور تیسرے ''**جامع بین الطریقین**''۔

متکلمین، مالکیہ اور شوافع کے یہاں اُصولی مسائل کی توضیح کا اُسلوب یہ ہے کہ وہ نفس

قواعد کو ذکر کرتے ہیں، اس کے حدود و قیود بیان کرتے ہیں اور اس پر دلائل قائم کرتے ہیں، فروع و جزئیات پر اس کی تطبیق کا التزام نہیں کرتے، امام غزالیؒ (م: ۵۰۵ھ) کی ''**المستصفی**'' علامہ آمدیؒ (م: ۶۳۱ھ) کی ''**الإحکام**'' اور قاضی بیضاویؒ (م: ۶۸۵ھ) کی ''**المنہاج**'' اس سلسلہ کی اہم کتابیں سمجھی جاتی ہیں۔

فقہاء حنفیہ کا طریق یہ ہے کہ وہ اپنے ائمہ کے مجتہدات کو سامنے رکھ کر اُصول وقواعد وضع کرتے ہیں اور ان قواعد کو ذکر کرتے ہوئے ان کی تفریعات کو نقل کرتے ہیں اور اُصول وفروع کے ارتباط پر زیادہ توجہ دیتے ہیں؛ اس لئے شوافع کے یہاں اُصول اور ان کے دلائل پر زیادہ زور ہوتا ہے اور احناف کے یہاں اُصول اور فروع سے ان کے ارتباط پر، اس طریقہ پر لکھی جانے والی کتابوں میں قاضی ابوزید دبوسیؒ (م: ۴۳۰ھ) کی ''**تقویم الأدلة**'' فخر الاسلام بزدویؒ (م: ۴۴۲ھ) کی ''اُصول''، شمس الائمہ ابوبکر سرخسیؒ (م: ۴۹۰ھ) کی ''اُصول'' اور بعد کے علماء میں علامہ حافظ الدین نسفیؒ (م: ۷۱۰ھ) کی ''کتاب المنار'' بنیادی کتابیں سمجھی جاتی ہیں۔

بعد کو کچھ اہل علم نے ان دونوں طریق کو جمع کرنے کی کوشش کی ہے اور اس حیثیت سے علامہ مظفر الدین بغدادی حنفی المعروف بابن ساعاتی (م: ۶۹۴) کی ''بدیع النظام'' جو آمدی کی ''ال إحکام'' اور فخر الاسلام بزدوی کی ''اُصول'' کو جامع ہے، صدر الشریعہ کی ''التوضیح'' علامہ ابن ہمام کی ''التحریر'' اور علامہ تاج الدین سبکی کی ''جمع الجوامع'' اور ان کتابوں کی شروح اہم سمجھی جاتی ہیں اور اسی سلسلہ کی ایک کڑی ملا محب اللہ بن عبدالشکور (م: ۱۱۱۹ھ) کی ''مسلم الثبوت'' ہے۔

ہندوستان کے دینی مدارس میں داخلِ نصاب اُصولِ فقہ کی کتابوں پر ایک نظر

اس تمہید کی روشنی میں ہندوستان میں داخل درس اُصولِ فقہ کے مضمون پر دو جہتوں سے غور کرنے کی ضرورت ہے، اول ان کتابوں پر جو داخل نصاب ہیں، دوسرے اس مضمون کے طریقۂ تعلیم پر۔

جہاں تک کتابوں کی بات ہے تو عام طور پر تین کتابیں اُصولِ فقہ میں پڑھائی جاتی ہیں :''اُصول الشاشی، نورالانوار اور حسامی''۔

اُصول الشاشی

اصحابِ تحقیق کی رائے ہے کہ یہ اسحاق بن ابرہیم شاشی سمرقندی (متوفی: ۳۲۵ھ) کی تالیف ہے، یہ کتاب بڑی تقطیع سے ۱۰۷ صفحات پر مشتمل ہے، اس کتاب میں بڑا حصہ دلالت کلام سے متعلق مباحث پر مشتمل ہے، جو ابتدائی کتاب سے صفحہ نمبر: ٦٧ تک پر محیط ہے، حاکم اور مقاصدِ احکام کے مباحث سے اس کتاب میں تعرض نہیں کیا گیا ہے، ادلہ شرعیہ میں کتاب وسنت اور اجماع و قیاس کی بحثیں ہیں، اس طرح یہ کتاب اُصولِ فقہ کے تمام مباحث کو جامع نہیں ہے اور طلبہ کو مضمون سے مانوس کرنے کے لئے پڑھائی جاتی ہے، ایک دشواری یہ بھی ہے کہ اس کتاب کی ابتدائی بحثیں طلبہ کے لئے نسبتاً دشوار ہوتی ہیں۔

نورالانوار

یہ ایک ہندوستانی عالم ملاجیون کی تالیف ہے، علامہ نسفی کی ''منار'' پر مبسوط و مفصل شرح ہے اور ہندوستانی مطبوعہ بڑی تقطیع سے ۳۱۸ صفحات پر مشتمل ہے، اس کتاب میں بھی حاکم اور احکام شریعت کے مقاصد و مدارج کا ذکر نہیں ہے؛ البتہ قیاس اور استحسان کے مباحث بالتفصیل مذکور ہیں، لیکن کتاب کا ابتدائی نصف حصہ (اور زیادہ تر اسی کا درس ہوتا ہے) ''دلالت کلام'' کی بحثوں اور اس پر تفریعات سے متعلق ہیں، مختلف فیہ ادلہ شرعیہ ''قول صحابی، شرائع ماقبل، استصحاب، عرف، تعامل اہل مدینہ، سد ذرائع وغیرہ'' پر بحث نہیں کی گئی ہے، اس کے ساتھ ساتھ شارح نے متن کی عبارت کو حل کرنے اور اس سلسلہ میں لفظی موشگافیوں، نیز دخل اور دفعِ دخل میں اتنی زیادہ کاوش کی ہے، جو مصنف کے گہرے علم کی دلیل تو ضرور ہے؛ لیکن طالب علم کی توجہ کو اصل فن سے ہٹا دیتی ہے۔

حسامی

''حسامی''، شیخ محمد بن محمد بن عمر اخسیکثی کی تالیف ہے، یہ اُصولِ فقہ کا عظیم الشان متن متین ہے اور ترتیب وہی ہے جو بزدویؒ اور سرخسیؒ وغیرہ کی ہے اور مباحث بھی قریب قریب وہی ہیں، جو ''منار'' اور ''نورالانوار'' کے سلسلہ میں مذکور ہوئے ہیں، البتہ اس میں قیاس واستحسان پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے اور بعض وہ اُصول جس کے دوسرے فقہاء قائل ہیں، احناف قائل نہیں اور ان کا تعلق دلالتِ کلام سے ہے، کو وجوہ فاسدہ کے عنوان سے بالتفصیل ذکر کیا گیا ہے؛ چوں کہ اُصولِ فقہ میں نقد کی بعض بحثیں فن مناظرہ سے متعلق ہیں، اس لئے ''نورالانوار'' اور ''حسامی'' دونوں ہی کتابوں میں ان مباحث کا بھی قابل لحاظ حصہ ہے؛ لیکن اس کتاب (حسامی) میں ''ایجاز واغلاق'' اس درجہ ہے کہ اس کو فقہ اور اُصولِ فقہ پر لکھی گئی چند مغلق ترین کتابوں میں شمار کرنا بے جا نہ ہوگا؛ اس لئے ایک تو اکثر مدارس میں یہ کتاب مکمل نہیں ہو پاتی ہے، دوسرے دقتِ تعبیر کی وجہ سے اساتذہ وطلبہ کی محنت کا بڑا حصہ فن کی گہرائیوں میں غواصی کے بجائے حل عبارت میں صرف ہوجاتا ہے، اگر حسامی کو نصاب میں وہاں سے رکھا جائے جہاں سے کتاب اللہ کی بحث ختم ہوتی ہے اور پھر ختم کتاب تک پڑھا دیا جائے، تو بہت مناسب ہوگا؛ تاکہ قیاس، استحسان، عوارض اہلیت وغیرہ کی بحثیں تفصیل سے آجائیں، پھر موقع ہو تو ابتداء سے پڑھا جائے۔

بعض مدارس میں فضیلت کے بعد اُصولِ بزدوی پڑھائی جاتی ہے اور بعض میں ''التوضیح والتلویح''، یہ فن کی اہم کتابوں میں ہیں؛ لیکن بحیثیت مجموعی قابل توجہ امر یہ ہے کہ ان کتابوں میں صرف فقہاء احناف کے اُصول کو پیش نظر رکھا گیا ہے، جیسے ہم ہدایہ پڑھتے ہوئے مختلف دبستانِ فقہ کا تقابلی مطالعہ کرتے ہیں، اسی طرح ان کتابوں کے ذریعہ ہم مختلف مکاتب فقہ کے اُصول سے آگاہ نہیں ہو پاتے، اسی طرح وہ ادلہ شرعیہ جن کے دوسرے فقہاء قائل ہیں؛ لیکن احناف ان کے قائل نہیں، یا قائل ہیں تو بعض شروط وقیود کے ساتھ، ان پر نگاہ نہیں ہو پاتی ہے، خاص کر وہ مصادر جن سے جدید مسائل کا حل متعلق ہے، جیسے مصالح مرسلہ، عرف وعادت، فتح ذریعہ اور سد ذریعہ، اسی طرح اجتہاد اور تقلید وتلفیق کے اُصول، مجتہد کے

اوصاف ، اجتہاد کے مختلف مراحل ، تحقیق مناط ، تنقیح مناط اور تخریج مناط وغیرہ جیسے اہم موضوعات ان کتابوں میں زیر بحث نہیں آئے ہیں ، یہاں تک کہ بہت سے طلبہ وہ ہیں ، جن کے کان ان عنوانات سے تک آشنا نہیں ہوتے ، اسی طرح شریعت کے عمومی مقاصد اور احکام شرعیہ کے مدارج سے واقف ہونا نہایت ضروری ہے ؛ تاکہ نئے پیش آمدہ مسائل کے بارے میں رائے قائم کرتے ہوئے ان کو ملحوظ رکھا جائے ، ان کتابوں سے ان مضامین کی تکمیل نہیں ہوتی ہے۔

اس پس منظر میں نصابی نقطہء سے دو باتوں کی شدید ضرورت محسوس ہوتی ہے، اول یہ کہ اُصول الشاشی سے پہلے فن کی اصطلاحات ومبادی پر مشتمل ایک مختصر کتاب جو ایک سہ ماہی میں مکمل ہوجائے ، پڑھادی جائے ، جس میں اصطلاحات کی تعریف ، مثال اور ضروری قواعد آجائیں ، خواہ یہ کتاب عربی میں ہو ، یا طلبہ کی مادری زبان میں ، اسی نقطۂ نظر سے راقم الحروف نے ''آسان اُصولِ فقہ'' کے نام سے ایک مختصر رسالہ (تقریباً ۸۰ صفحات پر) مرتب کیا ہے ، جو شائع ہوچکا ہے اور اسی قبیل کا ایک کام محب گرامی مولانا عبیداللہ اسعدی کی ''تسہیل اُصول الفقہ'' بھی ہے ، یہ یا اس طرح کی کوئی کتاب شروع میں پڑھادینا طلبہ کے ذہن کو مانوس کرنے اور انھیں اُصولِ فقہ کے مضامین سے قریب کرنے میں بہت ہی معاون ثابت ہوگا۔

دوسری ضروری بات یہ ہے کہ منتہی جماعت کے نصاب میں کوئی کوئی ایسی کتاب بھی شامل کی جائے جو طریق الحنفیہ اور طریق الشافعیہ دونوں کو جامع ہو اور مضمون کے اعتبار سے واضح ہو ، تاکہ تمام متفق علیہ اور مختلف فیہ مصادر ، اُصولِ فقہ کی تمام ابحاث اور اہل سنت کے تمام مکاتب فقہ کے نقطۂ نظر سے آگہی حاصل ہوسکے — اور وہ کتاب درج ذیل خصوصیات کی حامل ہو :

اول : اس کی ترتیب وہی ہو جو علامہ ابن ہمام وغیرہ کی ہے ، یعنی حنفیہ اور شوافع کے طریق بیان اور ترتیب احکام کو جامع ہو۔

دوسرے : اُصولِ فقہ کے سلسلے میں مختلف دبستانِ فقہ کے نقطۂ نظر کو انصاف کے

ساتھ پیش کیا جائے۔

تیسرے : متفق علیہ ادلۂ شرعیہ کے علاوہ مختلف فیہ ادلہ کو بھی ذکر کیا جائے اور اس بات کی وضاحت کی جائے کہ ان ادلہ کے سلسلہ میں کن نکات پر فقہاء کا اتفاق ہے اور کن نکات پر اختلاف ہے؟

چوتھے : اُصول کے ضمن میں احکام شریعت کے مقاصد اور احکام کے مدارج پر بھی روشنی ڈالی جائے؟

پانچویں : جو اُصول ذکر کئے جائیں ان کی چند روایتی مثالوں ہی کے ذکر کرنے پر اکتفاء نہیں کیا جائے، بلکہ نئی مثالیں بھی درج کی جائیں، بحمد اللہ ماضی قریب میں مختلف عرب علماء نے ان اُمور کی رعایت کرتے ہوئے اس موضوع پر قلم اُٹھایا ہے؛ لیکن میرے خیال میں ان کتب میں نصابی اعتبار سے شیخ ابوزہرہ اور شیخ خلاف کی کتابیں زیادہ مفید ہیں اور خوشی کی بات ہے کہ بعض اداروں نے اس کتاب کو داخل نصاب کرنے میں پہل بھی کی ہے۔

اس کے علاوہ تکمیل اور افتاء کے درجہ کے لئے علامہ شوکانیؒ کی ''ارشاد الفحول'' بھی بڑی عمدہ چیز ہے، اُصول کا مکمل احاطہ، اُصولی مسائل میں فقہاء کے اختلاف کی بکمال وتمام وضاحت، سادہ اور سہل عبارت، طول نویسی سے گریز، لیکن اغلاق سے پاک، واقعہ ہے کہ یہ کتاب ماضی قریب میں اس موضوع پر لکھی گئی کتابوں میں ایک خاص درجہ وامتیاز کی مالک ہے؛ البتہ یہ ضرور ہے کہ مصنف ظاہری نقطۂ نظر کے حامل ہیں اور کتاب پر اس کا اثر موجود ہے۔

قواعدِ فقہ

اُصولِ فقہ سے قریب تر ایک موضوع ''قواعدِ فقہ'' کا ہے اور بعض جہتوں سے قواعد کی اہمیت اُصول سے بھی زیادہ ہے؛ کیوں کہ قواعدِ فقہ شریعت اسلامی کے مزاج ومذاق اور مقاصد ومصالح کو واضح کرتے ہیں، ہندوستان کے دینی مدارس کے مروجہ نصاب میں فضیلت تک کوئی کتاب نہیں پڑھائی جاتی، بلکہ جو طلبہ فضیلت کے بعد تدریب افتاء کرتے ہیں ان کو علامہ ابن

نجیم مصریؒ کی ''الاشباہ والنظائر'' پڑھائی جاتی ہے، ضرورت اس بات کی ہے کہ یہی کتاب، یا اس کی متبادل کوئی اور کتاب جیسے مولانا عمیم الاحسان مجددی کی '' قواعد الفقہ '' یا شیخ مصطفی زرقاءؒ کی ''شرح القواعد الفقھیۃ'' طلبہ کو سبقاً سبقاً پڑھائی جائے اور مجلۃ ''الأحکام العدلیۃ'' کے شروع میں جو ۹۹ قواعد آئے ہیں، وہ طلبہ سے زبانی یاد کرائے جائیں، پھر تدریب افتاء کے شعبہ میں اس موضوع پر کوئی کتاب پڑھاتے ہوئے، یا اس کے بغیر ان سے تخریج کا کام لیا جائے کہ وہ کتبِ فقہ سے ایسی جزئیات کا انتخاب کریں جن پر یہ فقہی قواعد منطبق ہوتے ہوں، اس سے طلبہ کے اندر اپنے عہد کے حالات پر شریعت کے مقاصد ومصالح کی تطبیق اور شریعت کے عمومی قواعد اور اُصول کو سامنے رکھ کر مسائل پر غور کرنے کی صلاحیت پیدا ہوگی۔

طریقۂ تعلیم

دوسرا اہم پہلو طریقۂ تعلیم کا ہے، اُصول وقواعد کی تعلیم میں مفید طریقہ یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ تطبیقی تعلیم ہو اور عملی طور پر اس کی مشق کرائی جائے؛ لیکن صورتِ حال یہ ہے کہ عام وخاص، ظاہر ومشکل، مطلق ومقید، حروف معانی وغیرہ کی مثالیں، جو ایک کتاب میں مذکور ہیں، قریب قریب وہی مثالیں دوسری کتابوں میں بھی آتی ہیں، اس کی وجہ سے طلبہ سمجھنے لگتے ہیں کہ یہ اُصول زیادہ تر نظری ہیں، ضرورت اس بات کی ہے کہ اُصولِ فقہ کو تطبیقی انداز پر پڑھایا جائے اور تطبیق کے لئے صرف اختلافی مسائل ہی کا انتخاب نہ کیا جائے؛ بلکہ قرآن مجید کی مختلف آیات اور احادیث انھیں دی جائیں اور ان سے خواہش کی جائے کہ وہ ان آیات پر ان قواعد کو منطبق کریں تاکہ جیسے نحوی وصرفی قواعد کو منطبق کرنے کی صلاحیت حاصل کرتے ہیں، یہی صلاحیت ان کے اندر اُصولِ فقہ اور قواعدِ فقہ کی تطبیق کے سلسلہ میں بھی پیدا ہو۔

وباللہ التوفیق وھو المستعان۔

❁❁❁

دینی مدارس ہی پر نگاہِ عنایت کیوں؟

اس وقت ہمارے ملک ہندوستان میں دینی مدارس پر حکومت کی خاص نظر عنایت ہے اور فرقہ پرست جماعتوں نے بھی ان درس گاہوں کے خلاف اپنے حملے تیز کر دیئے ہیں، بجرنگ دل فرقہ پرست ہندو نو جوانوں کو آتشیں اسلحہ کی تربیت دے رہا ہے اور انھیں دہشت گردی پر اکساتے ہوئے ترشول تقسیم کر رہا ہے؛ لیکن اس پر نہ ہماری حکومت کو کوئی تشویش ہے، نہ سیاسی جماعتوں کو کوئی پریشانی؛ لیکن یہ مدارس جہاں لاٹھی اور غُلیل کی بھی تربیت نہیں دی ہے، ان پر ہر چہار طرف شکوک وشبہات کی نگاہیں اُٹھ رہی ہیں اور عداوت وعناد کے تیر برسائے جا رہے ہیں، ظاہر ہے کہ یہ کھلا ہوا ظلم اور شیشے کے گھر میں بیٹھ کر بے قصور راہ گیروں پر پتھر پھینکنے کے مترادف ہے!

بظاہر حکومت کو دینی مدارس کا شکر گذار ہونا چاہئے، حکومت تعلیم پر کڑوروں کڑور روپئے خرچ کرتی ہے، اساتذہ کو اعلیٰ تنخواہیں دیتی ہے، بیش قیمت بلڈنگیں بناتی ہے، طلبہ کے لئے طرح طرح کی سہولتیں فراہم کرتی ہے، پھر تعلیم کے بعد ان کے لئے ملازمت کا نظم کرنا ہوتا ہے اور خواندگی کے تناسب کو بڑھانے کے لئے بڑے جتن کرنے ہوتے ہیں، یہ دینی مدارس نہایت خاموشی کے ساتھ علم کی اشاعت میں شب وروز مصروف ہیں، نہ حکومت سے پیسوں کا مطالبہ ہے، نہ بلڈنگوں کا، نہ اپنے فضلاء کے لئے سند کی طلب ہے، نہ ان کے لئے ملازمت فراہم کرنے کی خواہش، اور اس طرح ملک بھر میں لاکھوں طلبہ وطالبات علم واخلاق سے آراستہ ہو رہے ہیں، ان مدارس کے علمی معیار کا حال یہ ہے کہ ہندوستان کی کسی بھی یونیورسٹی میں چلے جائیں، عربی، اُردو اور فارسی کے شعبوں میں جہاں فضلاء مدارس نے داخلہ لیا ہے، وہاں وہی فائق اور ممتاز ہیں اور صحافت اور تصنیف وتالیف کے میدان میں دیکھا جائے تو کم

سے کم پچاسی فیصد حصہ انھیں کا ہوگا، ان مدارس سے ہمارے ملک کو عالم اسلام اور عالم عرب سے تعلقات کے لئے اچھے مترجم اور سفارت خانوں کے لائق کارکن بھی فراہم ہوتے ہیں، ان کی تصنیفی وتالیفی خدمات سے پورے عالم اسلام میں اس ملک کا نام روشن ہوتا ہے؛ بلکہ یہی خدمات بہت سے خطوں میں ہندوستان کی پہچان اور شناخت ہیں۔

یہ مدارس ملک کو پُرامن، انسانیت دوست اور پابند قانون شہری عطا کرتے ہیں، آج ملک میں دہشت گردی کی جو لہر نظر آتی ہے اور ظلم و جبر کے ساتھ لوگوں کی املاک پر قبضہ کا جو سلسلہ جاری وساری ہے، اس میں تعلیم یافتہ بے روزگاروں کا بڑا حصہ ہے، اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوان چوری، ڈکیتی اور دھوکہ دہی میں دن رات پکڑے جاتے ہیں، اخلاقی گراوٹ کا حال یہ ہے کہ ہماری قومی درس گاہوں سے نکلنے والے طلبہ معمولی ملازمت سے لے کر مقننہ اور عدلیہ تک جہاں پہنچتے ہیں، کرپشن کا بازار گرم رکھتے ہیں اور ان کے ذریعے ایسے ایسے اسکینڈل وجود میں آتے ہیں، کہ جنھیں دیکھ کر شاید شیطان کو بھی حیا آتی ہوگی اور اسے احساس ہوتا ہوگا کہ ہمارے شاگرد ہم پر سبقت حاصل کر چکے ہیں؛ لیکن اس کے برخلاف ان دینی مدارس کے فضلاء کے بارے میں شاید ہی کبھی یہ بات سننے اور دیکھنے میں آئی ہو کہ فلاں بے روزگار عالم ڈاکہ ڈالتے ہوئے اور چوری کرتے ہوئے پکڑے گئے اور فلاں حافظ نے بے روزگاری سے تنگ آکر خودکشی کر لی ہے۔

ایک ہی سماج میں بسنے والے دو انسانوں اور ایک ہی طرح کی ضرورت رکھنے والے دو اشخاص کے درمیان یہ فرق کیوں ہے؟ یقیناً یہ ان درس گاہوں کی تربیت اور تعلیم کے مذاق کا فرق ہے، آج ہم نے جو درس گاہیں قومی فلاح کے نام پر قائم کر رکھی ہیں، وہ زیادہ پیسوں کے حریص ''انسان نما حیوانوں'' کو جنم دیتی ہے، ان کا پورا وجود زیادہ سے زیادہ کمانے کے لئے مخصوص ہے، زبانیں اس لئے گویا ہوتی ہیں کہ انھیں اس حرف اظہار کا معاوضہ ملے، قلم اس لئے لکھتے ہیں کہ وہ اپنی روشنائی کے ایک ایک قطرہ کی پوری پوری قیمت وصول کریں، ہاتھ اس لئے جنبش کرتے ہیں کہ وہ مال وزر کی سوغات لے کر واپس آئیں، پاؤں اس لئے چلتے ہیں کہ

ان کے ہر ہر قدم کی منہ بولی قیمت وصول ہو، دماغ اس مقصد کے لئے سرگرداں ہے کہ وہ کسبِ زر کے اور کیا نئے راستے دریافت کرسکتا ہے؟ اس میں ناجائز اور قانونی وغیر قانونی کی کوئی حد نہیں؛ لیکن دینی مدارس میں ''انسان'' تیار کئے جاتے ہیں، وہ انسان جو انسان کی فلاح کے لئے سوچنا جانتا ہو، وہ انسان جس کا دل انسانی محبت میں دھڑکتا ہو اور وہ انسان جو اپنی زبان اور قلم کو انسان کی فلاح اور نجات کے لئے وقف سمجھتا ہو؛ کیوں کہ دنیا کی متاع حقیر اس کی لیلائے مقصود نہیں؛ بلکہ اسے اپنے ہر عمل کا اجر آخرت میں انسان کے خالق سے وصول کرنا ہے؛ اس لئے وہ سمجھتا ہے کہ اس کا مرنا اور جینا خدا کے لئے ہے: ''**اِنَّ صَلاَتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ اللہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ**'' (الأنعام: ۱۶۲) نقطۂ نظر کے اس فرق کا اثر ضرور ہے کہ ان دونوں درس گاہوں میں پڑھنے والوں کی سوچ اور ان کے عملی رویہ پر بھی پڑے گا۔

لیکن عجیب بات ہے کہ حکومت کو ان ہی دینی مدارس سے خطرات و خدشات ہیں حالاں کہ ملک کی آزادی میں ان کا جو رول رہا ہے، وہ ایک ایسی تاریخی حقیقت ہے جس سے تاریخ کا ادنیٰ طالب علم بھی ناواقف نہیں رہ سکتا، سوائے اس کے کہ کسی نے دانستہ طور پر ناواقف رہنے ہی کی ٹھان لی ہو اور اس کے برخلاف ایسی تنظیمیں جنھوں نے ملک کے بیرونی غاصبوں سے ہاتھ ملا رکھا تھا اور ان کو اس بات سے کوئی دلچسپی نہیں تھی کہ مادرِ وطن سے غلامی کے داغ کو دھوئیں، وہ آج اس ملک کی تقدیر کے مالک بنے ہوئے ہیں۔ **فیا عجباہ ویا أسفاہ!**

یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ یہ سب کچھ ناواقفیت میں پیش آرہا ہے، درحقیقت اس کے پیچھے گہری منصوبہ بندی کارفرما ہے، ہندوستان شروع سے عرب اور اسلامی ممالک کا روایتی دوست تھا؛ لیکن اسرائیل سے قربت کے بعد اب ہمارے ملک میں ایک طبقہ پوری سرگرمی کے ساتھ اس بات پر غور کررہا ہے کہ مسلمانوں کو اسلام سے دور کرنے کی کیا تدبیر ہوسکتی ہے؟ اور کس طرح اس ملک سے اسلامی نقوش مٹائے جاسکتے ہیں؟ اس کے لئے بار بار اسپین کے دورے کئے گئے کہ وہاں سے کس طرح مسلمانوں کو بے نام ونشان کیا گیا، یہ عجیب بات ہے کہ اسپین اور ہندوستان میں مسلمانوں کا عہدِ حکومت قریب برابر ہے، اسپین میں مسلمان ۱۹/ جولائی ۷۱۱ء

کو فاتحانہ داخل ہوئے تھے اور ۳؍ جنوری ۱۴۹۲ء کو اسپین میں صدیوں سے درخشاں مسلمانوں کے اقتدار کا آفتاب غرناطہ کے ساحل پر ڈوب گیا اور اس طرح ۷۸۱ سال یعنی تقریباً ۸ صدی مسلمان اس ملک پر حکمراں رہے۔

ہندوستان میں محمد بن قاسم کا قافلہ ۷۱۲ء میں فاتحانہ داخل ہوا اور سب سے پہلے دیبل کا علاقہ فتح ہوا اور ۱۸۵۷ء میں دہلی میں مسلمانوں کے چراغ اقتدار نے آخری سانس لی ، اس طرح مجموعی اعتبار سے مسلمانوں کا عہد حکومت قریب ساڑھے گیارہ سو سال ہوتا ہے؛ لیکن متحدہ ہندوستان کے وسیع حصہ پر مسلم حکومت کا عرصہ یہی آٹھ ساڑھے آٹھ سو سال کا ہوگا ؛لیکن کیا وجہ ہے کہ اس ملک میں مسلمانوں کے اقتدار سے محروم رہنے کے بعد بھی اسلام آج پوری تب وتاب کے ساتھ درخشاں ہے؛ بلکہ اس صدی میں عالمگیر سطح پر جو مسلم تحریکات اٹھی ہیں، زیادہ تر ان کا سرچشمہ یہی کفرستان رہا ہے، گذشتہ سو ڈیڑھ سو سال میں ایسی عظیم الشان علمی ودعوتی شخصیتیں اس خطہ میں پیدا ہوئیں ،جنھوں نے نہ صرف برصغیر بلکہ پورے عالم اسلام پر اپنے اثرات ڈالے ہیں اور جن کی انقلاب آفریں تحریروں نے مشرق سے لے کر مغرب تک ہر دبستانِ علم سے خراج تحسین وصول کیا ہے۔

یہ یقیناً دینی مدارس کا اثر ہے، یہ مدارس ہی ہیں جہاں سے اُمت کو بہترین داعی ، تحریکات کے لئے باصلاحیت قائد، جماعتوں کے لئے مخلص رہنما، مخالفین اسلام کے مقابلہ کے لئے دندان شکن مناظر اور صاحب تحقیق قلم کار ملے ہیں، مولانا الیاس صاحبؒ کی تحریک دعوت وتبلیغ یہیں سے اُٹھی ، یہیں تحریک اسلامی کی نشو ونما ہوئی ، یہی سید احمد شہیدؒ کی تحریک خلافت کا مولد بھی ہے اور مشہد بھی ،مسلمانوں کی اجتماعیت کی حفاظت کے لئے امارت شرعی کے نظام کی بنیاد یہیں رکھی گئی ۔ قانون شریعت کی حفاظت اور اس پر استقامت کے لئے جو کوشش ہندوستان میں ہوئی اور وہ نتیجہ خیز بھی ہوئی، اس کی مثال پڑوس کے مسلم ملکوں میں بھی نہیں ملتی۔

پھر گذشتہ ڈیڑھ صدیوں میں جتنے فتنے اُٹھے ، ان کی سرکوبی کے لئے اول اول

ہندوستان ہی کے علماء میدانِ عمل میں اُترے، جب مغربی استعمار کے زیر سایہ عیسائیت کی تبلیغ کے لئے یورپ سے پادریوں کی فوج ایشیائی اور اسلامی ممالک میں داخل ہوئی تو اس کا سب سے مؤثر مقابلہ علماء ہند ہی نے کیا اور ایک ہندوستانی عالم نے شہرۂ آفاق عیسائی مناظر پادری فنڈر کا تعاقب مصر وترکی تک کیا اور ان کے ہاتھوں سے ''اظہار الحق'' جیسی زندہ جاوید کتاب منظر عام پر آئی، ہندوستان میں ہندو مذہب کے احیاء اور ہندومت کی تبلیغ کی سرگرم کوششیں در پردہ حکومت برطانیہ کی مدد سے شروع ہوئی اور آریہ سماجی تحریک ایک طوفان کی طرح ملک کے طول وعرض میں چھا گئی، اس کے مقابلہ کے لئے مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، مولانا محمد علی مونگیریؒ اور دوسرے علماء میدان عمل میں اترے اور انھوں نے اس تحتی براعظم میں مسلمانوں کے ایمان کی حفاظت کی۔

صلیبی جنگوں میں جب عیسائیوں نے کارزار جنگ میں ہزیمت اُٹھائی اور شکست کھائی تو انھوں نے فکر ونظر کا ایک نیا معرکہ چھیڑا، اور اسلام پر فکری یلغار کے لئے ایک ایسے تربیت یافتہ گروہ کو تیار کیا جو علوم اسلامی کو پوری گہرائی کے ساتھ پڑھے اور اپنی قوت مطالعہ اور ذہانت کو مسلمانوں کے ذہن میں شکوک وشبہات کے کانٹے بونے اور ان کو راہ حق سے منحرف کرنے میں صرف کرے، عین اس وقت جب مسلمان میدان جنگ میں شکست کھا رہے تھے، یہ گروہ مفتوح قوموں کی نفسیات سے فائدہ اُٹھا کر ان کی فکر پر حملہ زن تھا، اس تحریک کا سب سے مؤثر مقابلہ برصغیر کے اہل علم نے کیا، جن میں علامہ شبلیؒ، علامہ سید سلیمان ندویؒ، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ وغیرہ کے نام خاص طور پر لائق ذکر ہیں، ان حضرات نے مستشرقین کے اعتراضات کے رد وابطال پر جتنا مؤثر کام کیا ہے، عالم اسلام میں بھی کم ہی اس کی مثالیں مل سکیں گی، اسی استشراق کا اثر انکار حدیث کی صورت میں ظاہر ہوا اور خاص کر ہندوستان اور مصر میں کچھ ایسے مغرب زدہ لوگ پیدا ہوئے، جنھوں نے حدیث کی حجیت اور اہمیت کا اعلانیہ انکار کر دیا اور بہت سے جدید تعلیم یافتہ حضرات اس مفسد فکر سے متاثر ہوگئے، اس فتنہ کے مقابلہ کے لئے جو اہل علم اُٹھے، ان میں علماءِ ہند پیش پیش ہیں، ان کی تحریریں بہت

وقیع، علمی معیار پر مکمل اور مفید ثابت ہوئیں اور عالم عرب نے بھی ان سے فائدہ اُٹھایا، جن میں مولانا مناظر احسن گیلانیؒ، مولانا بدر عالم میرٹھیؒ، ڈاکٹر حمید اللہؒ وغیرہ کی تحریریں خاص طور پر نہایت ہی بصیرت افروز اور چشم کشا ہیں۔

سب سے بڑا فتنہ وہ تھا جو پنجاب کی سرزمین میں قادیان سے اُٹھا اور جس نے پیغمبر اسلام ﷺ کی نبوت پر حملہ کرنے کی کوشش کی، انگریز تو اس فتنہ کی شہ پر تھے ہی، بلکہ اصل میں تو یہ ان ہی کا لگایا ہوا درخت ہے؛ لیکن بہت سے دانش ور جیسے جواہر لال نہرو وغیرہ بھی اس طبع زاد نبوت سے ہمدردی رکھتے تھے، برصغیر کے علماء پوری طاقت اور علمی وقعت کے ساتھ اس فتنہ کے مقابلہ کے لئے اُٹھ کھڑے ہوئے اور اُمت پر اس دامِ ہم رنگ زمین کی حقیقت کھول کر رکھ دی، مولانا انوار اللہ شاہ صاحب حیدر آبادی، مولانا انور شاہ کشمیری اور ان کے تلامذہ، مولانا ثناء اللہ امرتسری اور پیر کرم علی شاہ وغیرہ نے اس سلسلہ میں جو خدمات انجام دی ہیں، اُمت اسلامیہ ہند کبھی اس سے سبک بار نہیں ہوسکتی۔

پھر ان مدارس سے کیسی کیسی شخصیتیں پیدا ہوئیں، مولانا رشید احمد گنگوہیؒ اور مولانا احمد رضا خاں صاحب جیسا فقیہ، شاہ نذیر حسینؒ، مولانا خلیل احمدؒ سہارنپوری، مولانا محمد زکریاؒ کاندھلوی اور عبداللہ شاہؒ محدث دکن جیسے محدثین، مولانا اشرف علی تھانویؒ جیسے مصلح، مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ جیسے بالغ نظر مفکر، مولانا ابوالکلام آزادؒ جیسے ذہین و بلند نگاہ خطیب اور نہ جانے کیسے کیسے اصحابِ فن اور داعیان دین متین۔

غور کیجئے! کہ گذشتہ ڈیڑھ سو سال میں ہندوستان سے جتنی مذہبی، قومی اور تعلیمی تحریکات شروع ہوئیں اور جو بھی حوصلہ مند، مخلص، اصلاحی اور انقلابی شخصیتیں پیدا ہوئیں، وہ براہ راست یا بالواسطہ دینی مدارس ہی کی دَین ہیں اور ان کی تعمیر میں ان مدارس کا خونِ جگر ضرور شامل ہے۔

یہ وہ حقیقت ہے جس کا ملک کے فرقہ پرست عناصر نے ادراک کرلیا ہے اور جس کی وجہ سے ان حضرات نے محسوس کرلیا ہے کہ جب تک یہ مدارس اور ان درس گاہوں سے پیدا

ہونے والے ''ملا'' اس ملک میں باقی رہیں گے، وہ مسلمانوں کے ایمان کا سودا ہرگز نہیں کرسکتے اور ان کا ہندوکرن کیا جانا ممکن نہیں، یہی چیز ہے جس نے حکومت اور فرقہ پرست جماعتوں کی ان امن پسند، وطن دوست اور انسانیت گر مدارس سے عناد پیدا کردیا ہے۔ان حالات میں ہم مسلمانوں کا فرض ہے کہ پوری قوت کے ساتھ ان سازشوں کا مقابلہ کریں اور مدارس کے نظام کو دل وجان سے تقویت پہنچائیں، کہ یہ کچھ ملاؤں کی پرورش کا ذریعہ نہیں؛ بلکہ آپ کے دین وایمان اور تہذیب وثقافت کی حفاظت کا سامان ہے!!

دینی مدارس، ان کے ذرائع آمدنی اور دہشت گردی

ایک حقیقت پسندانہ تجزیہ

اس وقت ملک میں دینی مدارس کے خلاف ماحول تیار کرنے کے کی پوری کوشش کی جارہی ہے، ایسی تنظیمیں جن پر ہزاروں مسلمانوں کا خون ہے اور جو کھلے عام اپنے کارکنوں کو آتشیں اسلحہ کی تربیت دے رہی ہیں، نیز اخبارات اور الکٹرانک ذرائع ابلاغ میں کھلے عام تلواروں اور ترشولوں سے لیس اور بندوقوں سے نشانہ لیتی ہوئی ان کارکنوں کی تصویریں آرہی ہیں، وہ دینی مدارس کو دہشت گردی کے مراکز قرار دینے میں کوئی حیاء محسوس نہیں کرتے اور حکومت اور اس کے ذمہ دارترین نمائندے نہایت ہی ڈھٹائی کے ساتھ ان الزامات کو دہرا رہے ہیں، حقائق کو جانے اور الزامات کی تحقیق کئے بغیر ایسی باتیں کرنا کم سے کم ذمہ دارانِ حکومت کو زیب نہیں دیتا؛ لیکن بدقسمتی سے حکومت مدعی اور جج کے دوہرے فرائض ادا کرنے کی کوشش کررہی ہے۔

مدارس کے بارے میں اس الزام کی حقیقت سمجھنے کے لئے چند پہلوؤں سے غور کرنے کی ضرورت ہے: تعلیمی مواد، ماحول اور واقعات وتجربات —— مدارس کے نصاب میں عام طور پر تین طرح کے مضامین شامل ہوتے ہیں، اول خالص اسلامی علوم، اس میں قرآن، حدیث، فقہ، عقیدہ، اسلام کے اُصولِ قانون اور تفسیر وحدیث سے متعلق اُصول وقواعد داخل ہیں، دوسرے عربی زبان سے متعلق علوم، اس سے عربی گرامر یعنی نحو وصرف، عربی ادب اور اُصولِ بلاغت مراد ہیں، تیسرے وہ مضامین جو انسان کی عام ضروریاتِ زندگی سے متعلق ہیں، ان میں منطق، فلسفہ، حساب، انگریزی، تاریخ اور مقامی زبان وغیرہ مضامین پڑھائے

جاتے ہیں، ان میں سے دوسری اور تیسری قسم کا مواد زبان وادب یا عام عملی زندگی سے متعلق ہے۔

خالص اسلامی علوم سے متعلق جو کچھ پڑھایا جاتا ہے اسی سے ذہن وفکر کی تعمیر اور عمل کی تحریک متعلق ہے، پھر اسلامی علوم میں اُصولِ قانون، اُصولِ حدیث اور اُصولِ تفسیر بجائے خود مقصود نہیں؛ بلکہ ان سے وہ قواعد وضوابط معلوم ہوتے ہیں جن کی روشنی میں قرآن کی تفسیر اور حدیث کی تشریح کی جاتی ہے، حدیث نقل کرنے والوں کو پرکھا جاتا ہے، قرآن وحدیث سے اعتقادات اور عملی زندگی کے احکام کس طور سے مستنبط کئے جاتے ہیں؟ ان پر بحث کی جاتی ہے، گویا یہ علوم قرآن وحدیث اور فقہ وعقیدہ کے لئے وسائل وذرائع اور کلید کا درجہ رکھتے ہیں، اس لئے ان علوم کا تعلق بھی سماجی زندگی میں انسان کے رویہ اور طریقۂ کار سے نہیں ہے، اب جو چار مضامین باقی رہ گئے، ان میں قرآن وحدیث اصل ہیں اور فقہ وعقیدہ اس کا نتیجہ اور اس سے مستنبط مسائل، عقیدہ سے مراد وہ باتیں ہیں جن کا تعلق انسان کے قلب وضمیر سے ہو اور جس کے ماننے پر کسی شخص کا مسلمان ہونا موقوف ہو، اعضاء وجوارح سے اس کا تعلق نہ ہو، اللہ ایک ہے، اللہ ہی نے کائنات کی اس بستی کو بسایا اور تمام مخلوقات کو پیدا فرمایا ہے، اس نے انسان کی ہدایت اور رہبری کے لئے ہر عہد، ہر علاقہ اور ہر زبان میں اپنے رسول اور دوست کو کتاب ہدایت دے کر بھیجا ہے، انسان نے وقتاً فوقتاً اس میں اپنی طرف سے ملاوٹیں کر دی ہیں، اس طرح اس کتاب ہدایت کا آخری ایڈیشن سرزمین عرب میں محمد رسول اللہ ﷺ پر قرآن مجید کی شکل میں نازل ہوا، اس لئے قرآن اللہ کی آخری کتاب اور محمد ﷺ اللہ کے آخری رسول ہیں۔

انسان کو دنیا میں نیکی کا حکم دیا گیا ہے، برائی سے روکا گیا ہے، گویا وہ امتحان کی حالت میں ہے؛ اس لئے ایک دن یہ دنیا ختم کر دی جائے گی اور آخرت کا نظام قائم ہوگا، جس میں تمام انسانوں کو بے کم وکاست اس کی اچھائی اور برائی پر جزاء وسزاء دی جائے گی — توحید، رسالت اور آخرت یہ تینوں باتیں اسلامی عقیدہ کی بنیاد اور اساس ہیں، غور کیجئے کہ اس میں کون سی بات انسان کو تشدد پر اُکسانے والی ہے، بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ آخرت میں جواب دہی کا احساس ایسی بات ہے جو انسان کو ظلم وزیادتی اور دہشت گردی سے روکتی ہے اور پابند قانون

شہری بناتی ہے۔

''فقہ'' سے مراد وہ احکام ہیں، جو انسان کی عملی زندگی سے متعلق ہوں، ان کو پانچ حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے، اول عبادات یعنی وہ افعال جو بندہ اور خدا کے تعلق کو ظاہر کرتے ہیں، جیسے نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، قربانی، دوسرے پرسنل لاء سے متعلق قوانین، جن کو آج کل ''احوال شخصیہ'' اور فقہاء اسلام کی قدیم اصطلاح میں ''مناکحات'' کہا جاتا ہے، اس عنوان کے تحت وہ حقوق وفرائض آتے ہیں جو قرابت داری کی بناء پر ایک دوسرے سے متعلق ہوتے ہیں، نکاح، طلاق وتفریق، مہر، عدت، ثبوتِ نسب، والدین، اولاد اور بیوی کا نفقہ، میراث اور وصیت وغیرہ احوال شخصیہ میں شامل ہیں، تیسری قسم ان قوانین کی ہے جو مالی لین دین سے متعلق ہیں جیسے خرید وفروخت، آجر اور مزدور، مالک اور کرایہ دار کے احکام، ہبہ، قرض وغیرہ ان قوانین کو ''معاملات'' کہتے ہیں، چوتھے ملک کے انتظامی قوانین ہیں، اس شعبہ میں امیر کا انتخاب، عدلیہ کی تشکیل، جرائم پر سزائیں اور امن وامان قائم رکھنے کی تدبیریں وغیرہ سے متعلق احکام ذکر کئے جاتے ہیں، ان قوانین کا تعلق مسلم حکومتوں سے ہے، عام مسلمانوں سے ان کا تعلق نہیں، پانچویں امن وجنگ اور قومی تعلقات سے متعلق قوانین ہیں، اس قانون کی روح بقاء باہم کا اُصول ہے کہ جہاں تک ممکن ہو، جنگ سے گریز کیا جائے، امن وآشتی قائم رکھی جائے اور صلح کی فضاء بنائی جائے اور ہر صورت میں انسانی جان ومال اور عزت وآبرو کے احترام کو ملحوظ رکھا جائے، قانون کا یہ چوتھا اور پانچواں شعبہ ایسا ہے کہ خود فقہاء نے صراحت کی ہے کہ اس کا تعلق مسلمان حکومتوں سے ہے، نہ کہ عام مسلمانوں سے، عام مسلمانوں کو ہرگز اس بات کا حق نہیں کہ وہ ان قوانین کو اپنے ہاتھ میں لے لیں کہ اس طرح لاقانونیت کا مزاج پیدا ہوجائے گا —— پھر احکام فقہیہ کی تفصیل بھی اس ترتیب سے ملتی ہے، سب سے زیادہ عبادات، پھر احوال شخصیہ اور معاملات اور ان سے کم انتظام ملکی اور تعلقات بین ملکی سے متعلق قوانین، ان میں کہیں دہشت گردی کے مضمون کے لئے کوئی گنجائش ہی نہیں، دہشت گردی لاقانونیت ہے اور فقہ اسلامی خلوت سے جلوت اور نجی زندگی سے سماجی اور قومی زندگی تک ہر مرحلہ پر مسلمانوں کو

پابند قانون شہری اور امن پسند انسان بناتی ہے۔

جیسا کہ عرض کیا گیا فقہ وعقیدہ کا اصل سرچشمہ قرآن وحدیث ہے، قرآن اللہ کی بھیجی ہوئی کتاب ہے اور حدیث محمد رسول اللہ ﷺ کے فرمودات اور معمولات ہیں، قرآن کی ابتداء 'بسم اللہ الرحمٰن الرحیم' سے ہوتی ہے، جس کے معنی ہیں، اس اللہ کے نام سے جو بہت مہربان اور نہایت رحم کرنے والا ہے، گویا قرآن کا آغاز ہی رحمتوں اور مہربانیوں کے ذکر سے ہوتا ہے، جو اُمت مہربان اور رحم دل خدا کی پرستار ہوگی، ضرور ہے کہ وہ خود بھی جذبۂ رحم سے معمور ہو، خدا کی ایسی تصویر کہ اس کے ہاتھوں میں تلوار اور نیزہ ہے، منہ سے آگ کے انگارے نکل رہے ہیں، اس کے بال پھن مارتے ہوئے زہریلے سانپ سے آراستہ ہیں اور وہ خود منہ کھولے ہوئے شیر پر براجمان ہے، خدا کی یہ تصویر صحیح ہے یا غلط؟ اس سے قطع نظر ایسے خدا پر یقین سے انسان میں وحشت پیدا ہوتی ہے اور طاقت کے فلسفہ پر اس کا یقین قائم ہوجاتا ہے، قرآن ایک ایسے خدا کا تصور پیش کرتا ہے جو شفقت ورحمت کے اتھاہ جذبات رکھتا ہو۔

پھر قرآن کی پہلی سورت 'سورۂ فاتحہ' ہے، یہ سات مختصر آیتوں پر مشتمل ہے، جس میں خالق کائنات کی تعریف بھی ہے، جس میں بندہ اور خدا کے تعلق کو ظاہر کیا گیا ہے اور اخیر میں خدا سے دُعاء مانگی گئی ہے، اس سورت کی پہلی تین آیتوں کا ترجمہ اس طرح ہے :

تمام تعریفیں اللہ کے لئے ہیں، جو تمام عالموں کا پالنے والا ہے،

بہت مہربان اور نہایت رحم کرنے والا ہے، بدلہ کے دن کا مالک ہے۔

غور کریں کہ پہلی آیت میں خدا کے رب العالمین یعنی تمام عالم کا رب ہونے کا ذکر کیا گیا ہے اور اس طرح انسانی اخوت کا پیغام دیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کے رشتہ سے تمام انسان بھائی بھائی اور گویا ایک ہی کنبہ کے افراد ہیں، دوسری آیت میں خدا کے مہربان اور رحم دل ہونے کی بات کہہ کر بتایا گیا ہے کہ رحم دلی اور درگذر ایک قابل تعریف وصف ہے، تیسری آیت میں آخرت کی جواب دہی کے احساس کو اُبھارا گیا ہے، جس سے انسان میں قانون کی

اتباع کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اور غیر آئینی طریقۂ کار سے بچنے کا خیال؛ کیوں کہ وہ سمجھتا ہے کہ اگر انسان اپنے جرم کو دنیا کی آنکھوں سے چھپالے تب بھی آخرت کی پکڑ سے اپنے آپ کو نہیں بچاسکتا، یہ تمام نکات وہ ہیں، جو انسان کو دہشت گردی سے بچاتے ہیں، نہ کہ دہشت گردی میں مبتلا کرتے ہیں۔

دہشت گردی کے عام طور پر تین عوامل ہوتے ہیں: نسلی، مذہبی اور معاشی، جب کوئی ایک گروہ نسلی اعتبار سے اپنے آپ کو اونچا اور دوسروں کو نیچا سمجھنے لگتا ہے تو اس سے حقیر سمجھے جانے والے لوگوں میں محرومی کا احساس پیدا ہوجاتا ہے، اسلام نے اس کا یہ علاج کیا ہے کہ جیسے اس نے خدا کے ایک ہونے کا اعلان کیا، اسی طرح تمام انسانیت کی وحدت کو بھی پوری قوت کے ساتھ بیان فرمایا، قرآن کہتا ہے :

يَا اَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَّاحِدَةٍ ۔(النساء:۱)

اے لوگو! اپنے رب سے ڈرو، جس نے تم سب کو ایک ہی جان سے پیدا کیا ہے۔

پس، قرآن پوری انسانیت کو ایک کنبہ اور ایک خاندان قرار دیتا ہے، رسول اللہ ﷺ کی احادیث نے اس کو اور زیادہ واضح کیا ہے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ کسی عرب کو غیر عرب پر اور گورے کو کالے پر محض رنگ وخون کی بنیاد پر کوئی فضیلت حاصل نہیں، اس طرح گویا نسلی جارحیت اور اس کی بنیاد پر پیدا ہوجانے والی دہشت گردی کی جڑ ہی کاٹ دی گئی، مذہب کے معاملہ میں قرآن کا نقطۂ نظر بالکل واضح ہے کہ اس میں کسی بھی طرح کا جبر واکراہ نہیں :

لَا اِكْرَاهَ فِىْ الدِّيْنِ قَدْ تَبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۔ (البقرۃ: ۲۵۶)

پیغمبر اسلام ﷺ نے بھی اپنی عملی زندگی میں قرآن کے اس اُصول کو برت کر دکھایا، مدینہ میں یہودی عددی اعتبار سے معمولی درجہ کی اقلیت تھے، آپ ﷺ نے ان پر اسلام کی دعوت پیش کی؛ لیکن کبھی ان پر کوئی جبر روا نہیں رکھا، ان کی بار بار کی بدعہدیوں کے باوجود ان کی

عبادت گاہ اور تعلیمی نظام وغیرہ میں کوئی مداخلت نہیں کی، ان کو اپنے پرسنل لاء پر عمل کرنے کی پوری آزادی رہی، مکہ فتح ہونے کے بعد مشرکین مکہ اور ان کے سردار پوری طرح مسلمانوں کے قابو میں تھے لیکن آپ نے عام معافی کا اعلان فرمادیا اور کسی کو مسلمان ہونے پر مجبور نہیں کیا، مذہبی آزادی کا اسلام میں اس قدر پاس ولحاظ ہے کہ اگر کسی مذہب میں ماں اور بہن سے نکاح کی اجازت ہو اور وہ مسلمان حکومت میں رہتا ہو، تب بھی حکومت کو اس کے مذہبی معاملات میں مداخلت کی اجازت نہیں، مسلمانوں کے لئے شراب حرام ہے اور مسلمانوں کے لئے اس کی خرید وفروخت بھی حرام ہے؛ لیکن مسلمان ملک میں جو غیر مسلم رہتے ہوں اگر ان کے مذہب میں شراب ممنوع نہ ہو تو انھیں اپنے ہم مذہب لوگوں سے شراب بیچنے کی اجازت ہے، اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ دوسرے مذاہب کے ساتھ مسلمانوں کو کس قدر مذہبی رواداری اور درگذر کی تعلیم دی گئی ہے، جو مذہب اپنے زیر حکومت رہنے والوں کے ساتھ اس فراخ دلی کا رویہ سکھاتا ہو، وہ کیا مسلمان اقلیت کو غیر مسلم اکثریت کے ساتھ مذہب کے معاملہ میں جبر وتشدد کی تعلیم دے سکتا ہے؟

انسان پر وہ ماحول بھی گہرا اثر ڈالتا ہے، جس میں اس کی تربیت ہوتی ہے، جیسے گرم ماحول چیزوں کو گرم اور سرد ماحول چیزوں کو سرد کردیتا ہے، اسی طرح انسان کے اخلاق وعادات اور اس کے مزاج ومذاق پر بھی ماحول کا گہرا اثر ہوتا ہے، جو شخص راہزنوں اور لٹیروں کے درمیان رہتا ہے اور ہر وقت لاٹھی، تلوار، خنجر، بھالے اور بندوق، رائفل دیکھنے کا عادی ہو تو اگر وہ خود تشدد نہ کرے تو کم سے کم تشدد کو دیکھنے کی صلاحیت اس میں پیدا ہوجاتی ہے اور جو شخص بااخلاق، وضع دار، نرم خو اور انسانیت دوست لوگوں کے درمیان زندگی گذارتا ہو، ممکن نہیں کہ وہ نرم خوئی، شرافت سے کوئی حصہ نہ پائے، اس کی زبان، چال، ڈھال، طرزِ تخاطب، طبیعت میں رچاؤ اور رکھ رکھاؤ سے وہ بخوبی پہچانا جاتا ہے، اس لئے کسی کی شخصیت اور مزاج کے مطالعہ کے لئے اس کی بھی بڑی اہمیت ہے کہ کس ماحول میں اس کی نشو ونما ہوئی ہے۔

دینی مدارس کے ماحول کو ہمیں اس نقطۂ نظر سے بھی دیکھنا چاہئے، درس گاہوں میں

انحراف اور طلبہ میں بغاوت کے جو محرکات پائے جاتے ہیں، اگر تجزیہ کریں تو وہ بنیادی طور پر تین ہیں، ایک تو سیاسی جماعتوں کی طلبہ تنظیمیں، دوسرے اساتذہ وطلباء کے درمیان محاذ آرائی اور مخاصمانہ جذبات، تیسرے لڑکوں اور لڑکیوں کا اختلاط—آج کل تمام بڑی درس گاہوں میں طلباء کی یونین قائم ہیں، یہ تعمیری کام تو برائے نام کرتی ہیں؛ لیکن ان کے اشارہ پر تخریب اور فساد کا ماحول زیادہ پیدا ہوتا ہے، نوجوانی کی عمر بغاوت کی عمر ہے، اجتماعیت اور آزادی اس جذبۂ بغاوت کو دوآتشہ کردیتی ہے، اس کے نتیجہ میں ہڑتال، احتجاج، جلسہ جلوس کالجوں یونیورسٹیوں میں روزمرہ کا معمول بن گیا ہے۔

ہندوستان کی جنگِ آزادی کے موقع سے ایک وقتی ضرورت کے تحت جنگِ آزادی کے قائدین اس بات پر مجبور ہوئے کہ یونیورسٹیوں اور کالجوں کے طلباء کو آزادی کی لڑائی میں شریک کیا جائے، کیوں کہ نوجوان نسل کے گرم خون کے بغیر کوئی انقلابی تحریک کامیابی سے ہم کنار نہیں ہوتی، اس میں شبہ نہیں کہ طلباء کی شمولیت کی وجہ سے اس تحریک کو بڑی قوت حاصل ہوئی؛ لیکن اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ سیاسی ہنگامہ آرائی اور پر تشدد احتجاج ہماری تعلیم گاہوں کے مزاج میں داخل ہوگیا، تعلیم وتحقیق کا کام یکسوئی اور ایک طرح کی عزلت گزینی اور خلوت نشینی کو چاہتا ہے، جب کہ سیاسی مہم جوئی، دوڑ دھوپ اور تگ ودو کی متقاضی ہوتی ہے، اس لئے تعلیم گاہوں میں سیاسی مزاج ومذاق کا داخل ہوجانا تعلیمی ماحول کے لئے فائدہ مند سے زیادہ نقصان دہ ہے۔

آزادی کے بعد مزید ستم یہ ہوا کہ سیاسی طالع آزماؤں نے اپنی اپنی جماعتوں میں اسٹوڈنٹس ونگ قائم کئے، اس وقت اکثر یونیورسٹیوں میں دائیں اور بائیں بازو کی فکر کے حامل طلباء کے گروپ موجود ہیں اور یونین کے الیکشن میں پبلی سٹی، کنونسنگ کے علاوہ تشدد، مار دھاڑ اور قتل واغواء وغیرہ کے واقعات اسی طرح پیش آتے ہیں، جیسا کہ اسمبلی اور پارلیمنٹ کے الیکشن میں، یہ ملک کے بہی خواہوں کے لئے ایک لمحہ فکریہ ہے۔

دینی مدارس اب تک بحمداللہ ایسی تحریکات سے پاک ہیں، عام طور پر ان مدارس میں

طلباء کی یونین قائم نہیں ہے، کچھ چھوٹی موٹی انجمنیں محض تقریر وتحریر کی مشق کے لئے مدارس میں ہوتی ہیں، جن کی باگ ڈور انتظامیہ اور اساتذہ کے ہاتھوں میں ہوتی ہے، یہ انجمنیں ہفتہ وار تقریر وتحریر کے پروگرام منعقد کرتی ہیں، انجمن کے تحت مختلف گروپ بنا دیئے جاتے ہیں، جو دس بارہ طلبہ پر مشتمل ہوتا ہے، یہ اخلاقی موضوعات پر تقریروں کی مشق کرتے ہیں، یا چند صفحات کے مضامین لکھتے ہیں، نماز روزہ، حج، زکوٰۃ، قربانی، والدین کے حقوق، عورتوں کے حقوق، استاذ کے حقوق، قرآن مجید کی عظمت، پیغمبر اسلام ﷺ کی سیرت، علم کی اہمیت، اتحاد واتفاق اور خدمت خلق، عام طور پر ان ہی موضوعات پر تقریریں اور تحریریں لکھی جاتی ہیں، نہ مختلف افکار کی ترجمانی کرنے والے طلباء کے گروپ، نہ الیکشن کی مہم جوئیاں، نہ احتجاجی جلسے اور ریلیاں، اس لئے ان میں تعمیری رجحان پنپتا ہے نہ کہ تخریبی۔

اس وقت عصری درس گاہوں میں صورتِ حال یہ ہے کہ انتظامیہ اساتذہ اور طلباء کے درمیان ایک طرح کی مقابلہ آرائی کی فضاء ہے، اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ تعلیم وتعلم کے پیشہ سے تقدس جاتا رہا اور خود غرضی نے اس کی جگہ لے لی، اساتذہ کسبِ زر کے لئے پڑھاتے ہیں ، یہ کہتے ہوئے شرم آتی ہے کہ بہت سی دفعہ ایم ،فل اور پی ، ایچ ، ڈی کی ڈگریوں کو منظور کرنے کے لئے بیش قیمت تحائف یا رقوم کا مطالبہ کیا جاتا ہے، غیر حاضری اور دیر حاضری عام ہے، نصاب نامکمل ہوتا ہے اور ایسی تدابیر اختیار کی جاتی ہیں کہ طلبہ ٹیوشن پڑھنے پر مجبور ہو جائیں، انتظامیہ اساتذہ کی تقرری اور طلباء کے مسائل کو حل کرنے میں رشوت حاصل کرتی ہے، گویا کسبِ معاش کا ایک کاروبار ہے، جس میں ہر شخص جائز اور ناجائز طور پر زیادہ سے زیادہ سیم وزر کے حصول کے لئے بے چین ہے، ایسے خود غرضانہ ماحول میں احترام وتقدس کی فضاء کیسے باقی رہ سکتی ہے؟ نہ انتظامیہ میں اساتذہ وطلبہ کی ہمدردی وبہی خواہی ہے، نہ اساتذہ میں فرض شناسی اور طلبہ کے ساتھ شفقت ومحبت ہے، نہ طلبہ میں اساتذہ کے تئیں احترام وعقیدت کے جذبات ہیں، ایسا نہیں کہ تعلیم گاہوں میں سارے ہی لوگ ایسے ہیں؛ لیکن کوئی حقیقت پسند اور حقیقت آگاہ اس بات سے انکار نہیں کرسکتا کہ ایک قابل لحاظ تعداد ایسے لوگوں کی موجود ہے۔

دینی مدارس کا ماحول اس لحاظ سے نہ صرف غنیمت ہے؛ بلکہ ایک قابل تقلید نمونہ ہے، انتظامیہ کا حال یہ ہے کہ وہ در در پہنچ کر اپنے طلبہ کے لئے چندے جمع کرتے ہیں، اگر یہ کہا جائے کہ وہ پیسے پیسے بھیگ مانگ کر اساتذہ وطلباء کی ضرورت پوری کرتے ہیں تو بے جا نہ ہو، خود ان کی تنخواہیں معمولی ہوتی ہیں، گو اس معاملہ میں اب کسی قدر بے اعتدالی ہونے لگی ہے؛ لیکن مدارس کے منتظمین کی اکثریت آج بھی متوسط سے کم درجہ کی زندگی گذارتی ہے، بعض مثالیں تو ایسی بھی ملتی ہیں کہ ان کی کوششوں سے مدرسہ کی ایسی پر شکوہ اور راحت رساں عمارتیں بن گئیں جو نگاہوں کو خیرہ کرتی ہیں؛ لیکن خود ان کی زندگی آج بھی خس پوش مکانوں میں گذرتی رہی اور وہ دنیا سے اس حال میں گئے کہ ان کے ورثہ کے حصہ میں پانچ ہزار روپئے بھی نہ آسکے۔

اساتذہ کا معاملہ تو اس سے بھی زیادہ قابل رشک ہے، ایسی بے شمار مثالیں ملیں گی کہ ایک عالم چالیس، چالیس سال سے درس دے رہا ہے، اس کی زبان پر علم بولتا ہے، اسی خدمت میں اس کے بال سفید ہوگئے اور اس کی ہڈیوں کے گودے پگھل گئے؛ لیکن اس کی تنخواہ سرکاری محکموں کے چپراسی سے بھی کم ہے، اس کے باوجود نہ زبان پر شکوہ وشکایت ہے، نہ دل میں حرص وطمع ہے، نہ دوسروں کی دولت وثروت کو دیکھ کر اس کی آنکھیں چمکتی ہیں، ان کے سینے طلبہ پر شفقت ومحبت کے جذبات سے معمور ہیں اور دین کی اس خدمت پر اللہ کے شکر وسپاس سے ہر بُن مو لبریز ہے، طلبہ سے کچھ لینے کا سوال ہی نہیں؛ بلکہ ان مدارس میں طلباء کی اکثریت اس لائق ہی نہیں ہوتی کہ وہ کچھ پیش کرسکے؛ بلکہ اکثر اوقات یہی اساتذہ اپنی قلیل تنخواہوں میں سے حسبِ توفیق ان غریب لڑکوں پر کچھ خرچ کرتے رہتے ہیں اور ان کے تعاون کے لئے کوشاں رہتے ہیں، عام طور پر مدرسہ کے اُصول کے مطابق اساتذہ کی ڈیوٹی چھ گھنٹہ کی ہوتی ہے؛ لیکن کم سے کم سال کے آخری تین مہینوں میں اونچے درجہ کے اساتذہ دس دس گھنٹے پڑھاتے ہیں، کیوں کہ مقررہ نصاب کے اعتبار سے وقت کم ہے اور اس لئے خارجی اوقات میں پڑھا کر اس نصاب کو پورا کیا جاتا ہے، تاکہ طلبہ کا نقصان نہ ہو۔

طلبہ کو اساتذہ سے جو محبت ہوتی ہے اور اساتذہ و منتظمین کا جو احترام وہ کرتے ہیں،

ایسے احترام کی مثال شاید ہی مل سکے، یہ ایک حقیقت ہے کہ بال بچے اپنے ماں باپ کا بھی نہ اس درجہ احترام کرتے ہیں اور نہ ایسی والہانہ خدمت، خدمت اور احترام کا یہ جذبہ مدارس کے طلباء میں نسلاً بعد نسل گویا میراث کے طور پر چلا آرہا ہے، رسول اللہ ﷺ اس اُمت کے معلم اول تھے، قرآن نے سب سے زیادہ آپ ﷺ کی جس حیثیت کو ذکر کیا ہے، وہ یہی معلم ہونے کی حیثیت ہے، صحابہ آپ کا اس طرح احترام کرتے کہ جب آپ کوئی گفتگو کرتے، تو کمال توجہ کی وجہ سے ایسا لگتا کہ ان کے سروں پر پرندے بیٹھے ہوئے ہیں، یہی حال بعد کے ادوار میں رہا، امام ابوحنیفہؒ اپنے استاذ حماد کے گھر کی طرف پاؤں پھیلانے سے بھی گریز کرتے، مدارس میں محبت واحترام اور خدمت واکرام کی یہ روایت بڑی حد تک اب بھی باقی ہے؛ کیوں کہ طلبہ گویا اس بات کا عقیدہ رکھتے ہیں کہ استاذ کی ناراضگی کے ساتھ ان کا علم بافیض نہیں ہوسکتا۔

اس لئے دینی مدارس کی فضاء نہایت ہم آہنگی کی فضاء ہوتی ہے، اس میں خودغرضی کے بجائے ایثار و بے غرضی، رشوت کے بجائے اعانت، قانونی تعلق کے بجائے روحانی تعلق، فکر معدہ کے بجائے فکر معاد اور خدمتِ نفس کے بجائے خدمت دین کا جذبہ کارفرما ہوتا ہے اور ایک خاص اسپرٹ کے تحت کام کرنے کی وجہ سے ان کو حالات کی تلخ کامیوں میں حلاوت اور کلفتوں میں راحت کا احساس ہوتا ہے۔

جہاں تعلیم گاہ کے ان تینوں عناصر انتظامیہ، اساتذہ اور طلباء کے درمیان تصادم، ٹکراؤ اور منافست کی کیفیت ہوگی، وہاں اختلاف وتشدد کا ذہن پروان چڑھے گا اور تخریب ودہشت گردی کا مزاج پیدا ہوگا، یہی وجہ ہے کہ آج نکسلائٹ تحریک میں بہت بڑی تعداد تعلیم یافتہ نوجوانوں کی ہے، جہاں ان تینوں طبقوں کے درمیان ہم آہنگی، ایثار اور محبت کی فضاء ہوگی، وہاں امن وسلامتی اور انسانیت نوازی کا مزاج پیدا ہوگا؛ اسی لئے دینی درس گاہوں کے فضلاء ایسی تشدد آمیز تحریکوں میں نہیں دیکھے جاتے کہ ان کی تعلیم ہی ہم آہنگی اور ایثار کے ماحول میں ہوئی ہے۔

لڑکوں اور لڑکیوں کے اختلاط کا ماحول بھی بعض اوقات مجرمانہ سوچ کو جنم دیتا ہے

اور بعض مفسد لوگ اپنی ہوسِ نفس کو پورا کرنے کے لئے اغواء اور تشدد کا راستہ اختیار کرتے ہیں ، جب ایک دفعہ انسان تشدد اور لاقانونیت کی وادی میں قدم رکھ دیتا ہے، تو پھر بعض اوقات اس راہ میں آگے بڑھتا چلا جاتا ہے، جہاں نوجوان لڑکے اور لڑکیاں ایک جگہ ہوں اور لڑکیوں کے لئے اپنے گیسو، بازو اور ٹانگوں کو کھلا رکھنا درس گاہی ثقافت کا ایک حصہ بن گیا ہو، وہاں جسارت انگیز طبیعتوں کا مشتعل ہوجانا چنداں عجیب نہیں ؛ چنانچہ ہمارے ملک میں کالجوں اور یونیورسٹیوں میں طلبہ اور طالبات کے درمیان غیر قانونی تعلق ، اغواء ، زنا بالجبر اور بعض دفعہ آبرو ریزی کے ساتھ قتل کے کتنے ہی واقعات پیش آتے رہتے ہیں ، ان سب سے مزاج میں تشدد اور جرم کی طرف میلان اور منصوبہ بندی کے ساتھ زبردستی اپنی ہر خواہش کی تکمیل کا ذہن بنتا ہے، یہی دہشت گری کی اصل اور اس کی بنیاد ہے۔

دینی مدارس میں بحمد اللہ اب تک مخلوط تعلیم کا تصور نہیں ، لڑکوں کی تعلیم گاہیں الگ ہیں ، لڑکیوں کے مدارس الگ ہیں ، لڑکیوں کے مدارس میں معلمات پڑھاتی ہیں ، یا پردہ کے پورے اہتمام کے ساتھ مرد اساتذہ درس دیتے ہیں ، اسی لئے دینی مدارس کے طلباء یا فضلاء کی طرف سے اغواء یا اس طرح کے جرائم کی شاید ہی کوئی مثال مل سکے گی — غرض جو منفی اسباب درس گاہوں میں تشدد کی پرورش کرتے ہیں اور ان کی وجہ سے انجام کار بعض لوگ دہشت گردی کا راستہ اختیار کر لیتے ہیں ، بحمد اللہ دینی مدارس ایسی باتوں سے پاک وصاف ہیں۔

اب ایک نظر ان مدارس کے روز مرہ کے ماحول اور معمولات پر بھی ڈالئے کہ ان ہی معمولات سے انسان کے فکر وعمل کا سانچہ تیار ہوتا ہے اور اس کے سلوک واخلاق کی عمارت بنتی ہے، ان مدارس کا عام معمول یہ ہے کہ صبح سے ایک ڈیڑھ گھنٹہ پہلے اساتذہ وطلبہ بیدار ہوتے ہیں ، عام طلبہ بھی اور خاص کر قرآن مجید حفظ کرنے والے طلبہ تلاوتِ قرآن میں مشغول ہوجاتے ہیں اور بہت سے اہل توفیق رات کی اس تنہائی میں خدا کی چوکھٹ پر سجدہ ریز ہونے اور تہجد ادا کرنے کی سعادت بھی حاصل کرتے ہیں ، پھر صبح ہوتے ہی صبح سویرے سناٹے میں مؤذن کا نغمۂ توحید رس گھولتا ہے اور دوگانہ سنت ادا کرنے کے بعد فجر کی نماز ادا کی جاتی ہے،

نماز فجر کے بعد مختلف مدارس کے نظام الاوقات کے لحاظ سے گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ تمام ہی طلبہ قرآن مجید کی تلاوت کرتے ہیں، پھر ناشتہ کیا جاتا ہے اور ناشتہ کے بعد اسباق شروع ہوجاتے ہیں۔

اسباق کا یہ سلسلہ دوپہر تک چلتا ہے، پھر دوپہر کا کھانا اور کھانے کے بعد گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ قیلولہ واستراحت، قریب دو بجے دن ظہر کی اذان ہوتی ہے، طلبہ بیدار کئے جاتے ہیں اور اساتذہ وطلبہ وضو کر کے مسجد میں نماز ظہر ادا کرتے ہیں، ظہر کے بعد سے سہ پہر یعنی پانچ، ساڑھے پانچ بجے شام تک پھر اسباق کا سلسلہ جاری رہتا ہے، اس کے بعد عصر کی نماز پڑھی جاتی ہے، عصر اور غروب آفتاب کے درمیان موسم کے فرق کے ساتھ ایک گھنٹہ سے ڈیڑھ دو گھنٹہ کا وقفہ ملتا ہے، اس وقفہ میں کچھ لوگ چہل قدمی کرتے ہیں، کچھ لوگ اپنی روزمرہ کی ضروریات کے لئے بازار جاتے ہیں اور کچھ فٹ بال یا والی بال وغیرہ کھیلتے ہیں۔

ابھی سورج اپنی آنکھیں موندنے کے لئے تیاری کر رہا ہوتا ہے کہ اساتذہ اور طلبہ بارگاہِ خداوندی میں حاضری کے لئے وضو کرتے ہیں، اِدھر سورج نے اپنی کرنوں کو سمیٹا، اُدھر مؤذن نے صدا لگائی اور سب نے نماز مغرب ادا کی، نماز کے بعد حسب توفیق سنت ونفل پڑھی، مغرب کے بعد ڈیڑھ تا دو گھنٹہ طلبہ اپنے اسباق کا مذاکرہ کرتے ہیں، مذاکرہ کی صورت یہ ہوتی ہے کہ جماعت کا ذہین طالب علم استاذ کے پڑھائے ہوئے سبق کو دوہراتا ہے اور دوسرے طلبہ اس سے استفادہ کرتے ہیں، اساتذہ اس وقت آئندہ اسباق کے لئے مطالعہ میں مشغول ہوتے ہیں، پھر عشاء کی اذان ہوئی، نماز ادا کی گئی اور کھانے کا دسترخوان بچھا، سب نے کھانا کھایا، کھانے کے بعد پندرہ بیس منٹ چہل قدمی اور دوسری ضروریات کے لئے وقفہ دیا گیا اور پھر اساتذہ وطلبہ آئندہ دن کے اسباق کے مطالعہ میں مصروف ہوگئے، اپنی اپنی قوت برداشت کے اعتبار سے گیارہ سے بارہ اور بعض حوصلہ مندرات کے ایک ڈیڑھ بجے اللہ کا ذکر کرتے ہوئے محوخواب ہوگئے۔

یہ ہے ان مدارس کے روزمرہ کا معمول، رہائش کے کمرے معمولی، اکثر مدارس میں طلبہ فرش خاک ہی پر اپنا بستر بچھا لیتے ہیں، بعض مدارس؛ بلکہ بہت سے مدارس میں تو درس

گاہوں کے لئے بھی علاحدہ عمارت نہیں ہے اور رہائشی کمروں میں ہی اوقات درس میں اسباق بھی پڑھائے جاتے ہیں ، مدارس میں ان غریب طلبہ کے لئے عوامی تعاون سے کھانے اور دوسری ضروریات کا نظم کیا جاتا ہے، یہ کھانے اوسط سے کم درجہ کے ہوتے ہیں، یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ان مدارس میں ایک بہت بڑی تعداد ایسے خاندانی پس منظر رکھنے والے طلبہ کی ہوتی ہے، جو خطِ غربت سے نیچے زندگی گذار رہے ہوتے ہیں۔

یہ ماحول طلبہ میں تواضع ،مسکنت ،قناعت ، ایثار واخوت ،اوقات کی پابندی، اللہ پر توکل اور بھروسہ کی زندگی گذارنے کا مزاج پیدا کرتا ہے، زیادہ سے زیادہ دولت اور عہدۂ وجاہ کی حرص کو کم کرتا ہے، کہ یہی حرص وہوس انسان کو تشدد ودہشت گردی کے راستہ پر لے جاتی ہے،کوئی صاحبِ انصاف دیکھے کہ یہ ماحول انسان کو دہشت گرد بنائے گا یا امن وآشتی کا پیغمبر اور انسانیت کا علمبردار؟؟

دینی مدارس کے مسائل کو اس پہلو سے بھی دیکھنے کی ضرورت ہے کہ مدارس اس ملک میں کیا تعمیری خدمت انجام دے رہے ہیں؟ اور ان کی آمدنی کے ذرائع کیا ہیں؟ وزارتِ داخلہ نے اس سال پھر حسبِ توقع دینی مدارس کے بارے میں ایک زہریلی ،؛لیکن دلیل وثبوت سے عاری رپورٹ پیش کی ہے۔افسوس کہ اس کے اعداد وشمار میرے سامنے نہیں ہیں؛ لیکن میری یادداشت کے مطابق اس رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ پورے ملک میں چھبیس ہزار دینی مدارس کام کررہے ہیں ، جن میں ڈھائی لاکھ کے قریب مدرسین اور ملازمین مصروفِ خدمت ہیں اور انیس لاکھ یا اس سے کچھ زیادہ طلبہ زیر تعلیم ہیں۔

یہ رپورٹ مبالغہ پر مبنی معلوم ہوتی ہے اور غالباً چھبیس ہزار کی تعداد میں ان صباحی اور مسائی مکاتب کو بھی شامل کرلیا گیا ہے جو مساجد میں چلائے جاتے ہیں، ورنہ بظاہر چھبیس ہزار کی تعداد بہت مبالغہ آمیز ہے، دہلی کے ایک تحقیقی ادارہ ''انسٹی ٹیوٹ آف آبجکٹیو اسٹیڈیز'' کے سروے کے مطابق مدارس کی تعداد تین ہزار ہے، پھر ان مدارس میں طلبہ کی تعداد انیس لاکھ ہونا بھی نہایت قابل تعجب ہے ،لیکن اگر یہ درست ہو اور محتاط اندازہ کے مطابق

ہندوستان میں مسلمانوں کی تعداد بیس کروڑ مانی جائے تو یہ تعداد ایک فیصد سے بھی کم ہوتی ہے، جب کہ حکومت ایسا تاثر دیتی ہے کہ گویا پوری مسلمان اُمت دینی مدارس کی طرف بھاگی جارہی ہے۔

حکومت کے انھیں اعداد وشمار سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ تقریباً تین لاکھ ہندوستانی شہریوں کے لئے یہ مدارس باعزت روزگار فراہم کرتے ہیں، جو ظاہر ہے کہ بجائے خود ایک بڑا تعمیری کام ہے، اس وقت صورتِ حال یہ ہے کہ پرائیوٹیشن اور تمام محکموں میں کمپیوٹر سے استفادہ کرنے کی وجہ سے افرادی وسائل کی ضرورت محدود تر ہوتی جارہی ہے، ابتداء میں یہ بات کہی گئی تھی کہ معاشی نظام میں لائی جانے والی تبدیلیوں کی وجہ سے روزگار کے مواقع بڑھیں گے؛ لیکن اب یہ ایک خواب ہوتا رجا رہا ہے اور روزگار کے مواقع بڑھنے کے بجائے گھٹتے جارہے ہیں، ان حالات میں اگر حکومت پر بوجھ ڈالے بغیر کوئی نظام شہریوں کی ایک بڑی تعداد کو روزگار فراہم کرتا ہے، تو یہ تو قابل تحسین اور لائق ستائش بات تھی اور حکومت کو ایسے نظام تعلیم کی حوصلہ افزائی کرنی چاہئے تھی، نہ یہ کہ اس نظام کو تہہ وبالا کرنے کی کوشش کی جائے، پھر اگر یہ بات مان لی جائے کہ واقعی بیس لاکھ کے قریب بچے ان مدارس میں زیر تعلیم ہیں تو کم وبیش ان کی نصف تعداد ایسی ہوگی جن کے کھانے، پینے کی ضروریات بھی مدارس کی جانب سے پوری کی جاتی ہوگی، یہ بچے وہ ہوتے ہیں جو خطِ غربت کے نیچے زندگی گذارتے ہیں اور ان کے لئے دو وقت کے کھانے کا انتظام بھی اپنے آپ دشوار ہوتا ہے، اگر انھیں ان مدارس میں جگہ نہ دی جائے تو ان کی غالب ترین اکثریت چائلڈ لیبر کی حیثیت سے مختلف ہوٹلوں اور دوکانوں میں معمولی کام کر کے اپنا پیٹ بھرے گی اور باعزت مستقبل کا تصور بھی ان کے لئے دشوار ہوگا۔

پھر معاشی اعتبار سے ایک اور پہلو قابل غور ہے، ملک بھر میں لاکھوں کی تعداد میں مسجدیں ہیں، جن کو خطباء، ائمہ اور مؤذنین کی ضرورت ہوتی ہے، بچوں کی بنیادی دینی تعلیم اور اُردو زبان کی تعلیم کے لئے مکاتب کے معلم یا ٹیوٹر کی صورت میں ہزاروں ایسے افراد کی

ضرورت ہوتی ہے، جو قرآن پاک اور اُردو کی تعلیم دے، ان سب کاموں کے لئے انھیں مدارس سے افراد مہیا ہوتے ہیں، مدارس سے تعلیم مکمل کرنے والے فارغین کی تنخواہیں گو کم ہوتی ہیں؛ لیکن ان کی ایسی ذہن سازی اور تربیت کی جاتی ہے کہ وہ دینی جذبہ کے تحت کم پیسوں میں کفایت شعاری کے ساتھ اپنی زندگی گذار لیتے ہیں، اس طرح مدارس کے ذریعہ سے انھیں افراد کے روزگار کا مسئلہ حل نہیں ہوتا جو ان میں تدریس کا فریضہ انجام دیتے ہیں یا دوسری خدمتیں کرتے ہیں؛ بلکہ ایسی تعلیم بھی ان کو مہیا کی جاتی ہے کہ جس کے ذریعہ وہ ضروری حد تک روزگار حاصل کرسکیں، میں سمجھتا ہوں کہ ہر سال ہزاروں افراد ان مدارس سے فارغ ہوتے ہیں اور مسلمانوں کے مذہبی فرائض سے متعلق خدمت انجام دیتے ہیں، الحمد للہ انھیں فاقہ کشی کی نوبت نہیں آتی؛ چنانچہ اخبار میں ایسی خبریں تو آئے دن شائع ہوتی رہتی ہیں کہ فلاں تعلیم یافتہ بے روزگار نے معاشی حالات سے تنگ آ کر خودکشی کرلی، لیکن خدانخواستہ کسی عالم یا حافظ کے بارے میں ایسی افسوس ناک خبر پڑھنے کو نہیں ملتی، یہ تو ہے ان مدارس کی معاشی افادیت کا پہلو۔

دوسرا اہم پہلو تعلیمی ہے، اس وقت ہمارے ملک میں خواندگی کی مجموعی شرح پچاس سے ساٹھ فیصد کے درمیان ہے، یہ تو کم ترین خواندگی کا معاملہ ہے، سند یافتہ پڑھے لکھے لوگوں کی شرح ظاہر ہے کہ اس سے بہت کم ہے، ان مدارس کے ذریعہ ایک بہت بڑی تعداد کی تعلیم وتربیت کا انتظام ہو رہا ہے اور ایسے سند یافتہ فضلاء نکل رہے ہیں جو کم سے کم دو ملکی زبان اُردو اور مقامی اور دو مشرقی زبان عربی اور فارسی اور ایک حد تک انگریزی زبان پڑھے ہوئے ہوتے ہیں، دوسرے علوم ان کے علاوہ ہیں، اگر حکومت اپنے ہی اعداد وشمار کے مطابق انیس لاکھ افراد کی تعلیم کا انتظام کرے تو کس قدر وسائل درکار ہوں گے اور کیا ہماری حکومت جو چار، پانچ فیصد بھی تعلیم پر خرچ نہیں کر پاتی، ان اخراجات کی متحمل ہوسکتی ہے؟

پھر اس بات پر بھی غور کیجئے کہ یہ مدارس کن طبقات تک علم کی روشنی پہنچاتے ہیں؟ ان لوگوں تک جن کے پاس نہ مال وزر ہے، نہ تعلیم کا شعور ہے، نہ شہری تمدن ہے اور نہ

آنکھوں کو خیرہ کر دینے والے تہذیبی اور ثقافتی معیارات ہیں ، آج کل جو لوگ اسٹیج پر مسلمانوں کو حصولِ تعلیم کا اُپدیش دیتے ہیں، ان کا اپنا حال یہ ہے کہ ان کی درس گاہوں میں غریب طلبہ اور ان کے اولیاء کے لئے زینہ پر قدم رکھنے کی بھی گنجائش نہیں، سرکاری اسکولوں کا حال یہ ہے کہ وہاں طلبہ کے لئے فرنیچر اور محفوظ دیواریں اور چھتیں بھی میسر نہیں ہیں ؛ اسی لئے شاید ہی کوئی سرکاری عہدہ دار اور عوامی اداروں میں قوم کی قسمت کا فیصلہ کرنے والے ارکانِ پارلیمنٹ واسمبلی کے لڑکے ولڑکیاں ان درس گاہوں میں زیر تعلیم ہوں، اس صورتِ حال کے پس منظر میں دیکھئے کہ یہ مدارس کیسا تعلیمی جہاد کر رہے ہیں اور کتنا عظیم کارنامہ ان کے ذریعہ سر انجام پا رہا ہے؟ ہمارے ہندو بھائیوں کو چاہئے کہ اس مسئلہ کو فرقہ وارانہ نقطۂ نظر سے نہیں دیکھیں ؛ بلکہ قومی اور ملکی مفادات کے پس منظر میں پوری حقیقت پسندی کے ساتھ مسئلہ پر غور کریں۔

تعلیمی اعتبار سے ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ اس وقت ہماری یونیورسیٹیوں میں مشرقی زبانوں، عربی، فارسی، اُردو کے جو شعبہ جات قائم ہیں، ان میں زیادہ تر طلبہ دینی مدارس کے فضلاء ہوتے ہیں، اگر مدارس سے ان شعبوں کو غذا نہ ملے تو خاص کر عربی اور فارسی کے شعبوں میں طلبہ کا دستیاب ہونا دشوار ہو جائے گا، یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ ہماری یونیورسٹیوں کے ان شعبوں میں جو طلبہ عصری درس گاہوں کے راستہ سے آتے ہیں، ان کی استعداد افسوس ناک حد تک سطحی ہوتی ہے اور یہی حال ایسے پس منظر رکھنے والے اساتذہ کا ہوتا ہے، کہ بعض دفعہ وہ نہایت مضحکہ خیز باتیں کہہ جاتے ہیں اور دینی مدارس کے معمولی فضلاء کے لئے بھی ایسی غلطیاں حیرت انگیز ہوتی ہیں۔

تعلیمی اعتبار سے یہ پہلو بھی قابل غور ہے کہ اُردو ٹیچرس اور اُردو، فارسی وعربی اساتذہ کی ایک بڑی تعداد نے ان ہی دینی درس گاہوں میں نشو ونما پائی ہے اور تعلیم وتدریس کے اعتبار سے بھی یہی حضرات درس گاہوں میں ممتاز سمجھے جاتے ہیں، یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس وقت اس ملک میں اُردو زبان ان ہی دینی مدارس کے دَم سے باقی ہے، ورنہ جس طرح

معیشت اور روزگار سے اس کا رشتہ کاٹ دیا گیا ہے، اُردو ذریعہ تعلیم کا سلسلہ ختم کردیا گیا، حیدرآباد میں دارالترجمہ کوراتوں رات راکھ کا ڈھیر بنا دیا گیا اور تنگ نظر سیاست دانوں نے بیک جنبش قلم ملک کی واحد اُردو یونیورسٹی جامعہ عثمانیہ کی زبان تراش کر رکھ دی، اس اعتبار سے اُردو کا وجود ختم ہوجانا چاہئے تھا؛ لیکن ہندوستان بھر میں پھیلے ہوئے ہزاروں مدارس کا ذریعہ تعلیم چوں کہ اُردو زبان ہی ہے، اس لئے اس نظام نے اُردو کو نئی طاقت دی ہے، اس وقت ملک بھر میں اگر اُردو کتابوں اور جریدوں کے اعداد و شمار جمع کئے جائیں تو ان میں نوے فیصد ان ہی مدارس کے فیض یافتہ قلم کاروں کے رشحاتِ فکر ہوں گے۔

غور کیا جائے کہ یہ بجائے خود کتنی بڑی علمی اور تعلیمی خدمت ہے اور ایک ایسی دیسی زبان کی حفاظت ہے جو ملک کے شمال سے جنوب اور مشرق سے مغرب تک سمجھی جاتی ہے اور جس کے خوبصورت مکالموں، جل ترنگ غزلوں اور کانوں میں رس گھولنے والے نغموں کا ہر سلیم الفطرت ہندوستانی رسیا ہے، کیا ایک قومی زبان کو زندہ و پائندہ رکھنا معمولی خدمت ہے؟

ہندوستان گو اب اسرائیل سے قربت کی وجہ سے ایک جانب دار اور فاشسٹ ملک کی حیثیت سے اپنی تصویر آپ خراب کر رہا ہے؛ لیکن ہندوستان کا یہ اصل مزاج نہیں، ہندوستان کے معماروں نے اس ملک کو ایک غیر جانب دار اور انصاف کے طرف دار ملک کی حیثیت سے اُبھارا تھا، یہی اس کی روشن شبیہ ہے، اس شبیہ کو برقرار رکھنے کے لئے وہ دنیا کے چھپن مسلم ممالک جو ایشیاء، افریقہ اور یورپ میں واقع ہیں، سے صرفِ نظر نہیں کرسکتا، ان میں سے اکثر ممالک وہ ہیں جہاں کی زبان عربی ہے، ہندوستان میں ان ممالک کے سفارت خانے واقع ہیں اور ان ملکوں میں ہندوستان کے ان سفارت خانوں کی جو سیاسی اور بین الاقوامی اہمیت ہے، وہ کسی صاحبِ نظر کی نظر سے مخفی نہیں، ان سفارت خانوں میں باصلاحیت، محبِ وطن اور مخلص کارکنوں کی ضرورت ہوتی ہے، اس ضرورت کی تکمیل میں بھی عربی زبان وادب کے رمز شناس فضلائے دینی مدارس کا حصہ بہت ہی نمایاں ہے، غرض ملک کی تعمیر اور اس کی خدمت کا جو کام یہ مدارس انجام دے رہے ہیں، وہ نہایت عظیم الشان ہے۔

سب سے اہم بات یہ ہے کہ ان مدارس کے ذریعہ ملک کو شریف، مخلص، قانونِ ملکی کے پابند اور باشعور شہری ملتے ہیں، حکومت بار بار مدارس کی دہشت گردی کا واویلا مچاتی ہے اور مدارس کو (آئی، ایس، آئی) سے جوڑتی ہے؛ لیکن آج تک حکومت اس سلسلہ میں کوئی ثبوت پیش کرنے سے قاصر ہے، حقیقت بھی یہی ہے کہ یہ مدارس انسانیت گر ہیں نہ کہ دہشت گرد، دہشت گردانہ تحریک سے نہ ماضی میں ان کا تعلق رہا ہے اور نہ اب ہے، ملک میں قتل وغارت گری، سرقہ وراہزنی اور آبروریزی کے کتنے ہی واقعات ہر دن پیش آتے رہتے ہیں؛ لیکن اس بات کی دو چار مثالیں بھی نہیں مل سکتیں کہ مدارس کے فضلاء اس کے مرتکب ہوئے ہوں، ملک کے مختلف علاقوں میں دہشت گرد تنظیمیں سرگرم فساد ہیں، آسام، ناگالینڈ، میزورم، منی پور اور پنجاب میں علاحدگی پسند تنظیمیں کام کر رہی ہیں، بہار، بنگال، آندھرا پردیش اور تمل ناڈو وغیرہ میں نکسلائٹ تحریک عروج پر ہے، مدھیہ پردیش اور اس سے متصل علاقوں میں ڈاکوؤں کے منظم گروہوں نے پولیس کی نیند اُڑا رکھی ہے، نیز ایل، ٹی، ٹی، ای کی تحریک اور جنگلات کے اسمگلروں نے کئی ریاستوں کو اپنی دہشت گردانہ حرکتوں سے عاجز کر رکھا ہے، لیکن کیا ان تحریکات میں کہیں ان مدارس کے تعلیم یافتہ لوگوں کی شمولیت پائی گئی ہے؟ کشمیر میں علاحدگی پسندی کی تحریک مسلمانوں کے ہاتھ میں ہے؛ لیکن وہاں بھی ہندوستان کے دینی مدارس کے فضلاء اور طلبہ کے ان سرگرمیوں میں ملوث ہونے کا کہیں کوئی ثبوت نہیں ملا ہے، بابائے قوم گاندھی جی قتل کر دیئے گئے، فاتح بنگلہ دیش اندرا گاندھی کو گولیوں سے بھون ڈالا گیا، راجیو گاندھی کے پرخچے اُڑا دیئے گئے، غور کیجئے کہ دہشت گردانہ حرکتوں میں کون لوگ ملوث رہے ہیں؟ کیا یہ دینی مدارس کے فضلاء اور ان کے متعلقین کا کارنامہ ہے؟

حکومت کو یہ فکر پریشان کئے ہوئے ہے کہ ان مدارس کے پاس اتنا فنڈ کیوں کر آتا ہے؟ اول تو لوگوں کو یہ محسوس کرنا چاہئے کہ ان مدارس کے حجم کے اعتبار سے ان کے اخراجات بہت معمولی ہوتے ہیں، دوسرے یہ اخراجات بڑی حد تک مسلمانوں کے مقامی تعاون سے پورے ہوتے ہیں، اس سلسلہ میں جو لوگ زکوٰۃ، صدقۃ الفطر اور چرم قربانی کے

نظام پر نگاہ رکھیں گے، ان کے لئے اس کو سمجھنا چنداں دشوار نہیں ہوگا، وہ اس طرح کہ ساڑھے باون تولہ چاندی پر زکوٰۃ واجب ہوجاتی ہے، اگر ملک میں مسلمانوں کی آبادی بیس کروڑ مان لی جائے اور فرض کیا جائے کہ پندرہ فیصد مسلمانوں پر زکوٰۃ واجب ہوتی ہے تو گویا تین کروڑ مسلمانوں پر زکوٰۃ واجب ہوئی، مالی حیثیت کے اعتبار سے ظاہر ہے کہ زکوٰۃ کی مختلف مقدار ہوگی؛ لیکن اگر فی کس اوسطاً ایک ہزار روپئے زکوٰۃ کا مانا جائے، تو سالانہ تین ارب روپئے زکوٰۃ کے ہوں گے، صدقۃ الفطر، مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد ادا کرتی ہے اور چوں کہ اس کے لئے مخصوص اموالِ زکوٰۃ کا مالک ہونا ضروری نہیں، اس لئے تقریباً پچاس فیصد مسلمانوں کی طرف سے صدقۃ الفطر کی ادائیگی ہوتی ہے، اس وقت صدقۃ الفطر کی مقدار کم وبیش بیس روپیہ ہے، دس کروڑ افراد اگر فی کس بیس روپئے ادا کر رہے ہیں تو یہ رقم بھی دو ارب ہوجاتی ہے، اس کے علاوہ اگر پچیس فیصد مسلمانوں کے بارے میں یہ مانا جائے کہ وہ قربانی دیتے ہیں اور اوسطاً ان کے چرم قربانی کی رقم فی کس سو روپئے ہی مان لی جائے تو یہ رقم پانچ ارب ہوجاتی ہے۔

اس طرح عام صدقات وخیرات اور وقف کی آمدنی کے علاوہ دس ارب روپئے زکوٰۃ، صدقۃ الفطر اور قربانی سے حاصل ہوتے ہیں، اجناس اور پھلوں میں دس فیصد اور پانچ فیصد بطور عشر جو ادا کیا جاتا ہے، نیز عمومی عطیات کی جو رقمیں ہوتی ہیں، وہ اس کے علاوہ ہیں، اگر پورے ہندوستان کے مدارس کے اخراجات کو جمع کیا جائے تو میرا اندازہ ہے کہ وہ پانچ، چھ ارب سے زیادہ نہیں ہوں گے، ان اعداد وشمار سے بآسانی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ہندوستان کے مسلمان اپنے مدارس کے اخراجات کو پورا کرنے میں خود مکتفی ہیں، انھیں بیرونی ملکوں کی طرف دیکھنے کی چنداں حاجت نہیں، اس لئے یہ خیال کرنا کہ یہ مدارس بیرونی ایجنسیوں سے تعاون حاصل کرتے ہیں اور ان کا چلنا بیرونی امداد پر منحصر ہے، بے خبری اور ناآگہی پر مبنی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ دینی مدارس دستور وآئین کے پابند، امن پسند، انسانی اخوت ومحبت

کے علمبردار ہیں، ہر طرح کی ظلم وزیادتی اور دہشت گردی کے مخالف، قوم وملک کے بہی خواہ ادارے ہیں اوران کے دروازے سبھوں کے لئے کھلے ہوئے ہیں، جو بھی چاہے ان مدارس میں آکران کے شب وروز کے نظام کو دیکھ سکتا ہے بغیر دیکھے ہوئے اور بلاتحقیق مدارس کو بدنام کرنا اوران پر دہشت گردی کا الزام رکھنا یقینا کھلی ہوئی زیادتی اور بددیانتی ہے،اس لئے اہل مدارس کی طرف سے سرکاری عہدیداران، اربابِ صحافت اور ہمارے دیگر برادرانِ وطن کے لئے صدائے عام ہے کہ وہ بچشم سران مدارس کے نظام کو دیکھیں اور سچائی کے گواہ بنیں، نہ کہ جھوٹ اور بہتان کے پرچارک۔

دینی مدارس انسان گر یا دہشت گرد؟

اگر کسی ہندوستانی سے پوچھا جائے کہ تم اپنے ملک میں کچھ ایسے اداروں اور تنظیموں کی رہنمائی کرو جو نوعمروں کو انسان بناتی ہو، جو اس لئے تعلیم دیتی ہو کہ آدمی، آدمی بن جائے، جس کے نزدیک تعلیم کا مقصد پیٹ بھرنا نہ ہو؛ بلکہ جس کا نشانہ روح کو پاکیزہ بنانا ہو، جہاں ایسے علوم سکھائے جاتے ہوں، جس کا بنیادی مقصد مخلوق کی محبت پیدا کرنا اور ان کی خدمت کا جذبہ اُبھارنا ہو، تو یقیناً یہ ایک مشکل سوال ہوگا اور اس کا جواب دینا آسان نہ ہوگا۔

اگر آپ ایوانِ سیاست میں ایسے لوگوں کو تلاش کریں گے تو یہ رات میں سورج کو تلاش کرنے کے مترادف ہوگا، جھوٹ، دھوکہ بازی، غلط بیانی، عہد شکنی، جوڑ توڑ اور کرپشن آج کی سیاست کا خمیر ہے، سیاست کی منزل اونچے سے اونچے عہدے کا حاصل کرنا اور اس کے ذریعہ زیادہ سے زیادہ پیسے کمانا ہے، قوم کی فلاح و بہبود یا ان کے مسائل سے اہل سیاست کو کوئی دلچسپی نہیں اور اگر کچھ ہے تو صرف ووٹ بینک کی حفاظت کے لئے، چلئے اس ایوان سے باہر آیئے اور کچھ ان تنظیموں کا حال بھی دیکھئے جو کچھ مذہبی اور کچھ رفاہی ہیں، ایسی تنظیموں میں سب سے نمایاں نام ''راشٹریہ سیوک سنگھ'' کا ہے، جس کے لاکھوں ممبران ملک کے کونہ کونہ میں موجود ہیں، اس تنظیم نے اپنے لئے جو نام انتخاب کیا ہے اس کے معنی ہیں: ''انجمن خدام وطن'' گویا خدمت اور سیوا اس کا جزوِ نام ہے؛ لیکن یہ تنظیم لاٹھی اور بلم کی عسکری مشق سے پہچانی جاتی ہے، گویا وہ قوم کی خدمت لاٹھیوں اور بندوقوں سے کرنے کی مشق کر رہی ہے اور یہ ایک حقیقت ہے کہ آزادی کے بعد سے وہ بے قصور اور کمزور لوگوں پر اس کی خوب مشق کر چکی ہے۔

آیئے ایک قدم آگے اور عالی شان اور بلند نشان درس گاہوں کے احاطہ میں تشریف لایئے، یہاں آپ کو اسکولوں، کالجوں اور یونیورسیٹوں کی خوب صورت اور دیدہ زیب عمارتیں

نظر آئیں گی ، ایسے سبزہ زار ملیں گے کہ نگاہ ہٹنا نہ چاہے، کتابوں سے آراستہ وپیراستہ کتب خانے بھی آپ کا خیر مقدم کریں گے اور طلبہ وطالبات کی ایک بھیڑ تتلیوں کی طرح ایک طرف سے اُڑ کر دوسری طرف جاتی ہوئی نظر آئے گی ؛ لیکن کیا آپ کو یہاں انسان مل جائیں گے؟ اس کا مثبت جواب دینا مشکل ہے، شور وغل، احتجاج، مظاہرے، نعرہ بازیاں، بھوک ہڑتال، اساتذہ کے ساتھ استہزاء، طلبہ کی ایک دوسرے کے ساتھ رقیبانہ اور حریفانہ کشمکش، منشیات، ایسی باتیں ہیں، جنھیں تلاش کرنے اور ڈھونڈنے کی حاجت نہیں ہوگی ؛ بلکہ آپ اس کو اتنا وافر اور اس قدر علانیہ محسوس کریں گے کہ جیسے کوئی شخص لمبے چوڑے اور رواں دواں دریا کے پاس بیٹھا ہو اور پانی کی طلب میں ہو، کوئی برائی نہیں کہ آپ اسے اس ماحول میں تلاش کرنا چاہیں اور آپ کو مایوسی ہو، قتل، اغواء، غصب، چوری، عصمت ریزی، بڑوں کی بے توقیری، چھوٹوں کے ساتھ ہتک آمیز سلوک کے واقعات اب کالجوں اور اسکولوں میں اتنے زیادہ ہونے لگے ہیں کہ یہ ایک معمول کی بات ہے اور ابتداءِ تعلیم ہی کے زمانہ میں ریگنگ کے ذریعہ ان غیر اخلاقی افعال کی ابتداء ہو جاتی ہے۔

اس میں صرف طلبہ وطالبات کو قصوروار قرار دینا قرین انصاف نہیں، اصل میں ہم نے نظام تعلیم ہی ایسا بنایا ہے جس میں اخلاق اور تہذیب کے لئے کوئی جگہ نہیں، طلبہ ہوں یا اساتذہ، ان کے نزدیک تعلیم محض ذریعہ معاش ہے، تعلیم کا مقصد اول تا آخر پیسے کا حاصل کرنا اور پیٹ کا بھرنا ہے، ان علوم میں خدمت انسانی کے اعتبار سے سب سے اہم شعبہ ''طب'' کا ہے ؛ لیکن آج معالجین کا حال یہ ہے کہ چاہے مریض جاں بہ لب اور آپریشن کی میز پر ہو، جب تک معقول پیسے وصول نہ کر لئے جائیں، ڈاکٹر کا قلم جنبش کرنے کو بھی تیار نہیں، قتل وراہزنی کے بڑے بڑے مقدمات میں ایسے لوگ ماخوذ ہو رہے ہیں جن کے پاس اعلیٰ ڈگریاں موجود ہیں، کھانے کا ذائقہ خراب ہو تو نمک سے اس کی اصلاح ہوتی ہے ؛ لیکن جب نمک ہی کا مزہ بگڑ جائے تو اس کی اصلاح کیوں کر ہوگی ؟ یہی بات آج کل تعلیم گاہوں کے بارے میں کہی جاسکتی ہے، سماجی بگاڑ دور کرنے کا ذریعہ تعلیم ہے، لیکن اگر تعلیم حاصل کرنے والے اور دینے

والے ہی اخلاق اور انصاف کا دامن چھوڑ دیں تو کس طبقہ سے اُمید رکھی جائے کہ وہ شرافت، تہذیب، اخلاق اور انسانیت کا علم تھامے رہیں گے؟؟

لیکن ابھی آپ مایوس نہ ہوں، ان شاء اللہ اس نا اُمیدی کا علاج آپ کو دینی مدارس میں ملے گا۔ کسی درس گاہ کے مزاج کو سمجھنے کے لئے تین عوامل بنیادی اہمیت رکھتے ہیں، اول: درس گاہ کا تربیتی ماحول، دوسرے: درس گاہ کا نصاب تعلیم، تیسرے: تعلیم دینے والے اساتذہ کا مزاج وکردار، جہاں تک تربیتی ماحول کی بات ہے تو عام طور پر صبح کی پو پھٹنے سے پون گھنٹہ ایک گھنٹہ پہلے ہی مدارس میں طلبہ بیدار کئے جاتے ہیں اور تلاوتِ قرآن سے مدارس کی فضا گونج اُٹھتی ہے، پھر فجر کی نماز اور نماز کے بعد پھر تلاوتِ قرآن، اس کے بعد صبح سے رات گئے تک یہی پڑھنا اور پڑھانا اور وقتاً فوقتاً دس بیس منٹ کے تذکیری اجتماعات جس میں اخلاق اور تقویٰ کی تعلیم دی جاتی ہے، صرف عصر تا مغرب کا وقت ورزش، کھیل کود وغیرہ کے لئے مخصوص ہے، اس ماحول میں چھوٹے جس طرح بڑوں کا ادب کرتے ہیں شاید ہی اس کی کوئی مثال مل سکے، اساتذہ سے بے پناہ محبت، احترام، بے حد جذبۂ خلوص اور اساتذہ کی خدمت کرنے میں مسابقت کا جذبہ، پھر اساتذہ کے اندر بھی اپنے شاگردوں کے ساتھ اتھاہ شفقت ومحبت اور چاہت، ان کو بہتر سے بہتر بنانے کی اُمنگ اور خوب سے خوب تر کی کوشش، اساتذہ وطلبہ کی عام زندگی سادہ، تکلفات سے خالی اور قناعت شعار، اس پورے ماحول میں ہر جگہ محبت کی شبنم ہی ملے گی نہ کہ نفرت کا شعلہ، نہ کسی کے خلاف لاٹھی اور تلوار کی مشق، کیا یہ ماحول کسی انسان کو دہشت گردی کی تعلیم دے سکتا ہے؟

انسانی ذہن کی تشکیل میں بہت بڑا حصہ ان مضامین اور کتابوں کا ہوتا ہے جن کو وہ پڑھتا ہے؛ اس لئے شخصیت سازی میں نصابِ تعلیم کا بھی اہم کردار ہے، اس نقطہ نظر سے دیکھئے تو دینی مدارس کے بنیادی عناصر دو ہیں: قرآن اور حدیث، قرآن خدا کی کتاب ہے اور اس کی ابتداء ''**بسم اللہ الرحمٰن الرحیم**'' سے ہوتی ہے، ''رحمن'' اور ''رحیم'' کے معنی ''نہایت مہربان'' اور ''بے حد رحم کرنے والے'' کے ہیں، گویا قرآن اپنے پہلے فقرہ میں ایسے

خدا کی یاد دلاتا ہے جس کا بنیادی وصف رحم وکرم ہے، یہ گویا انسان کو اس جانب متوجہ کرتا ہے کہ سب سے پیارا وصف اور سب سے بہتر صفت رحم وکرم کی ہے، پھر سورۂ فاتحہ کی پہلی آیت میں خدا کے ''رب العالمین'' یعنی تمام عالم کے پروردگار ہونے کا ذکر ہے، اس میں بھی امن وآشتی کی تعلیم ہے کہ ایک انسان نہ صرف تمام انسانوں کو بلکہ تمام مخلوقات کو ایک ہی خاندان اور کنبہ تصور کرے؛ کیوں کہ خدا کی ربوبیت کے رشتہ نے ان سب کو ایک ڈوری میں باندھ رکھا ہے، قرآن کی تمام تعلیمات کا خلاصہ یہی محبت و پیار، رحم دلی اور عفو ودرگذر ہے۔

''حدیث'' پیغمبر اسلام ﷺ کے ارشادات، آپ ﷺ کے افعال اور آپ ﷺ کے احوال کو کہتے ہیں، دنیا جانتی ہے کہ آپ ﷺ کا سب سے نمایاں وصف یہ ہے کہ آپ ﷺ تمام عالم کے لئے پیکر رحمت تھے، کتنے ہی مظالم تھے کہ آپ ﷺ نے انسانیت کو اس سے نجات دلائی، آپ ﷺ نے فرمایا کہ جو میرے ساتھ ظلم کرے، مجھے اس کے ساتھ بھی رحم اور انصاف کا حکم دیا گیا ہے، جو میرے ساتھ قطع رحمی کرے، میں اس کے ساتھ بھی صلہ رحمی پر مامور ہوں اور آپ ﷺ نے عملی زندگی میں اس کو برت کر دکھایا، عفو ودرگذر سے بڑھ کر آپ ﷺ کو کوئی وصف محبوب نہیں تھا اور ظلم وشقاوت سے بڑھ کر کوئی وصف آپ کو مبغوض نہ تھا، حدیث کی کتابوں میں مخلوق پر شفقت ورحمت، ظلم کی مذمت، اقرباء کے ساتھ صلہ رحمی، غرباء کی مالی اعانت، بھلائی کی دعوت اور برائی سے روکنے کی کوشش، ظالموں کے خلاف احتجاج اور بدرجۂ مجبوری طاقت کے استعمال کی ترغیب، ان سے متعلق احادیث میں مستقل ابواب موجود ہیں، ظاہر ہے کہ یہ تعلیمات انسان کو امن پسند اور محب انسانیت بنائیں گی، نہ کہ دہشت گرد اور انسانوں سے نفرت کرنے والا۔

جیسا کہ مذکور ہوا انسان کی شخصیت سازی میں دوسرا اہم کردار استاذ اور مربی کا ہوتا ہے، دینی مدارس کے اساتذہ کی ایک روایت رہی ہے، قناعت، تکلفات سے دوری، سادگی اور توکل علی اللہ ان اساتذہ کا خاص وصف رہا ہے اور یہی وصف ہے جو ان کو ان کے شاگردوں کی نگاہ میں محبوب بنادیتا تھا، اگر اس سلسلہ میں واقعات لکھے جائیں تو ایک اچھی خاصی

ضخامت کی کتاب بھی تنگ دامانی کا گلہ کرے گی ، مگر ایک واقعہ جو بہت پہلے کا نہیں ، ماضی قریب کا ہے، ذکر کئے بغیر نہیں رہا جاتا ، سید محمد مبارک محدث بلگرامیؒ ،مولانا نورالحقؒ (مصنف تیسیرالقاری شرح فارسی صحیح بخاری) کے شاگردوں میں تھے، ان کے بارے میں میر طفیل محمد بلگرامی نے نقل کیا ہے کہ ایک روز میں میر مبارکؒ کی خدمت میں حاضر ہوا، میر مبارکؒ وضو کے لئے اُٹھے اور اچانک گر پڑے ، ایک گھنٹہ کے بعد افاقہ ہوا، میر طفیل محمد نے بے ہوشی کی وجہ دریافت کی تو بہت اصرار کے بعد فرمایا :

تین دن سے کوئی غذا میسر نہیں آئی ہے ، لیکن نہ کسی کے سامنے زبانِ سوال کھولی اور نہ ہی قرض لیا، میر طفیل محمد فوراً گھر گئے ،عمدہ کھانا جو آپ کو مرغوب تھا تیار کرایا اور خدمت میں پیش کیا ، میر مبارک نے پہلے تو خوشی ظاہر کی اور دُعائیں دیں ، پھر فرمایا کہ بارِ خاطر نہ ہو تو ایک بات کہوں اور وہ یہ کہ جب تم میری یہ کیفیت دیکھ کر گئے تو مجھے خیال ہوا کہ تم میرے لئے کھانا لانے گئے ہو، اسی کو ''اشراف'' کہتے ہیں اور ایسے کھانے کو صوفیاء منع کرتے ہیں ، اس لئے میں اسے نہیں کھا سکتا، شاگرد بھی باکمال اور نکتہ شناس تھے، فوراً کھانا اُٹھالیا، واپس لے آئے اور لمحہ بھر رک کر دوبارہ اسی کھانے کے ساتھ میر مبارکؒ کی خدمت میں پہنچے اور عرض کیا کہ جب میں نے اس کھانے کو اُٹھالیا تو یقیناً آپ کو یہ امید نہ رہی ہوگی کہ میں اسے دوبارہ آپ کے پاس لاؤں گا، پس اب ''اشراف'' کی کیفیت باقی نہیں رہی ، استاذ نے شاگرد کی اس سمجھ داری کی داد دی اور پھر پوری رغبت سے کھانا تناول فرمایا۔ (ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت:۳۹)

یہ کہنا تو مبالغہ ہوگا کہ آپ دینی مدارس کے تمام اساتذہ سے میر مبارکؒ کے کردار کی

توقع رکھیں؛ لیکن یہ ضرور ہے کہ ایک اچھی چیز کی سطح گر بھی جائے تب بھی اس کا ایک معیار ہوتا ہے، اس لئے یہ ایک حقیقت ہے کہ آج بھی ''اجرت'' کے بجائے ''اجر'' پر نظر رکھنے، تعلیم کو ایک مقدس فریضہ سمجھنے اور طلبہ سے محبت وشفقت کا برتاؤ کرنے کی جو روایت باوجود بہت سارے انحطاط کے ان مدارس میں پائی جاتی ہے، شاید ہی کہیں اور اس کی مثال مل سکے، جو لوگ اس مزاج و مذاق کے حامل ہوں وہ انسانیت دوستوں کے بجائے انسانیت دشمنوں کو پیدا کریں گے اور محبت وآشتی کے بجائے ان کو نفرت اور دہشت گردی کا سبق دیں گے؟ اس لئے دینی مدارس کو دہشت گردی کا طعنہ دینا دن کو رات کہنے سے کم بڑا جھوٹ نہیں اور دراصل یہ اپنے جرم کی پردہ پوشی اور سورج پر تھوکنے کی سعی ہے۔

دینی مدارس
حکومت اور مسلمانوں کے درمیان

جیسے ہوا اور پانی انسان کے لئے ایک ضرورت ہے، اسی طرح بلکہ اس سے بڑھ کر دین انسان کی ضرورت ہے، دین ہی کے ذریعہ انسان کو جینے کا سلیقہ آتا ہے، گویا یہ مہذب زندگی کی کلید ہے، اسی لئے کائنات کے خالق و مالک نے جس طرح انسان کو ہوا، پانی اور دوسری ضروریات مہیا کی ہیں، اسی طرح پیغمبروں اور رسولوں کی معرفت دین حق بھی بھیجا اور جینے اور مرنے کا طریقہ بتایا، کائنات میں جو پہلا انسان آسمان کی سیر کر کے جنت کی خوش رنگیوں کو دیکھ کر آیا، وہ پہلا انسان بھی تھا، پہلا پیغمبر بھی اور دین حق کا حامل وداعی بھی۔

انسان کی ایک بیماری خالص چیزوں میں آمیزش اور ملاوٹ کی ہے، غور کیجئے کہ دنیا کی کون سی چیز اس کی آمیزش سے محفوظ ہے؟ کھانے کی ہو، پینے کی ہو، پہننے کی ہو، رہنے سہنے کی ہو، یا کسی اور طریقہ پر استعمال کی، جہاں جہاں اس کے لیے ملاوٹ کی گنجائش اور طاقت ہے، وہ ضرور ہی اس حرکتِ ناشائستہ کا ارتکاب کرتا ہے اور دین کے معاملہ میں بھی اس نے یہی کیا، اس کی ''طبع آمیز خو'' نے دین میں بھی آمیزشوں اور ملاوٹوں کو راہ دے دی، انبیاء آتے، کھرے کھوٹے کو الگ کرتے، زرِخالص پر پڑے ہوئے غبار کو صاف کرتے، اُدھر وہ گئے، اِدھر قوم نے کھوٹ کو جمع کیا، غبار اکٹھا کئے اور دین خالص کو اپنی آمیزشوں اور ملاوٹوں سے بگاڑ کر رکھ دیا، محمد رسول اللہ ﷺ آخری پیغمبر تھے، جیسے سورج نکلنے کے بعد تارے منہ چھپا لیتے ہیں اور آسمان کی پیشانی پر چشم ناز دکھانے والی کہکشاں ڈوب جاتی ہے، اسی طرح نبوتِ محمدی ﷺ کائنات کے اُفق پر ایک خورشیدِ ہدایت اور مہر صداقت کا طلوع تھا، جس نے پچھلے چراغوں

کو بجھا دیا، اب اگر یہ آفتابِ عالم تاب بھی گہن آلود ہو جائے، تو کون ہوگا جو حق و راستی کی بے غبار روشنی لوگوں تک پہنچائے؟

اس لئے اللہ تعالیٰ نے خود اس دین کی حفاظت کا ذمہ لیا ہے؛ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّکۡرَ وَاِنَّا لَہٗ لَحَافِظُوۡنَ'' (الحجر:۹) دین اور سرچشمۂ دین ''قرآن مجید'' کی حفاظت کا جو انتظام و انصرام رب کائنات کی طرف سے ہوا ہے، وہ بجائے خود ایک معجزہ اور اسلام کی حقانیت کی دلیل ہے، مفسرین، محدثین، فقہاء اور عربی زبان وادب کے رمز شناس ماہرین یہ سب وہ قدسی گروہ ہیں، جن کو حفاظتِ ربانی کے اس نظام کا حصہ بنایا گیا ہے، اسی سلسلہ کی ایک کڑی دینی مدارس بھی ہیں۔

اس سلسلہ میں ایک اہم تاریخی حقیقت قابل توجہ ہے کہ اسلام سے پہلے جو مذاہب تھے، ان کی تشریح وتوضیح اور تبلیغ واشاعت حکومتوں سے متعلق تھی، وہی مذہبی اقتدار کے حامل بھی ہوتے تھے، ہندو مذہب میں ورنوں کی تقسیم کے ذریعہ اس کا ایک مضبوط نظام قائم تھا، یہودی حکومتیں اسی اساس پر قائم تھیں، یونانیوں کے عیسائیت قبول کرنے کے بعد یہی بات عیسائیوں کے یہاں پیدا ہوئی اور عیسائیت نے توحید سے تثلیث کا سفر ہی یونانی فرماں رواؤں کے قدیم نظریہ سے ہم آہنگ ہونے کے لئے کیا، کم وبیش یہی حال دوسرے مذاہب کا بھی رہا ہے۔

اس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ حکومتیں اپنے مفادات کے مطابق مذہب میں تبدیلیاں کرتی رہتی تھیں اور عقیدہ کو سیاسی استحکام کا وسیلہ بنایا جاتا تھا، اسلام کی تاریخ میں خلافت راشدہ کے بعد سے ہی سیاسی اور مذہبی اقتدار کے مراکز بدل گئے، اس کے نتیجہ میں مذہب ہر طرح کی دست برد سے آزاد رہا، یہی وجہ ہے کہ اسلامی تاریخ میں مذہبی شخصیات وارباب اقتدار کے درمیان فاصلے رہا کرتے تھے؛ کیوں کہ مذہبی شخصیتیں کسی ایسی فکر کو قبول کرنے کو تیار نہیں ہوتی تھیں جو کتاب وسنت کے مزاج سے الگ ہو اور یہ بات بعض اوقات اہل سیاست کے مفاد کے خلاف جاتی تھی؛ امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ، امام احمدؒ، سعید بن جبیرؒ، سعید بن مسیبؒ، امام

سرخسیؒ، امام ابن تیمیہؒ، امام بخاریؒ، امام مسلمؒ اور امام نسائیؒ، غرض اصحابِ عزیمت علماء کی ایک طلائی زنجیر ہے، یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے اقتدار کے چشم وابرو کے اشارہ کو قبول کرنے سے انکار کر دیا اور جرم بے گناہی میں طرح طرح کی آزمائشوں اور ابتلاؤں سے گذرے۔

اسی لئے تمام ہی علوم اسلامی کی تدوین وترتیب اور اس کا ارتقاء ان لوگوں کے ذریعہ انجام پایا جو ایوانِ حکومت کے سائے سے بھی بھاگتے تھے، اس سے یہ فائدہ ہوا کہ بے آمیز طریقہ پر ان علوم کی ترتیب عمل میں آئی، صورت حال یہ تھی کہ اگر کوئی محدث حکمرانوں کے یہاں آمد و رفت رکھتا تو اہل فن اس کی روایت کو شک وشبہ کی نظر سے دیکھتے، اگر کوئی فقیہ حکومت کے عہدے قبول کر لیتا تو عوام ان کے فتوے کو قبول نہیں کرتے اور دوسرے فقہاء اس سے گریز کی راہ اختیار کرتے، اس کا فائدہ یہ ہوا کہ اسلامی علوم بے آمیز طریقہ پر ترتیب دیئے گئے، پروان چڑھے اور انھوں نے دین خالص کی ترجمانی کی۔

ایک طویل دور ایسا گذرا کہ مختلف اہم شخصیتیں علم وفن کا مرجع بنی رہیں، جس کو جس فن کی تعلیم حاصل کرنی ہوتی، وہ اس فن کی ممتاز شخصیت کے پاس چلا جاتا اور اس سے کسبِ فیض کرتا، گویا یہ ''شخصی مدرسے'' ہوتے، جو تشنہ کامانِ علم کی پیاس بجھاتے، پھر ایک دور مدارس کا آیا، جس میں ایک جگہ مختلف علوم وفنون کی تعلیم ہوا کرتی اور فن کی مناسبت سے مختلف شخصیتیں درس دیا کرتیں، جیسے ایک زمانہ میں اپنے عہد کے عبقری علماء کے ذریعہ دین کی حفاظت سر انجام پاتی تھی، اسی طرح اب مدارس کے ذریعہ دین کی حفاظت واشاعت کا فریضہ انجام پانے لگا۔

اس سلسلہ میں ہندوستان اور برصغیر کو ایک خاص امتیاز حاصل ہے، تقریباً ڈیڑھ سو سال سے یہی خطہ اسلامی تحریکات کا مرکز رہا ہے اور ان تمام تحریکات کو ان ہی مدارس سے خونِ جگر ملا ہے، اسلام کے خلاف جو سازشیں کی گئیں، قادیانیت، انکارِ حدیث، نیچریت، الحاد، یہ بھی زیادہ تر اسی خطہ سے اُٹھیں، اس لئے نظام غیبی کے تحت یہ بات ضروری تھی کہ اسی خطہ میں وہ لوگ بھی پیدا ہوں جو فتنوں کو دبا سکیں اور ان سازشوں کا مقابلہ کر سکیں، یہ کام ان ہی مدارس

کے ذریعہ انجام پایا، یہاں سے جو دینی تحریکات اُٹھیں، عالمی سطح پر ان کے گہرے اثرات مرتب ہوئے اور یہاں مخالف اسلام تحریکوں سے جو پنجہ آزمائی کی گئی، اس نے بھی عالمی سطح پر اپنے اثرات ڈالے۔

سب سے اہم بات یہ ہے کہ یورپ سے اخلاقی اور مذہبی قدروں کے خلاف جدیدیت اور آزادی کا جو صور پھونکا گیا اور الحاد اور عیش کوشی کی جو دعوتِ عام دی گئی، اس نے پوری دنیا میں بلا کسی خاص رکاوٹ اور مقابلہ کے کامیابی حاصل کرلی، یہاں تک کہ عرب دنیا اور اسلامی دنیا میں بھی؛ لیکن برصغیر کو وہ اسلامی شعائر کے احترام اور مسلمہ مذہبی اور اخلاقی قدروں کی پابندی سے محروم نہیں کرسکی، اس کا اندازہ برصغیر اور دوسرے ممالک کے مسلم سماج کی تہذیبی اور ثقافتی کیفیت سے لگایا جاسکتا ہے، یہ ان ہی مدارس کا فیض ہے اور جس چیز کو آج اسلامی لہر کہا جاتا ہے، اگر آپ اس کے اصل سوتے اور سرچشمے کو تلاش کریں تو آپ بالآخر ان ہی درس گاہوں تک پہنچیں گے۔

یہ وہ حقیقت ہے جس نے مغرب کو بوکھلا کر رکھ دیا ہے اور اسی لئے امریکہ نے جنگِ افغانستان کو ''تہذیبی تصادم'' سے تعبیر کیا تھا، اس پس منظر میں عالمی سطح پر یہ بات سوچی جارہی ہے کہ فکر اسلامی کے ان سرچشموں ہی کو بند کردیا جائے، اس کے لیے کئی رخی تدبیریں اختیار کی جارہی ہیں، ایک طرف مدارس کے بارے میں غلط فہمیاں پھیلاتے ہوئے انھیں بدنام کرنے کی کوششیں ہورہی ہیں اور ان پر دباؤ ڈالا جارہا ہے، دوسری طرف مدارس کے ذرائع آمدنی کو مسدود کرنے کی سعی کی جارہی ہے، دولت مند مسلمان ملکوں کو امریکہ مدارس کی اعانت سے روک رہا ہے، ہندوستان کے جو مسلمان دوسرے ملکوں میں برسر ملازمت ہیں اور اپنی زکوٰۃ ہندوستان کے مدارس کو بھیجتے ہیں انھیں بھی روکنے کی کوشش کی جارہی ہے، تیسرے حکومتیں اس بات کی کوشش کررہی ہیں کہ مدارس کے نصابِ تعلیم اور نظام تعلیم میں تبدیلیاں لائی جائیں اور مدارس کو اس پر راغب کرنے کے لئے انھیں کچھ اعانت بھی دی جائے، لوگوں کو متاثر کرنے کے لئے ظاہر یہ کیا جارہا ہے کہ اس کا مقصد دینی مدارس میں جدید

علوم کی تعلیم کا انتظام کرنا ہے؛ لیکن درحقیقت ان کا مقصد مدارس کے آزادانہ کردار کو متاثر کرنا ہے، حکومت چاہتی ہے کہ تنخواہ دار اساتذہ ہوں، جو حکومت کی سوچ کے مطابق نئی نسل کا مزاج بنا سکیں، حکومت کے وظیفہ خوار علماء ہوں، جو ایوانِ اقتدار کے چشم و ابرو کو دیکھ کر فتوے دیں، فیصلے کریں اور وعظ کہیں؛ تاکہ ایک ایسا ماڈرن اسلام وجود میں آسکے جو نظام کفر کے ساتھ پوری طرح ہم آہنگی رکھتا ہو اور سماجی زندگی سے اپنا دامن سمیٹ کر مسجد کے بند دروازو ں کے اندر معتکف ہو کر رہ جائے۔

امریکہ ہو یا یورپ، روس ہو یا چین، یا ہندوستان میں سنگھ پریوار کے لوگ ہوں، سبھوں کا اصل منشا یہی ہے! کم از کم ہندوستان کے بارے میں پورے اعتماد کے ساتھ یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ مدارس کے اندرونی معاملات میں مداخلت اور مدارس بورڈ کی تشکیل اقلیتوں کو دیئے گئے دستوریٔ حق کے مخالف و مغائر ہے اور یہ اس جمہوریت اور سیکولرزم سے بغاوت ہے جس پر اس ملک کی اساس اور بنیاد ہے، عجیب بات ہے کہ سنگھ پریوار تو ششو مندر اور سرسوتی مندر کے نام سے ہزاروں کی تعداد میں تعلیمی ادارے قائم کرے اور معصوم بچوں کے ذہن میں فرقہ واریت اور نفرت کا زہر پیوست کریں؛ لیکن اس پر کوئی شور و غوغا نہ ہو اور جو درس گاہیں اپنے ہم مذہب لوگوں کو اپنا مذہب سکھائیں، دوسروں کے خلاف نفرت کا پرچار نہیں کریں، انھیں اتحاد و یکجہتی کے لئے خطرناک قرار دیا جائے؟

اب مسلمانوں کے لئے یہ بات سوچنے کی ہے کہ انھیں یہ مدارس خود چلانا ہے یا حکومت کے حوالہ کرنا ہے؟ انھیں ان مدارس کو اسلام کا دعوتی اور حفاظتی مشن برقرار رکھنا ہے یا حکومت کے فکر و نظر کا آئینہ دار بنانا ہے؟ یہ سوال نہایت اہم ہے، کیوں کہ ابھی چند دنوں پہلے ایک مسلمان تنظیم اور بعض مسلمان شخصیتوں کی خواہش بلکہ گذارش پر حکومت آندھرا پردیش نے سرکار کی طرف سے مدارس بورڈ کی تجویز پر غور کرنے کی بات کہی ہے، افسوس کہ اگر حکومت یہ بات کہتی تو مسلمان اسے رد کرتے، اس کے بجائے بعض انجام ناشناس مسلمانوں ہی کی طرف سے حکومت کو اس کی پیشکش کی گئی ہے، پھر مزید قابل افسوس امر یہ ہے کہ جب علماء اور

حیدرآباد کی بعض مسلمان مذہبی اور سیاسی تنظیموں نے اس کی مخالفت کی تو وہ ادارے اور شخصیتیں جو عصری تعلیمی درس گاہوں کی نمائندگی کرتی ہیں انھوں نے بالکل ہی سکوت اختیار کرلیا، گویا یہ کوئی مسئلہ ہی نہ ہو، جب علی گڑھ یونیورسٹی کا اقلیتی کردار متاثر کیا گیا تو اس کی تحریک چلانے والوں میں پیش پیش علماء تھے اور ہر جگہ ممتاز دینی مدارس نے اس سلسلہ میں احتجاجی پروگرام منظم کئے؛ لیکن جب دینی مدارس کی آزادی پر یلغار کرنے کی کوشش کی جارہی ہے تو ہمارا یہ دانشور حلقہ مہر بہ لب ہے۔

میڈیا کے مسلسل پروپیگنڈہ کی وجہ سے اب بعض مسلمان بھی سوچنے لگے ہیں کہ مدارس کے نظام تعلیم کو بدلنا چاہئے اور یہاں کے طلبہ کو مکمل طور پر عصری تعلیم سے بھی آراستہ کرنا چاہئے، نیز اس کے لئے حسب ضرورت حکومت سے بھی تعاون لینا چاہئے، یہ نہایت خطرناک اور نا سمجھی پر مبنی سوچ ہے۔ اگر مدارس کا اسلامی کردار مجروح ہوجائے، ان اداروں کا مقصد ''تعلیم برائے تعلیم'' رہ جائے اوران میں دین کی دعوت و احیاء اور اشاعت وحفاظت کا سرفروشانہ جذبہ باقی نہ رہے، تو پھر اندیشہ ہے کہ ہماری عظیم الشان مسجدیں مسجدِ قرطبہ کی طرح تماشہ گاہِ عالم بن جائیں اور ایک ایسا قالب رہ جائے جو روح و زندگی اور قوت وتوانائی سے محروم ہو۔

اس وقت مدارس کی آمدنی کو روکنے اور متاثر کرنے کی کوشش کی جارہی ہے، ہماری سادگی، عاقبت نا اندیشی اور نتیجہ وانجام سے بے خبری کا یہ حال ہے کہ بعض لوگ مشورہ دے رہے ہیں کہ انگریزی اخبار نکالنے کے لئے چند ماہ مدارس بند کردیئے جائیں، اُمت کی اس نادانی پر جتنا سر پیٹئے کم ہے، اب مسلمانوں کو یہ بات سوچنی ہے کہ وہ اپنی قوتِ بازو اور گاڑھی کمائی سے ان مدارس کو چلائیں گے اور آئندہ نسلوں کے دین وایمان کی حفاظت کریں گے یا انھیں وقت کے رحم وکرم پر چھوڑ دیں گے اور اس ناپاک منصوبہ کو کامیاب ہونے دیں گے جو دشمنانِ اسلام کا مسأ ومقصود ہے؟ اگر ہم چاہتے ہیں کہ یہ مدارس اسلام کی حفاظت واشاعت کا کام کرتے رہیں اور دین و ایمان کی امانت کو اگلی نسلوں تک پہنچائیں تو اپنی دولت کا ایک

مناسب حصہ اس کاز کے لئے وقف کرنا ہوگا اور جیسے یہودی اور قادیانی اپنی دولت کا ایک قابل لحاظ حصہ اپنے مذہب کے لئے خرچ کرتے ہیں، مسلمانوں کو بھی بلند حوصلگی اور فراخ قلبی کے ساتھ ان مدارس کے تعاون کے لئے آگے بڑھنا اور اس کو حکمرانِ وقت کی دست برد سے بچانا ہوگا، ورنہ :

تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں !

دینی مدارس اور موجودہ حالات

ہندوستان میں دینی مدارس کی ایک تاریخ رہی ہے، روشن اور تابناک تاریخ، ایثار وقربانی اور صبر وقناعت کے تابندہ نقوش سے آراستہ تاریخ، یہ ملک کی غریب اور پس ماندہ اقلیت کا اعجاز ہے کہ اس نے اپنے دو دو، چار چار پیسے جمع کر کے قوم کے لاکھوں نونہالوں کی دینی تعلیم اور اخلاقی تربیت کا نظم کر رکھا ہے، مفت تعلیم کا انتظام اصل میں تو حکومت کی ذمہ داری تھی؛ لیکن حکومت کے بجٹ میں تعلیم کے شعبہ پر جتنی کم توجہ کی جاتی ہے، وہ عام اخبار بینوں اور زمانہ آگاہ لوگوں سے بھی مخفی نہیں، دینی مدارس کے اس الہامی نظام میں نہ صرف تعلیم؛ بلکہ خورد ونوش اور دوسری ضروریات بھی طلبہ کے لئے مہیا کی جاتی ہیں، پھر ان اداروں میں اکثریت ایسے بچوں کی ہوتی ہے، جو دیہات وقریہ جات کے رہنے والے اور خط غربت سے بھی نیچے کی زندگی گزارنے والے طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں، دینی نقطہ نظر سے ہٹ کر ناخواندگی کو دور کرنے اور دور دراز علاقوں تک تعلیم کی روشنی پہنچانے کے اعتبار سے بھی ان کی خاص اہمیت ہے اور حقیقت یہ ہے کہ حکومت کو اس سلسلہ میں ان مدارس کے قیام کی حوصلہ افزائی کرنی چاہئے، نہ کہ حوصلہ شکنی۔

ملک کی آزادی کو ساٹھ سال مکمل ہونے کو ہیں اور ان مدارس کا جال ملک کے چپہ چپہ میں بچھا ہوا ہے؛ لیکن پچپن سال کی مدت میں پچپن مقدمات بھی ان مدارس سے وابستہ اساتذہ اور طلباء کے سلسلہ میں ایسے نہیں آئے جو غیر قانونی رویہ کے مظہر ہوں، لیکن حکومت کے زیر انتظام جو درس گاہیں چل رہی ہیں، ان کے اخلاقی ماحول کا حال یہ ہے کہ شاید ہی کوئی دن گذرتا ہو کہ ان درس گاہوں سے پڑھ کر نکلنے والوں کو تو چھوڑئے، خود ان درس گاہوں کے احاطہ میں قتل، راہ زنی، آبروریزی، چھیڑ چھاڑ اور اساتذہ وانتظامیہ کے ساتھ انتہائی بدسلوکی

وغیرہ کا کوئی نہ کوئی واقعہ پیش نہیں آتا ہو، ملک میں جتنی انتہا پسند اور دہشت گرد تنظیمیں ہیں، جنھیں انسانوں کا شکار کرنے میں جانوروں کے شکار سے زیادہ لطف آتا ہے، ان سب میں ان تعلیم یافتہ جاہلوں اور نادان دانشوروں کا دماغ اور خون جگر شامل ہے، حقیقت یہ ہے کہ دینی مدارس اخلاق اور روحانیت کی تربیت گاہیں ہیں، جہاں صبر وتحمل، انسانیت سے محبت، شرافت ومروت، بلند اخلاقی اور اعلیٰ ظرفی کا سبق دیا جاتا ہے اور ان مدارس سے ملک کو قانون کا احترام کرنے والے اچھے شہری فراہم ہوتے ہیں۔

افسوس کہ ہماری حکومتیں عالمی دباؤ کے تحت ان حقائق کو نظر انداز کر کے مدارس کے گرد گھیرا تنگ کرتی جارہی ہے، آر، ایس، ایس (R.S.S) کے فرقہ وارانہ نظریات اور تنگ نظری پر مبنی افکار وخیالات قوم وملک کے سامنے ہیں، جو ملک کے دستور پر ایقان نہیں رکھتے، جس کے کاندھوں پر بابائے قوم گاندھی جی کا خون ہے، جو خود اور اس کی ذیلی تنظیمیں اپنے کارکنوں کو آتشیں اسلحہ کے استعمال کی تک تربیت دے رہے ہیں، جو فرقہ پرست اذھان کی پرورش کے لئے اپنا مستقل نظام تعلیم رکھتی ہے اور اس نظام پر مبنی ہزاروں درس گاہیں ملک کے کونہ کونہ میں گروکل، سرسوتی مندر اور سرسوتی ودیا مندر کے نام سے کام کر رہی ہیں، ایک باخبر قائد کے بیان کے مطابق ان کی تعداد میں حالیہ برسوں میں چوبیس ہزار کا اضافہ ہوا ہے، شہر شہر اور قصبہ قصبہ یہ درس گاہیں قائم ہیں اور ہو رہی ہیں اور شب وروز نئی نسلوں کے ذہن میں فرقہ واریت کا زہر بونے کا کام انجام دے رہی ہیں، وی، ایچ، پی (V.H.P) کی شاخیں جو اکثر مشرقی اور مغربی ممالک میں قائم ہیں، ان کے لئے ڈھیر سارا سرمایہ فراہم کر رہی ہیں، لیکن حکومت کی نگاہ میں ان سے قوم اور ملک کو کوئی خطرہ نہیں ہے، اس کے برخلاف یہ مدارس جو روحانیت اور اخلاق کا درس دیتے ہیں اور نفرت کی بجائے محبت کے سوداگر ہیں، ان کا وجود ہماری حکومت کو کھٹکتا ہے، ایک محب وطن کے لئے اس سے زیادہ افسوس کی اور کیا بات ہوسکتی ہے؟

کارگل کے واقعہ نے ملک کی سرحدات کی طرف سے ہماری حکومت کی غفلت اور بے خبری کو جب طشت از بام کر دیا تو حکومت نے وزیر داخلہ جناب لال کرشن اڈوانی، وزیر خارجہ جسونت

سنگھ، وزیر دفاع جارج فرنانڈیز، وزیر خزانہ یشونت سنہا اور سکوریٹی کے مشیر جناب برجش مشرا پر مشتمل ایک کمیٹی تشکیل دی، اس گروپ نے دوسرے ماہرین سے بھرپور مدد لیتے ہوئے دس ماہ کی محنت اور سعی کے بعد ایک جامع رپورٹ (Reforming the National Securinty System Recommendation of the group of ministers, February 2001.) کے نام سے تیار کی، اس تفصیلی رپورٹ میں جابجا مسلمانوں کی وطن کے تئیں وفاداری کو مشکوک کرنے اور انھیں مشتبہ بنانے کی ناپاک کوشش کی گئی ہے، رپورٹ کے (ص: ۱۲، پیراگراف نمبر ۲/۲۹) میں لکھا گیا ہے :

> ایک تازہ رُخ یہ ہے کہ اتحاد اسلامی جنگجو تیزی سے بڑھ رہے ہیں، ان کا تعلق سعودی عرب، پاکستان، سوڈان اور بعض دوسرے مغربی ایشیائی ممالک کی بنیاد پرست تنظیموں سے ہے اور سعودی اور خلیجی ممالک کے سرمایہ سے، حال کے چند برسوں میں، پورے ملک میں، بہت سے نئے مدارس کا قیام عمل میں آیا، خاص طور پر بڑی تعداد میں پچھمی ساحلی علاقوں، پچھمی بنگال اور اُتر پورب کے سرحدی علاقوں میں—— یہ بھی رپورٹ ہے کہ سرحدی علاقوں کے مسلمانوں میں بنیاد پرست اُصول ونظریات کی مرتب انداز پر تخم ریزی کی جارہی ہے، جو فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے لئے لازمی طور پر خطرناک ہے۔

برسر اقتدار جماعت اور حکومت کی جانب سے مدارس کے بارے میں زہر افشانی کا سلسلہ عرصہ سے جاری ہے؛ لیکن اب تک اس کا کوئی عملی ثبوت باوجود بار بار کے مطالبہ کے حکومت کی جانب سے فراہم نہیں کیا جاسکا ہے کہ دہشت گرد سرگرمیوں سے ان مدارس کا کوئی تعلق ہے، محض بدگمانیوں اور افواہوں کی بنیاد پر ذمہ دارانِ حکومت کا ایسی بات کہنا کس قدر غیر ذمہ دارانہ عمل ہے؟ یہ محتاجِ اظہار نہیں، افسوس کہ اب حکومت کے ذمہ دار اپنے عہدوں کا

بھی پاس ولحاظ نہیں کرتے اور سچائی کو بار بار ان کے سامنے شرمسار ہونا پڑتا ہے۔

بہرحال یہ مدارس میں مداخلت کی راہ تلاش کرنے کے لئے حیلے اور بہانے ہیں، خدا ان کی نظر بد سے ان درس گاہوں کی حفاظت کرے، تاہم اس صورتِ حال کا مقابلہ کرنے کے لئے اہل مدارس اور عام مسلمانوں کی بھی کچھ ذمہ داریاں ہیں، جن سے پہلوتہی کرنا اب کسی بھی طرح مناسب نہیں۔

اِدھر آر، ایس، ایس (R.S.S) اور اس کے زیر اثر تنظیموں نے ایک نئی اصطلاح ''غیر قانونی مدارس'' کی شروع کی ہے؛ چنانچہ آج (۲۵/ڈسمبر ۲۰۰۱ء) روزنامہ آزاد ہند کلکتہ کے (ص:۲) پر شاہ سرخی ہمارے سامنے ہے ''ملک میں غیر قانونی مدرسے بند کردئے جائیں'' یہ ''غیر قانونی'' کی اصطلاح خود ''غیر قانونی'' ہے؛ کیوں کہ دستور میں دیئے گئے بنیادی حقوق کے تحت اقلیتوں کو خود اپنے تعلیمی ادارے قائم کرنے کا حق حاصل ہے؛ اس لئے دینی مدارس کو غیر قانونی کہنا قطعاً ناواجبی ہے؛ لیکن بہرحال احتیاطی طور پر موجودہ حالات میں یہ بات مناسب معلوم ہوتی ہے کہ مدارس کو ٹرسٹ یا سوسائٹی کے تحت لے آیا جائے اور اس کے نظم و نسق کو ''شخصی'' کے بجائے، ''شورائی'' بنایا جائے، تاکہ اس کا نظام قانونی طور پر زیادہ محفوظ ہوسکے، شورائی نظام میں بڑے فوائد بھی ہیں اور بعض نقصانات بھی، سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ شورائی نظام کے تحت کارکردگی میں ایک تسلسل کی کیفیت برقرار رہتی ہے، ہندوستان کے بعض بڑے مدارس میں اختلاف وانتشار کی صورت پیدا ہوئی اور ایسی شخصیتیں ادارے سے کنارہ کش کردی گئیں، جن کی کنارہ کشی ہر علم دوست شخص کے نزدیک ایک سانحہ سے کم نہیں اور اس سانحہ کو ''علم پر سیاست کی فتح'' سے تعبیر کیا جائے تو بے جا نہ ہو، لیکن اس کے باوجود یہ ادارے کام کرتے رہے؛ بلکہ مقدار اور حجم کے اعتبار سے ان میں اضافہ ہی ہوتا رہا، یہ اسی شورائی نظام کی برکت ہے۔

اسی طرح جس ادارے کا انتظام شورائی اور اجتماعی ہوتا ہے، اس کے بارے میں لوگوں کو بدگمانی کا موقع کم ملتا ہے، پھر شورائی نظام میں ضروری مسائل پر بحث ہوتی ہے، اس

سے اس معاملہ سے متعلق حسن وقبح کے تمام پہلو سامنے آجاتے ہیں اور صحیح رائے قائم کرنے میں سہولت ہوتی ہے، تاہم اس میں بھی شبہ نہیں ہے کہ کمیٹیوں کے اختلاف اور اصل کام کرنے والوں پر پابندیوں اور قدغنوں کی وجہ سے بہت سے مواقع پر شخصی نظم کے تحت ادارے جلد آگے بڑھتے ہیں اور انتظامی کمیٹیوں کے باہمی اختلافات اور آویزشوں کی وجہ سے ترقی کی رفتار سست ہوجاتی ہے، اس پس منظر میں یہ صورت بہتر ہے کہ انتظامیہ میں ہم خیال و ہم فکر افراد لئے جائیں اور ایسے اُصول وقواعد مقرر کئے جائیں کہ اصل کام کرنے والوں کو زیادہ اختیارات حاصل ہوں، وہ آزادی کے ساتھ کھل کر کام کرسکیں، البتہ حساب وکتاب وغیرہ باضابطہ طور پر مجلس انتظامی کو پیش ہوں، اس طرح ایک متوازن شورائی نظام قائم کیا جاسکتا ہے۔

اہل مدارس کو حساب وکتاب کی شفافیت پر بھی پوری توجہ دینی چاہئے، ہر مد کی رقم اسی مد میں خرچ ہو، اخراجات کا صحیح طور پر اُصول کے مطابق اندراج ہو، حسابات کو آڈٹ کرایا جائے اور مجلس انتظامی میں پیش کرکے اس کی توثیق کرائی جائے، مدرسہ کے معاونین کو اس بات کا حق دیا جائے کہ اگر وہ چاہیں تو اپنے اطمینان کے لئے حسابات کو دیکھیں اور تشفی حاصل کریں، حسابات کے لکھنے کے لئے باضابطہ اکاؤنٹنٹ مقرر کیا جائے، کہ وہ مروجہ ضابطہ کے تحت کام کریں اور اگر کبھی گورنمنٹ کا کوئی محکمہ حسابات کو دیکھنا چاہے اور از روئے قانون اُسے یہ حق ہو، تو وہ اُسے آئینہ کی طرح صاف ستھرا پائے، ہندوستان کی بعض بڑی جامعات جن کے سالانہ اخراجات کروڑوں میں پہنچ چکے ہیں، ان کے یہاں ایک ایک روپیہ کا حساب محفوظ ہے اور کہیں انگلی رکھنے کی گنجائش نہیں، موجودہ حالات میں مدارس کو اس پر توجہ دینا نہایت ضروری ہے۔

شفافیت ہی کا ایک پہلو یہ ہے کہ مدرسہ کی املاک مدرسہ کے نام پر ہونی چاہئے، شخصی ناموں پر لی بھی گئی ہو تو بعد کو مدرسہ کے نام پر منتقل ہوجانی چاہئے، ورنہ اس سے بڑے فتنے پیدا ہوتے ہیں، بجا طور پر بدگمانیاں پیدا ہوتی ہیں اور اگر آئندہ ورثہ میں امانت ودیانت نہ رہی تو قومی ملکیت کے ''انفرادی ملکیت'' بن جانے کا اندیشہ رہتا ہے۔

عام مسلمانوں کو بھی مدارس کی اہمیت اور اسلام کے تحفظ وبقاء میں ان کے تاریخی کردار

کو ہمیشہ ملحوظ رکھنا چاہئے اور انھیں جانی، مالی، قانونی اور اخلاقی مدد کے ذریعہ بھرپور قوت پہنچانی چاہئے، افسوس کہ ناسمجھی اور نادانی کی وجہ سے خود مسلمانوں کے بعض حلقے بھی دینی تعلیم اور دینی مدارس کی اہمیت کو کم کرنے کے لئے کوشاں ہیں، بعض حلقے اس طرح کی بات بھی اُٹھارہے ہیں کہ زکوٰۃ مدارس کے بجائے سماج کے دوسرے غرباء پر خرچ کی جانی چاہئے، ایک طبقہ کی رائے ہے کہ اگر حکومت مدارس میں دخیل ہوکر جدید تعلیم کو شامل کرنا چاہتی ہے تو اس کو قبول کر لینے میں کوئی حرج نہیں ہے، ایسی باتیں سن کر خیال گزرتا ہے کہ ''غیروں کی عیاری اور اپنوں کی سادگی'' دونوں کی مثال نہیں، حقیقت یہ ہے کہ اس وقت مدارس کو بھرپور تقویت پہنچانا وقت کا سب سے اہم فریضہ اور مسلمانوں کی سب سے بڑی ضرورت ہے اور مدارس کو کمزور کرنا بالواسطہ ان سازشوں کو طاقت پہنچانا ہے جو اس ملک میں اسلامی تشخصات کی بیخ و بن اُکھاڑنے کے لئے کی جارہی ہے اور جو انشاء اللہ ناکام و نامراد ہوکر رہے گی!!

دینی مدارس اور زکوٰۃ

ادھر بعض دوستوں نے دینی مدارس کو زکوٰۃ سے اعانت کا مسئلہ اُٹھایا ہے اور روزنامہ ''منصف'' میں اس موضوع پر کئی مراسلے آچکے ہیں، گذشتہ سال ہندوستان کے ایک معروف شہر میں زکوٰۃ پر سیمینار منعقد ہوا تھا، اس میں بھی یہ مسئلہ بڑی شدومد سے زیر بحث آیا تھا، نیز یہ مسئلہ یوں بھی اہم ہے اور موجودہ حالات کے پس منظر میں اس کی اہمیت اور بھی سوا ہوگئی ہے، اس لئے ضرورت محسوس ہوئی کہ اس اہم موضوع پر کچھ عرض کیا جائے۔

اس مسئلہ پر غور کرنے کے لئے دو باتیں پیش نظر رکھنی ضروری ہیں: اول یہ کہ زکوٰۃ کا مقصد کیا ہے؟ اور زکوٰۃ کی ادائے گی میں کیا رعایت ملحوظ ہے؟ دوسرے کیا یہ مقصد دینی مدارس کو زکوٰۃ ادا کرنے سے حاصل ہوجاتا ہے؟ —— قرآن مجید نے زکوٰۃ کے آٹھ مصارف ذکر کئے ہیں، فقیر، مسکین یعنی غریب اور بہت زیادہ غریب، عاملین یعنی زکوٰۃ کی جمع وتقسیم کا کام انجام دینے والے لوگ، مؤلفۃ القلوب یعنی وہ نومسلم جن کو اسلام پر استقامت کے لئے یا وہ غیر مسلم جن کو اسلام کی ترغیب کے لئے کچھ دیا جائے، غلام، مقروض، اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے اور مسافر، (التوبۃ:۶۰) ان آٹھ مصارف میں پانچ وہ ہیں جن کا مقصد غرباء اور حاجت مندوں کی ضرورت پوری کرنا ہے، فقیر ومسکین سے عام محتاج مراد ہیں، غلام، مقروض اور مسافر سے مخصوص نوعیت کے اور وقتی طور پر پریشان حال لوگوں کی حاجت براری مقصود ہے، مؤلفۃ القلوب اور مجاہدین فی سبیل اللہ کی رعایت کا منشاء اسلام کی سربلندی اور اعلاء کلمۃ اللہ ہے، ''عاملین'' کی مدز کوٰۃ سے متعلق انتظامی اُمور کی انجام دہی اور اس کے اخراجات کی تکمیل کے لئے ہے، پس ان مصارف زکوٰۃ پر غور کرنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ زکوٰۃ کے بنیادی طور پر دو مقاصد ہیں: غربا کی حاجت پوری کرنا، اسلام کی بلندی اور اس کی دعوت واشاعت

اور حفاظت وصیانت کے نظام کو تقویت پہنچانا۔

مصرف زکوٰۃ کی روح کو سامنے رکھ کر دینی مدارس کے نظام اور اس کے کردار پر غور کیجئے— دینی مدارس کی حیثیت عام درس گاہوں کی نہیں ہے، عام درس گاہوں کا مقصد بچوں کو ایسی تعلیم سے آراستہ کرنا ہے جو آئندہ ان کو ملازمت دلائے اور زیادہ سے زیادہ کمانے کے لائق بنائے، جس تعلیم سے جس قدر مستقبل کی معاشی فلاح وبہبود متعلق ہے، وہ اسی قدر لوگوں کے لئے مرکز توجہ بھی ہے اور گراں بھی ؛ بلکہ سرکاری تعلیم گاہوں کی زبوں حالی اور بے سروسامانی نے اب تعلیم کو ایک نہایت ہی نفع بخش اور نفع رساں تجارت بنا دیا ہے؛ لیکن دینی مدارس کی حیثیت اس سے مختلف ہے، خاص کر ہندوستان میں اس کا ایک خاص پس منظر ہے۔

مسلم دورِ حکومت تک وہ علوم جن کو آج ''جدید علوم'' کہا جاتا ہے، اس قدر شاخ درشاخ نہ ہوتے تھے، جیسا کہ آج ہم دیکھ رہے ہیں، بعض فنون مدون ہو چکے تھے؛ لیکن ان پر ایک آدھ کتابوں کی تدریس کے ساتھ تجربہ کافی سمجھا جاتا تھا، بعض فنون مدون بھی نہ ہوئے تھے اور ان کے تجربات سینہ بہ سینہ منتقل ہوتے آئے تھے، جیسے: مختلف شعبوں کی انجینیر نگ اور زراعت وغیرہ، اس کے لئے حکومت کی طرف سے عمومی نوعیت کی درس گاہیں ہوتی تھیں، ان میں زبان، مذہب، اخلاق اور طب وغیرہ کی تعلیم مشترک طور پر ہوتی تھی اور مختلف قوموں کے لوگ مل جل کر تعلیم حاصل کیا کرتے تھے۔

جب ہندوستان سے مسلمانوں کے اقتدار کا سورج غروب ہونے لگا اور انگریز نہایت چالبازی کے ساتھ اپنے قدم بڑھانے لگے، تو انھوں نے سونے کی اس چڑیا کے بال وپر نوچنے کو کافی نہ سمجھا؛ بلکہ ہندوستان کو مستقل طور پر اپنے زیر اثر رکھنے کی غرض سے رعایا کی فکر ونظر میں تبدیلی کو بھی ضروری سمجھا اور اس کے لئے چہار رخی تدبیریں کی گئیں، چوں کہ ان کو زیادہ خطرہ مسلمانوں سے تھا، اس لئے انھوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کو اور خاص کر مسلمانوں کو اپنی فکری یورشوں کا نشانہ بنایا اور بے سروپا اعتراضات اور خلاف واقعہ شکوک وشبہات اسلام پر شروع کئے، تاکہ ہندوستانیوں کی نئی نسل اپنے مذہب کے بارے میں غیر مطمئن اور بدگمان

ہو جائے ، دوسرے نہایت ہی قوت کے ساتھ ملک کے چپہ چپہ میں عیسائی مشنریز کو بھیجا اور عیسائیت کی تبلیغ شروع کردی ،بعض اعداد وشمار سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مقصد کے لئے ایک ایک شہر میں پانچ پانچ سو پادریوں کے قافلے اترتے تھے اور عیسائیت کی تقویت کے لئے بڑے بڑے مناظر برطانیہ سے بلائے جاتے تھے۔

تیسرے انگریزوں نے بلا تاخیر ہندوستان میں ایک نیا نظام تعلیم جاری کیا ،جس کا مقصد محض علوم وفنون کی تعلیم نہ تھی ؛ بلکہ ہندوستانیوں کو مغرب سے قریب کرنا ، ان کو ایسے مذہبی افکار اور اپنی ثقافت کے بارے میں احساس کمتری میں مبتلا کرنا اور انگریز حکومت کے لئے ہندوستانی نوکروں کا ایک انبوہ تیار کرنا تھا ، بہ قول لارڈ میکالے ان درس گاہوں کا مقصد تھا کہ ہندوستان کے لوگ رنگ ونسل کے ہندوستانی رہ جائیں اور دل ودماغ میں انگریز بن جائیں ، چوتھے ہر طرح کی سرکاری ملازمت کو اسی نئی تعلیم سے متعلق کردیا گیا جس نے بہت جلد ہندوستانیوں کو اس بات پر مجبور کردیا کہ وہ اپنی گردنِ طاعت اس نئے نظام کے سامنے خم کردیں۔

ہندوؤں کے لئے یہ صورتِ حال چنداں قابل تشویش نہ تھی ؛ کیوں کہ ہندو مذہب کی بنیاد کسی متعین فکر وعقیدہ پر نہیں ہے ، یہاں تک کہ جو لوگ ہندو دیویوں اور دیوتاؤں کا مذاق اُڑاتے ہیں ، وہ بھی ہندومت سے باہر نہیں ہیں ، زندگی کے عام مسائل میں یا تو ہندو مذہب کوئی رہنمائی نہیں کرتا ، یا کرتا ہے تو وہ آج کے حالات میں ناقابل عمل ہے اور خود ہندو قوم اسے قبول کرنے کو تیار نہیں ہے ، اس لئے ہمارے ہندو بھائیوں نے تو بلا تأمل اس پر لبیک کہا اور اس کے فوائد بھی اُٹھائے۔

انگریزوں کو اصل پرخاش مسلمانوں سے تھی اور وہ چاہتے تھے کہ کسی طرح مسلمانوں کے ایمان کا سودا کریں ، اس پس منظر میں بالغ نظر اور دردمند علماء نے محسوس کیا کہ سیاسی اقتدار تو اب رخصت ہونے کو ہے ، کسی طرح مسلمانوں کے ایمان کی حفاظت کی تدبیر کرنی چاہئے ؛ چنانچہ انھوں نے طے کیا کہ ہندوستان کے گوشے گوشے میں دینی درس گاہوں کا جال بچھادیا

جائے اور ایک ایسی نسل کو وجود بخشا جائے جو مادی منافع کے پیچھے دوڑنے کے بجائے اپنی دنیا کو قربان کر کے مسلمانوں کے دین وایمان کی حفاظت پر کمربستہ رہے، فاقہ مستی اسے گوارہ ہو، معمولی کھانا اور معمولی پہننے پر وہ قناعت کر سکے اور خس پوش جھونپڑیوں میں چٹائیوں پر بیٹھ کر اپنے آپ کو خدا کے دین کی حفاظت اور سربلندی کے لئے وقف رکھے۔

چنانچہ اس منصوبہ کے تحت پورے ملک میں مدارس ومکاتب کا قیام عمل میں آیا اور ایک ایسے تعلیمی نظام کی تشکیل کی گئی جو اپنے اخراجات میں حکومت کا محتاج نہ ہو؛ بلکہ اگر حکومت مدد کرنا بھی چاہے تو اسے قبول نہ کیا جائے اور ہر طرح سرکاری مداخلت سے آزاد رہ کر یہاں سے دین کی حفاظت واشاعت کے جذبہ سے سرشار اور ایثار وقربانی سے سرمست بادہ خواروں کی ایک بہت بڑی تعداد پیدا کی جائے؛ چنانچہ وہ اس میں کامیاب رہے اور انھوں نے ایک ایسے طبقہ کو وجود بخشا جس نے ایک طرف حکومت کی ابتلاؤں کو برداشت کیا، مادی سہولتوں سے محرومی اور طنز وتعریض کے تیر بھی اپنے سینوں پر سہے؛ لیکن نہ کوئی خوف ان کو اپنے مشن سے دور کر سکا اور نہ کوئی تحریص ان کی راہ میں رکاوٹ بن سکی۔

غور کیجئے کہ گذشتہ ڈیڑھ دو سو سال میں اسلام کے خلاف اس ملک میں جتنی یورشیں ہوئی ہیں، ان کا مقابلہ کس نے کیا ہے؟ جب ملک کی گلی کوچوں میں عیسائی منادلوگوں کو دعوت ارتداد دے رہے تھے تو کس نے شہر شہر اور قریہ قریہ ان کا تعاقب کیا؟ جب آریہ سماجی تحریک اُٹھی اور اس نے افلاس زدہ جاہل وناخواندہ مسلمانوں کو ہندو مذہب کی طرف لوٹنے کی دعوت دی تو کون لوگ تھے جو اس فتنہ کے مقابلہ میں سینہ سپر ہوئے؟ جب پنجاب سے انگریزوں کی شہ پر مرزا غلام احمد قادیانی نے ختم نبوت کے خلاف علم بغاوت بلند کیا تو کون لوگ اس فتنۂ کبریٰ کے خلاف اُٹھے اور ہر سطح پر اس فتنہ کی بیخ کنی کا فریضہ انجام دیا؟ جب کچھ لوگوں نے مستشرقین سے متاثر ہو کر حدیث نبوی کے حجت ودلیل ہونے کا انکار کیا؛ تاکہ شریعت کا طوق اپنے گلے سے نکال پھینکا جا سکے تو کن لوگوں نے ان جھوٹے بازی گروں کی قلعی کھولا؟ اسلام کے خلاف مسلمان نوجوانوں کو کمیونزم کا نشہ پلایا گیا تو یہ کون لوگ تھے جنھوں نے پوری معقولیت کے

ساتھ اس طوفان کا راستہ روکا ؟ اور جب مسلمانوں کے بچے کھچے شرعی قوانین کو بھی منسوخ کرنے کی سازشیں رچی جانے لگیں تو کن لوگوں نے تحفظ شریعت کی تحریک چلائی اور ان کالی گھٹاؤں کو اپنا رُخ بدلنے پر مجبور کیا ؟؟ —— یہ سب ان ہی بے نوا فقیروں اور ناسمجھ مسلمانوں کی تنقیدوں کا ہدف بننے والے مولویوں کا کارنامہ ہے ، سیاسی قائدین نے سیاسی فائدے اُٹھائے اور موقع وحال کے مطابق اپنے ضمیر کی تجارت بھی کی ، دانشور کہلانے والے حکومت کے اونچے عہدوں پر فائز المرام ہو کر اعلیٰ تنخواہیں وصول کرتے رہے اور جہاں حکومت نے ضرورت محسوس کی ان کی زبان سے اپنی باتیں کہلوائیں اور انھوں نے بھی بے تکلف حق نمک ادا کیا ؛ لیکن یہی دینی مدارس ہیں ، جنھوں نے مادی نقصان کے باوجود اپنے کاز پر استقامت کی راہ اختیار کی ۔

پھر غور کیجئے کہ ادھر سوا سو سال میں ہندوستان میں جتنی مذہبی تحریکات اُٹھی ہیں ان کی رگوں میں کن کا خون جگر دوڑ رہا ہے اور ان کا اصل سرچشمہ اور منبع کون ہے ؟ یہی مدارس ہیں جنھوں نے جماعتوں کو اچھے داعی اور مبلغ فراہم کئے ہیں ، علمی دنیا کو اسلامیات پر اعلیٰ درجہ کا لٹریچر فراہم کیا ہے ، عام مسلمانوں کو گاؤں گاؤں امام وخطیب فراہم کئے ہیں ، جن کا عام مسلمانوں کو اسلام سے جوڑے رکھنے میں بڑا کردار ہے ، جنھوں نے اُردو زبان کو زندہ رکھا ہے جس سے مسلمانوں کا بہت بڑا قومی اور دینی ورثہ متعلق ہے ، غرض یہ مدارس پاور ہاؤس ہیں ، جن سے دین کے تمام شعبوں کو غذا ملتی ہے اور اسلام کے ہر کاز کو قوت بہم پہنچتی ہے ۔

اسی لئے فرقہ پرست تنظیمیں آج سب سے زیادہ دینی مدارس کو ہدف بنائے ہوئی ہیں ، کیوں کہ انھوں نے محسوس کرلیا ہے کہ جب تک یہ مدارس اور ان درسگاہوں سے پیدا ہونے والے 'ملاّ' باقی رہیں گے ، مسلمانوں کو اسلام سے منحرف کرنا اور ان کو اکثریت کی ثقافت میں جذب کرنا ممکن نہ ہوگا اور ان کا یہ خیال یقیناً غلط بھی نہیں ؛ بلکہ یہ حقیقت ہے کہ یہ مدارس ہی ہیں کہ ان کی وجہ سے ہندوستان میں اسپین کی تاریخ دوہرائی نہ جاسکی اور مذہبی غیرت وحمیت اور اسلامی شعار کا احترام واہتمام جس قدر اس خطہ میں پایا جاتا ہے اکثر مسلم ممالک بھی اس

میں ان کی ہمسری نہیں کر سکتے ؛ اس لئے بلا خوف تردید اور بغیر کسی طرفداری کے یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ اس وقت اسلام کی حفاظت و بقاء، اس کی دعوت و اشاعت اور اس کی سر بلندی کا سب سے بڑا ذریعہ یہی مدارس ہیں اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ان مدارس میں ایک بہت بڑی تعداد ان بچوں کی ہے جو غریب گھرانوں سے تعلق رکھتے ہیں اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ان مدارس میں ایک بہت بڑا حصہ معاشی اعتبار سے کمزور ہوتا ہے، پس ان مدارس کو زکوٰۃ ادا کرنے میں زکوٰۃ کے دونوں مقاصد کی بیک وقت تکمیل ہوتی ہے، غرباء کی ضرورت بھی پوری ہوتی ہے اور اسلام کی سر بلندی کے مقصد میں بھی مدد ملتی ہے۔

اس لئے ہمارے فقہاء نے خوب سوچ سمجھ کر ضرورت مند علماء اور علم دین حاصل کرنے میں مشغول طلبہ کو زکوٰۃ ادا کرنے کی ترغیب دی ہے اور اس کو زیادہ باعث فضیلت بتایا ہے، مشہور محدث امام عبداللہ بن مبارکؒ کے بارے میں منقول ہے کہ وہ اپنی اعانتیں علماء ہی پر خرچ کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ مقام نبوت کے بعد علماء سے بڑھ کر کوئی بلند مرتبہ نہیں، (الاتحاف : ۴ / ۴۱۷) مشہور فقیہ علامہ حصکفیؒ نے لکھا ہے جو شخص اپنے آپ کو علم کے لئے فارغ کرلے اس کے لئے زکوٰۃ لینا جائز ہے؛ کیوں کہ وہ دوسرے ذرائع معاش اختیار نہیں کر سکتا :

يجوز له أخذ الزكاة و لو غنيا إذا فرغ نفسه لإفادة العلم و إستفادته لعجزه عن الكسب۔ (درمختار مع الرد: ٦ / ۲۸۵)

ایک اور موقع پر فرماتے ہیں :

التصدق على العالم الفقير أفضل أو إلى الزهاد۔ (حوالہ سابق: ۳ / ۳۰۴)

محتاج عالم یا عابد و زاہد لوگوں پر صدقہ کرنا افضل ہے۔

اور یہ کچھ فقہاء کی طبع زاد بات نہیں ؛ بلکہ خود قرآن مجید سے ماخوذ ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

لِلْفُقَرَاءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْباً فِي الْاَرْضِ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَاءَ مِنَ التَّعَفُّفِ تَعْرِفُهُمْ

بِسِیْمَاھُمْ لاَ یَسْئَلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا وَّمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَیْرٍ فَاِنَّ اللّٰہَ بِہٖ عَلِیْمٌ۔ (البقرۃ: ۲۷۳)

(صدقات میں) اصل حق ان حاجت مندوں کا ہے جو اللہ کی راہ میں گھر گئے ہیں، ملک میں کہیں چل پھر نہیں سکتے ، ناواقف انھیں غنی خیال کرتا ہے، سو ان سے ان کی احتیاط کے باعث، تو انھیں ان کے چہرہ کے نقوش سے پہچان لے گا ، وہ لوگوں سے لپٹ کر نہیں مانگتے اور تم مال میں سے جو کچھ خرچ کرتے ہو اللہ تعالیٰ اس کا خوب جاننے والا ہے۔

اس آیت سے صاف ظاہر ہے کہ جو محتاج اور ضرورت مند حضرات دین کے کام کی وجہ سے کسبِ معاش میں مستقل طور پر لگنے کے موقف میں نہ ہوں ، وہ صدقات اور اعانتوں کے زیادہ مستحق ہیں، اسی لئے اکابر مفسرین کا رجحان یہی ہے کہ جس وقت یہ آیت نازل ہوئی اس وقت اس سے اشارہ اصحابِ صفہ یعنی صفہ میں مقیم طالبان علوم نبوت کی طرف تھا، (دیکھئے: تفسیر کبیر: ۳/ ۶۳۶، تفسیر قرطبی: ۳/ ۳۴۰) بلکہ خود رسول اللہ ﷺ کے زمانہ سے یہ طریقہ مروج تھا کہ اہل ثروت صحابہ رضی اللہ عنہم اپنے صدقات کی کھجور اصحاب صفہ کے لئے پیش کیا کرتے تھے اور حضور ﷺ کی طرف سے ان کو اس کی ہدایت ہوتی تھی ، اس لئے یوں تو تمام محتاج وضرورت مند مسلمانوں کی زکوٰۃ سے مدد کرنی چاہئے ؛ لیکن دینی مدارس کا خصوصی استحقاق قرآن سے بھی ثابت ہے، حدیث سے بھی، سلف صالحین کے عمل سے بھی اور یہ زیادہ مکمل طریقہ پر مقاصد زکوٰۃ کو پورا کرتا ہے اور بالخصوص ہندوستان کے موجودہ حالات میں اسلام کی بقاء اور حفاظت کے لئے یہ نہایت ہی مؤثر ذریعہ اور طاقتور وسیلہ ہے۔

حکومت اور فرقہ پرست تنظیمیں چاہتی ہی ہیں کہ یہ مدارس بند ہوجائیں ؛ تاکہ اسلامی تشخصات اور مسلمانوں کی مذہبی شناخت کو مٹانے میں کوئی دشواری پیش نہ آئے اور صورتِ حال یہ ہے کہ مسلمان تو زکوٰۃ ہی پوری طرح نہیں نکالتے ہیں ؛ چہ جائے کہ بڑے پیمانے پر

ان سے نفل صدقات وعطیات کی توقع رکھی جائے،تو اب اگر زکوٰۃ کا دروازہ بھی مدارس پر بند کر دیا جائے تو وہ خود بخود کمزور ہو جائیں گے اور اس طرح مدارس کو زکوٰۃ نہ ادا کرنے کی بات بالواسطہ طریقہ پر حکومت کے معاندانہ مشن کی خاموش تکمیل ہوگی ،لہٰذا اہل نظر اس بات کو اچھی طرح سمجھ لیں کہ اگر یہ تحریک دانستہ اُٹھائی جارہی ہے تو یہ گہری اور خطرناک سازش ہے اور اگر نادانستہ کہی جارہی ہے تو زمانہ ناآگہی اور فراست ایمانی سے محرومی کے سوا اور کچھ نہیں، ہونا تو یہ چاہئے کہ مدارس کے اس نظام کو تقویت پہنچائی جائے اور مسلمانوں کو دوسرے مقاصد کے لئے بھی انفاق پر اُبھارا جائے ، نہ کہ ایسی تدبیر اختیار کی جائے کہ جس سے اعداء اسلام کی مہم کو تقویت پہنچے،اور اس سوتے ہی کو خشک کر دیا جائے جس سے دینی کاموں کے ہر شعبہ کو آبِ حیات فراہم ہوتا ہے!!

دینی وعصری درسگاہیں—تعلیمی مسائل

عصری تعلیم اور عصری درسگاہیں

تعلیم — قوموں کی شہ رگ

اسلام سے پہلے مختلف قوموں میں عورتوں کو میراث نہیں ملتی تھی، ان کا خیال تھا کہ جو لوگ دشمن سے پنجہ آزمائی کر سکتے ہیں اور قوم کی حفاظت اور مدافعت کا فریضہ سرانجام دیتے ہیں، انھیں کو میراث پانے اور خاندان کی املاک میں حصہ دار بننے کا بھی حق حاصل ہے، غرض جسمانی طاقت اور مقابلہ کی قوت کو بڑی اہمیت حاصل تھی، اسی کو قوموں کی سر بلندی کا راز اور غلبہ واقتدار کا وسیلہ تصور کیا جاتا تھا اور بڑی حد تک زمانہ کے حالات کے لحاظ سے یہ بات درست بھی تھی؛ لیکن آج حالات تبدیل ہو چکے ہیں اور اب قوموں کی تقدیر میدانِ جنگ کی للکار اور شمشیر وآہن کی جھنکار کے بجائے علم وتحقیق کے مراکز اور دانش گاہوں سے متعلق ہو گئی ہے۔

جو قوم علم وفن سے عاری اور فکر ودانش سے محروم ہو، خواہ وہ کتنی ہی بڑی تعداد رکھتی ہو؛ لیکن اس کی حیثیت مٹی کے ڈھیر کی ہے، جو ہمیشہ پاؤں تلے روندی اور قدموں کے نیچے بچھائی جاتا ہے، اس کی ایک کھلی ہوئی مثال جاپان اور خود ہمارا ملک ہندوستان ہے، ہم آبادی کے اعتبار سے دنیا کی دوسری سب سے بڑی طاقت ہیں اور ہمارے ملک کا رقبہ بھی کچھ کم نہیں، قدرتی وسائل جتنے اس ملک کو میسر ہیں، کم ہی اس کی مثال ملے گی، جاپان آبادی کے اعتبار سے بھی اور رقبہ کے اعتبار سے بھی ہم سے بہت چھوٹا ملک ہے، قدرتی وسائل میں بھی وہ ہمارا مقابلہ نہیں کر سکتا؛ لیکن آج کو ہم کو جاپان کے سامنے دست سوال پھیلانا اور کشکولِ گدائی بڑھانا پڑتا ہے، یہ صورت حال محض علم ودانش کی طاقت کا ادنی کرشمہ ہے!

اسلام وہ مذہب ہے جس نے اپنی آمد کے اول دن سے علم پر زور دیا ہے، پیغمبر اسلام ﷺ جس سماج میں پیدا ہوئے اور نبوت سے سرفراز کئے گئے، اس میں کیا کچھ برائیاں اور کوتاہیاں

نہیں تھیں؟ شرک عام تھا، سینکڑوں دیویوں اور دیوتاؤں کی پوجا ہوتی تھی، طاقت کی حکمرانی تھی، نہ جان محفوظ تھی اور نہ مال اور نہ عزت وآبرو، بے حیائی اور بے شرمی کی کوئی بات نہیں تھی جو سماج میں نہ پائی جاتی ہو، بظاہر خیال ہوتا ہے کہ ان حالات میں انسانیت کے نام اللہ تعالیٰ کا پہلا پیغام توحید خداوندی کی دعوت اور شرک وبت پرستی کی تردید کا آنا چاہئے تھا، کہ اسلام کی پوری تعلیم کا لب لباب اور خلاصہ یہی خدا کی وحدانیت کا تصور ہے، یا پھر پہلی وحی ظلم وجور کی مذمت اور عدل وانصاف کی ترغیب کی بابت ہونی چاہئے تھی ؛ کیوں کہ انسان سب سے زیادہ ضرورت مند ایسے سماج کا ہوتا ہے جو پُرامن ہو، ظلم وزیادتی سے محفوظ ہو اور بقاء باہم کے اُصول پر قائم ہو؛ لیکن غور فرمایئے کہ آپ ﷺ پر جو پہلی وحی نازل ہوئی اس میں صراحةً ان باتوں کا کوئی ذکر نہیں ؛ بلکہ فرمایا گیا کہ اپنے رب کے نام سے پڑھئے جو تمام کائنات کا خالق ہے، یعنی سب سے پہلے پیغمبر کے ذریعہ انسانیت کو جس بات کی دعوت دی گئی وہ ''تعلیم'' ہے: کیوں کہ علم ایسا سرچشمہ ہے، جس سے تمام بھلائیاں پھوٹتی ہے اور تمام مفاسد کا مداوا ہوتا ہے، اسی لئے امام مالکؒ نے فرمایا کہ علم روشنی ہے: **''العلم نور''**۔

اگر کوئی مکان اندھیرا ہو تو اس میں چور اور ڈاکو کا داخل ہونا بھی آسان ہوتا ہے اور وہ سانپ کیڑوں کی بھی آماجگاہ بن جاتا ہے، ان میں سے ہر ایک کا مقابلہ الگ الگ دشوار ہے؛ لیکن چراغ جلا دیا جائے اور مکان روشن ہوجائے، تو نہ چور اور ڈاکو کو گھر میں آنے کا حوصلہ ہوگا، نہ سانپ کیڑے اس مکان کو اپنا ٹھکانہ بنائیں گے، علم کو روشنی کہہ کر آپ ﷺ نے اسی حقیقت کی طرف اشارہ فرمایا ہے، ہر برائی کو الگ الگ دور کرنا اور ان کا علاحدہ علاحدہ مقابلہ کرنا آسان نہیں ؛ لیکن تمام برائیوں اور مفاسد کا اصل سرچشمہ جہالت اور علم سے محرومی ہے، کسی سماج میں جب علم کی روشنی آجائے، تو خود بخود سماج کی برائیاں دور ہوں گی اور علم ودانش کی آگ ان کو پھونک کر رکھ دے گی۔

رسول اللہ ﷺ کو اس کا اتنا پاس ولحاظ تھا کہ مکہ میں ہر طرح کی دشواری کے باوجود آپ ﷺ نے ''دارِ ارقم'' کو تعلیم وتربیت کا مرکز بنایا اور اول دن سے اپنے رفقاء کی تعلیم وتربیت کی طرف

متوجہ رہے، مکہ کا جو لٹا پٹا قافلہ مدینہ آیا اس میں سینکڑوں بے گھر و در تھے، خود آپ ﷺ کو کوئی ذاتی مکان میسر نہیں تھا اور حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کے گھر میں مہمان تھے؛ لیکن آپ ﷺ نے نہ اپنے لئے گھر کی فکر کی اور نہ اپنے ان ساتھیوں کے لئے، جو مستقل اقامت گاہ سے محروم تھے؛ بلکہ سب سے پہلے مسلمانوں کے لئے ایک عبادت گاہ اور دینی مرکز کی حیثیت سے ''مسجد نبوی'' کی تعمیر فرمائی اور پہلی باضابطہ درسگاہ ایک چبوترہ کی شکل میں قائم کی، جسے ''صفہ'' کہا جاتا تھا، یہی چھوٹی سی جگہ جزیرۂ عرب کے کونے کونے سے آنے والے مسلمانوں کی تعلیم وتربیت کا مرکز تھی اور خود رسول اللہ ﷺ اس کے منتظم اور استاذ تھے، حضور ﷺ کا یہ عمل ہمیں بتاتا ہے کہ مسلمان گھر بار اور دوسرے اسبابِ آسائش سے بڑھ کر اپنے بچوں کی تعلیم پر اولین توجہ دیں کہ جو قوم اپنا گھر پھونک کر علم کا چراغ جلانا نہ جانتی ہو، سربلندی و درخشانی کبھی اس قوم کے حصہ میں نہیں آسکتی۔

اگر تاریخ کے عجوبہ اور حیرت انگیز واقعات کو جمع کیا جائے تو اس میں ایک یہ بھی ہوگا کہ غزوۂ بدر میں ستر اہل مکہ مسلمانوں کے ہاتھ گرفتار کئے گئے، اس وقت مسلمان سخت معاشی مشکلات سے گزر رہے تھے، نہ ان کو معقول غذا میسر تھی، نہ ضرورت کے مطابق لباس تھا اور نہ مناسب رہائش گاہ، اور تو اور خود آپ ﷺ کے یہاں ہفتوں چولہا سلگنے کی نوبت نہ آتی تھی، اس عہد میں شاید ہی کوئی مسلمان گھر ہو جو فاقہ مستی کی لذت سے نا آشنا رہ گیا ہو، یہ موقعہ تھا کہ آپ ﷺ فدیہ کے طور پر اہل مکہ سے زیادہ سے زیادہ پیسے حاصل کر لیتے اور مدینہ کی معیشت کو سہارا دیتے۔

لیکن آپ ﷺ نے ان اسیرانِ بدر کا فدیہ یہ بھی مقرر کیا کہ جو لوگ لکھنا پڑھنا جانتے ہوں، وہ دس مسلمانوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دیں، آپ ﷺ کے اس عمل میں اُمت کے لئے اُسوہ ہے کہ گو ہمیں بھوکے رہنا پڑے، ہماری کروٹیں فاقوں سے بے سکون ہوں اور دنیا کے اسبابِ راحت ہمیں کم سے کم میسر ہوں؛ لیکن ہر قیمت پر ہم اپنے بچوں کی تعلیم وتربیت کو اولیت دیں اور تعلیم سے محروم کر کے ہم ان کے اور پوری قوم کے مستقبل کو ضائع نہ ہونے دیں، آپ ﷺ کے اس عمل سے یہ بات بھی واضح ہوئی کہ اسلام نے تعلیم میں کسی تنگ ذہنی اور تعصب کو راہ

نہیں دی ہے، علم کا حصول بہر حال ایک نعمت ہے چاہے وہ غیر مسلموں سے حاصل ہو؛ بلکہ ان لوگوں سے حاصل ہو جن سے ہماری زندگی کے وجود کو بھی خطرہ لاحق ہے، بشرطیکہ ان سے ہمارے ایمان وعقیدہ اور ہماری مذہبی قدروں کو نقصان کا اندیشہ نہ ہو۔

اسلام کسی بھی ایسے علم کا مخالف نہیں جو انسانیت کے لئے نافع ہو، نہ وہ کسی زبان کا مخالف ہے، خود رسول اللہ ﷺ نے اپنے بعض رفقاء کو عربی زبان کے علاوہ بعض دوسری زبانوں کے سیکھنے کی ہدایت فرمائی اور فرمایا کہ تمام ہی زبانیں اللہ کی پیدا کی ہوئی ہیں، علم نافع کو آپ ﷺ نے بہترین عبادت قرار دیا ہے، (مجمع الزوائد: ۱؍۱۲۰) اور علم کے حصول کو ہر مسلمان کا مذہبی فریضہ مقرر فرمایا، آپ ﷺ نے فرمایا کہ انسان کی موت کے بعد بھی تین چیزوں کا اجر اسے پہنچتا رہتا ہے، من جملہ ان کے ایک ایسا علم ہے جس سے اس کے بعد بھی لوگوں کو نفع پہنچتا رہے۔

افسوس کہ جس امت کو سب سے پہلے پڑھنے کی تعلیم دی گئی اور اس کے ہاتھوں میں قلم تھمایا گیا، وہی ہے کہ آج جہالت وناخواندگی اور تعلیم سے محرومی اس کے لئے وجہِ امتیاز بنی ہوئی ہے اور دبی کچلی قومیں بھی اس میدان میں اسے پیچھے چھوڑ چکی ہیں، ایک ایسی قوم کے لئے جس نے سیکڑوں سال تک اس ملک کے طول وعرض پر حکومت کی ہے اور آج بھی اس ملک کا کوئی خطہ نہیں جہاں اس کی فرماں روائی اور عظمتِ رفتہ کے انمٹ اور قلب ونگاہ کو محوِ حیرت کر دینے والا نقوش موجود نہ ہوں، مگر عظمتِ رفتہ کے یہ نقوش آج ہمیں منھ چڑاتے ہیں اور زبان حال سے ہم پر قہقہہ زن ہیں کہ یہ کیسی قوم ہے کہ جس کے حال کو اس کے ماضی سے کوئی رشتہ نہیں؟؟

اس ذلت اور پستی سے نکلنے کے لئے اس کے سوا اور کوئی صورت نہیں کہ مسلم محلوں اور آبادیوں کے گلی کوچوں میں تعلیم کی ایسی ہی تحریک چلائی جائے جیسے الیکشن میں اُمیدوار ووٹوں کی بھیک مانگتا ہے، مسلمان پوری قوم کو اپنا خاندان وکنبہ تصور کریں، وہ اپنے بچوں کی تعلیم پر بھی توجہ کریں اور اپنے پڑوسیوں کی بھی خبر گیری کریں کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ کوئی طالب علم پڑھتے پڑھتے رُک گیا ہو، معاشی ناہمواری نے اس کے بڑھتے ہوئے قدم تھام لئے ہوں یا وہ نفسیاتی کم حوصلگی کا شکار ہو گیا ہو، ایسے بچوں کا حوصلہ بڑھائیں اور اجتماعی طور پر سماج کے

ایسے بچوں کی تعلیمی کفالت قبول کریں ، ایسی درسگاہیں قائم کریں جس کا نصب العین قوم کی خدمت ہو، جو تعلیم کو تجارت اور روپیوں کا ٹکسال نہ سمجھتے ہوں ؛ بلکہ پوری اُمت کو ایک خاندان سمجھ کر ان کی خدمت کے لئے میدانِ عمل میں اُترے ہوں، جن کو ہوٹلوں اور معمولی کارخانوں میں کمسن مسلمان بچوں کا برتن دھونا اور جھاڑو دینا تڑپا دیتا ہو، جن کے چہرے بشرے سے ذہانت ہویدا ہے اور جن کی آنکھیں ان کی اندرونی ذکاوت وفراست کی چغلی کھاتی ہیں۔

جب تک قوم کے سربرآوردہ لوگوں میں پوری قوم کے لئے درد اور کسک پیدا نہ ہو، مسلمانوں کی پست حالی ان کی کروٹوں کو بے سکون اور ان کی آنکھوں کو بے آرام نہ کردے، مسلم تعلیمی ادارے مکان کی تعمیر کے بجائے انسان کی تعمیر کی طرف متوجہ نہ ہوں، جو تعلیم و تعلّم کو تجارت کے بجائے عبادت کا درجہ دینے آمادہ نہ ہوں اور پوری قوم میں یہ احساس نہ جاگے کہ تعلیم ہی سے ہماری تقدیر وابستہ ہے، یہ ہماری شہِ رگ ہے اور اس سے محرومی کے بعد کسی قوم کے لئے باعزت طور پر زندہ رہنا ناممکن ہے، تب تک ہمارا خوابیدہ نصیب جاگ نہیں سکتا اور ہم روٹھے ہوئے ماضی کو منا کر واپس نہیں لا سکتے !!

(۵؍جون ۱۹۹۸ء)

عصری تعلیم — اسلامی نقطۂ نظر

آج کل ہم مسلمانوں میں بھی تعلیم کی نسبت سے دینی تعلیم اور دنیوی تعلیم کی اصطلاح قائم ہوگئی ہے، قرآن وحدیث کی تعلیم کو دینی تعلیم تصور کیا جاتا ہے اور عصری علوم کے سیکھنے سکھانے کو دنیوی تعلیم کہا جاتا ہے؛ حالاں کہ اسلام نے علم کی ایسی کوئی تقسیم نہیں کی ہے؛ بلکہ علم کی دو ہی قسمیں کی گئی ہیں، ''علم نافع'' اور ''علم غیر نافع'' جو علم انسانیت کے لئے مفید اور کارآمد ہو وہ ''علم نافع'' ہے اور جو علم انسانیت کے لئے نافع ہونے کے بجائے نقصان رساں ہو اور تعمیر کے بجائے تخریب کی طرف لے جاتا ہو وہ ''علم غیر نافع'' ہے، آپ ﷺ نے علم نافع کی دُعاء مانگی ہے اور علم غیر نافع سے پناہ چاہی ہے۔

میڈیکل تعلیم ہو، انجینئرنگ کا فن ہو یا تکنیکی تعلیم کے دوسرے شعبے ہوں، یہ سب انسانی خدمت اور انسانیت کی فلاح و بہبود کے ذرائع ہیں اور یقیناً یہ علم نافع کی فہرست میں آتے ہیں، ان کا حاصل کرنا قابل تعریف ہے نہ کہ لائق مذمت، اسی لئے امام شافعیؒ سے منقول ہے کہ اصل علم دو ہی ہیں: ایک علم فقہ تاکہ آدمی زندگی بسر کرنے کا سلیقہ سیکھے، دوسرے فن طبابت تاکہ جسم انسانی کی بابت معلومات حاصل ہوسکے: '' **العلم علمان : علم الفقه للأديان ، و علم الطب للأبدان** '' (**مفتاح السعادة**، ص: ۳۰۲) حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ریاضی اور بعض اور فنون کا بھی ذکر کیا ہے۔ (حوالہ سابق)

اسلام نہ کسی علم کا مخالف ہے اور نہ کسی زبان کا، قرآن مجید نے کتنے ہی ایسے حقائق پر روشنی ڈالی ہے جن کا تعلق فلکیات، طبعیات، نباتات اور حیوانات کے علوم سے ہے، خود انسان کی اندرونی جسمانی کیفیات، اس کی مرحلہ وار پیدائش اور اس کی نفسیات کا بھی بار بار تذکرہ کیا گیا ہے، گزشتہ اقوام کے قصص و واقعات ذکر کئے گئے ہیں، ان کی آبادی اور ان پر ہونے

والے عذاب خداوندی کے محل وقوع کی طرف اشارے کئے گئے ہیں اور پھر ان تمام چیزوں میں غور وفکر اور تدبر کی دعوت دی گئی ہے، ظاہر ہے کہ یہ تدبر ان علوم کی تحصیل کے بغیر کیوں کر ممکن ہوگا؟ اور ان کو حاصل کئے بغیر کیسے ان میں تفکر کا حق ادا کیا جا سکتا ہے؟

پس ان علوم کو حاصل کرنا جن سے کائنات کے اسرار ورموز کو جانا جا سکے، قرآن مجید کا عین مطلوب ہے، چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے زمانہ میں دوسری اقوام سے جو جدید تکنیک حاصل ہو سکتی تھی، اس میں کسی بخل سے کام نہیں لیا اور اس کو کبھی تقاضۂ دین کے منافی تصور نہیں فرمایا، مدینہ کے لوگ زراعت پیشہ تھے اور اسلام سے پہلے کھجور کے نر اور مادہ درخت میں اختلاط کی ایک خاص صورت اختیار کرتے تھے، جس کو ''تابیر'' کہا جاتا تھا، آپ ﷺ نے ابتداء اسے بے فائدہ اور فضول عمل تصور کرتے ہوئے اس سے منع فرما دیا؛ لیکن جب اس سال پیدا وار کم ہوئی اور لوگوں نے آپ سے اس کا ذکر کیا، تو آپ ﷺ نے اپنی رائے پر اصرار نہیں فرمایا اور آئندہ ایسا کرنے کی اجازت دیتے ہوئے کہا کہ تم اپنے دُنیا کے اُمور کے بارے میں زیادہ واقف ہو: ''**أنتم أعلم بأمور دنیاکم**''۔ (مسند احمد: ۱۲۴۳۶)

آپ ﷺ نے بعض غزوات میں 'منجنیق' کا استعمال فرمایا، یہ گویا اس زمانہ کی توپ تھی، جس کے ذریعے پتھر کی چٹانیں دور سے دشمن کے قلعوں اور فصیلوں پر پھینکی جا سکتی تھیں، فتح مکہ کے بعد جب بنو ثقیف پر فوج کشی کی تو بنو ثقیف کی ماہرانہ تیر اندازی نے مجاہدین کو بڑی دشواری میں ڈال دیا، اس موقعہ سے آپ ﷺ نے ایسی گاڑیاں بنوائیں، جس پر اُوپر چمڑے کا غلاف ڈالا گیا؛ تاکہ دشمن کے تیر چمڑے میں پھنس کر رہ جائیں اور مجاہدین قلعہ کی فصیل تک پہنچ سکیں، غزوۂ خندق کا واقعہ تو مشہور ہی ہے کہ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کے مشورہ پر آپ ﷺ نے میدان جنگ کی پشت پر پہاڑیوں کو رکھتے ہوئے آگے کی سمت سے طویل وعریض خندق کھدوائی، یہ عربوں کے لئے بالکل نیا تجربہ تھا اور اس حسن تدبیر کے نتیجہ میں اعداء اسلام کی متحدہ قوت (جو تقریباً دس ہزار افراد پر مشتمل تھی) خاسرو ناکام واپس ہوئی اور اسلام کا ایسا رعب قائم ہوا کہ پھر کبھی اہل مکہ کو مدینہ کی طرف دیکھنے کی ہمت نہ ہوئی۔

اسی لئے اسلامی عہد میں قدیم سائنسی علوم کو نہ صرف قبول کیا گیا؛ بلکہ ان علوم کا ترجمہ اور ان پر مزید ریسرچ اور تحقیق کو جاری رکھنے کے لئے دار الخلافہ بغداد میں ''بیت الحکمت'' کا قیام عمل میں آیا اور مسلمان سائنس دانوں نے وہ کارہائے نمایاں انجام دئے کہ علم وفن کی تاریخ ان کے ذکر کے بغیر اَدھوری اور نا تمام رہے گی، چنانچہ خود منصف مزاج اور حقیقت پسند مغربی مصنفین نے بھی مسلمانوں کے اس علمی اور تحقیقی کارنامہ کا اعتراف کیا ہے اور اسے خراج تحسین پیش کیا ہے۔

یہی حال لغت اور زبان کا ہے، زبان کوئی بھی اچھی اور بری نہیں ہوتی، زبان تو محض ذریعۂ اظہار ہے، اگر اس کا استعمال خیر اور نیکی کی تبلیغ واشاعت کے لئے ہو تو قابل تعریف اور لائق ستائش ہے اور زبان خواہ کوئی بھی ہو، اگر اس کو برائی کی دعوت واشاعت کا وسیلہ بنالیا گیا، تو اس سے زیادہ نامبارک بات کوئی نہیں ہوسکتی، عربی زبان، قرآن وحدیث کی زبان ہے اور آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہی اہل جنت کی زبان ہوگی؛ لیکن اسی زبان میں بعض ایسی اسلام دشمن اور اخلاق دشمن تحریریں وجود میں آئیں کہ جن سے شاید شیطان کو بھی شرم آتی ہوگی۔

آپ ﷺ نے فرمایا کہ تمام زبانیں اللہ تعالیٰ ہی کی پیدا کی ہوئی ہیں، قرآن مجید ہمیں بتاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر قوم میں انھیں کی زبان میں اپنا کلام نازل فرمایا ہے، تو نہ معلوم کتنی زبانیں ہیں جن کو اللہ کے کلام کے حامل ہونے کا شرف حاصل ہے، اس لئے کسی مسلمان کے لئے یہ بات ممکن نہیں کہ وہ کسی بھی زبان کو بحیثیت زبان برا تصور کرے اور ان کے سیکھنے سکھانے کو بد دینی اور گمراہی سمجھے، آپ ﷺ نے اپنے ایک ذہین رفیق حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کو باضابطہ عبرانی زبان سیکھنے کی ترغیب دی تھی، جسے بہت کم عرصہ میں انھوں نے سیکھا اور اس زبان کے سمجھنے اور سمجھانے کے لائق ہوئے؛ بلکہ کہا جاتا ہے کہ وہ چھ زبانوں سے واقف تھے، حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ فارسی زبان سے واقف تھے، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں بھی بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی قدر فارسی میں بھی گفتگو کر لیتے تھے۔

نہ جانے کہاں سے یہ غلط فہمی پیدا ہوگئی کہ علماء جدید علوم اور انگریزی زبان کے حاصل

کرنے کومنع کرتے ہیں یا یہ کہ کسی زمانے میں انھوں نے اس سے منع کیا تھا، یہ محض غلط فہمی ؛ بلکہ بہت بڑا مغالطہ ہے، علماء نے کبھی اس کی مخالفت نہیں کی، مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے جب دیوبند میں دارالعلوم کی بنیاد رکھی تو سنسکرت زبان کو بھی داخل نصاب فرمایا، سنسکرت زبان میں مشرکانہ محاورات وتعبیرات زیادہ ہیں، یہ بات کیوں کر سوچی جاسکتی ہے کہ مولانا نانوتویؒ سنسکرت زبان کے مخالف نہ ہوں اور انگریزی زبان کے مخالف ہوں، دیوبند کے نصاب میں شروع ہی سے انگریزی، جیومیٹری اور فلسفہ داخل نصاب رہا۔

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے بعد ہندوستان میں مسلمانوں کی دوسری عصری درسگاہ جامعہ ملیہ ہے، شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ نے اس کی بنیاد رکھی اس کے افتتاح میں نہایت بلیغ خطبۂ صدارت ارشاد فرمایا اور اس یونیورسٹی کے قیام کی ستائش کی، دارالعلوم ندوۃ العلماء کی بنیاد ہی اسی نقطۂ نظر کے تحت پڑی کہ دینی تعلیم کے ساتھ عصری علوم کا بھی ایک متوازن حصہ شریک نصاب رکھا جائے، مولانا اشرف علی تھانویؒ نے تو انگریزی زبان کے حصول کو فرض کفایہ قرار دیا ہے، مولانا نانوتویؒ کی جب ایک انگریز سے اسلام کے بارے میں ترجمان کے واسطہ سے گفتگو ہوئی اور آپ نے محسوس کیا کہ وہ آپ کی ترجمانی کا حق ادا نہیں کر پا رہا ہے تو آپ کو اس پر بڑا افسوس ہوا اور اس وقت آپ نے اس ضرورت کا احساس فرمایا کہ فی زمانہ علماء اور مبلغین اسلام کے لئے انگریزی زبان سے واقفیت بھی ضروری ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ علماء نے کبھی بھی انگریزی زبان اور عصری علوم کی مخالفت نہیں کی، ہاں یہ ضرور ہے کہ ہندوستان میں بعض ایسی شخصیتیں عصری تعلیم کا جھنڈا لے کر اٹھیں جو اگر چہ اسلام اور مسلمانوں کے تئیں مخلص تھیں ؛ لیکن جیسا کہ عام طور پر مفتوح قومیں فاتحین کے سامنے نہ صرف مادی اور فوجی اعتبار سے ؛ بلکہ فکری اور ثقافتی اعتبار سے بھی سپر انداز ہوجاتی ہیں اور احساس مرعوبیت میں مبتلا ہوکر فاتحین کے افکار اور ان کی تہذیب وثقافت کو بھی رشک وتحسین کی نگاہ سے دیکھنے لگتی ہیں، اسی طرح انھوں نے بھی مغرب سے آنے والی ہر چیز پر لبیک کہنا شروع کیا، علماء کو اس انداز فکر سے اختلاف تھا، نہ کہ عصری تعلیم اور اس درسگاہ سے، جہاں تک

ان مدارس کی بات ہے جہاں خالص اسلامی علوم وفنون پڑھائے جاتے ہیں، تو وہاں پوری طرح عصری علوم کو شامل نصاب کرنا طلبہ کو بیک وقت دونوں علوم سے محروم کردینے کے مترادف ہوگا، اسلام ایک زندہ مذہب ہے اور اسلامی علوم وفنون کی کم از کم تعداد چودہ پندرہ تو ہے ہی، پھر ان میں سے ہر فن کی مختلف اور متعدد شاخیں ہیں، ان سب کا حق ادا کرتے ہوئے عصری علوم کو بھی بہ کمال وتمام شامل نصاب رکھنا عملاً ایک ناممکن امر ہے، اسی لئے ان مدارس کے نصاب میں عصری علوم کا حصہ کم رکھا گیا ہے؛ لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ علماء اور دینی جامعات عصری تعلیم کی مخالف ہیں۔

اس وقت اس بات کی بڑی ضرورت ہے کہ مسلمان اعلیٰ فنی تعلیم کی طرف توجہ دیں اور کوشش کریں کہ ہمارے سماج میں کوئی بچہ تعلیم سے محروم رہنے نہ پائے، تعلیمی سروے سے یہ بات ظاہر ہے کہ پرائمری سے ہائی اسکول تک پہنچتے پہنچتے مسلمان بچوں کی بڑی تعداد تعلیم چھوڑ دیتی ہے، کالج تک جو تعداد پہنچ پاتی ہے ان کا تناسب اور بھی کم ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ اعلیٰ تعلیم اور مسابقتی امتحان تک ان کا تناسب ناقابل شمار حد تک کم ہوجاتا ہے، یقیناً ان میں سے بہت سے بچے ذہین وذکی ہوتے ہوں گے اور محض اقتصادی حالات کی وجہ سے انھیں ترکِ تعلیم کرنا پڑتا ہوگا، آپ ہندوستان کے کسی بھی بڑے شہر میں چلے جائیں اور ہوٹلوں میں معمولی درجہ کا کام کرنے والے چھوٹے چھوٹے بچوں کو دیکھیں، ان میں اکثریت مسلمان بچوں کی ہوگی، ان کی آنکھوں میں ذہانت جھانکتی ہوگی اور ان کی پیشانیوں پر فراست کی چمک ہوگی؛ لیکن معاشی حالات نے ان کے پاؤں تھام لئے ہیں اور وہ اس بات پر مجبور ہیں کہ برتن دھوکر اور جھاڑو دے کر اپنا اور اپنے گھر والوں کا پیٹ بھریں۔

بدقسمتی سے جو ادارے اقلیتوں کی طرف منسوب ہیں اور ان کو مسلم ادارہ سمجھا جاتا ہے، وہ عام طور پر تعلیم کو ایک مقدس قومی فریضہ سمجھنے کے بجائے ایک ایسی ''تجارت'' کا تصور رکھتے ہیں جو کم خرچ میں زیادہ سے زیادہ اور جلد سے جلد نفع حاصل کرنے کے اُصول پر مبنی ہے، غریبوں پر ان اداروں کا دروازہ بند ہے اور انھیں لوگوں کے لئے یہاں حصول تعلیم کی گنجائش

ہے جو خطیر اور کثیر رقم خرچ کر کے غیر اقلیتی اداروں میں بھی تعلیم حاصل کر سکتے ہیں، کاش! قوم کا ہر فرد پوری اُمت کو ایک خاندان اور کنبہ تصور کرنے کو تیار ہو، قوم کے بچوں کی جہالت اور تعلیم سے محرومی ان کو اسی طرح بے چین کر دے، جیسے خود اپنے بچوں کی جہالت اور آج کے ''تاجران علم'' اس بات کا احساس کریں کہ تعلیم ایک عبادت ہے نہ کہ تجارت۔

(۱۲؍جون ۱۹۹۸ء)

فلکیات اور مسلمان سائنسداں

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ حکمت مومن کا گمشدہ مال ہے ''**الکلمة الحکمة ضالة المؤمن**'' (سنن الترمذی: ۲۶۸۷) انسان کی فطرت یہ ہے کہ یوں تو مال وزر کی محبت اس کے رگ وریشہ میں سمائی ہوئی ہے؛ لیکن خاص کر اپنی گم شدہ چیز کی طرف وہ بہت لپکتا اور تیزی سے بڑھتا ہے، اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا کہ علم ودانش کی باتوں سے ایک مسلمان کو ویسا ہی انس ہونا چاہئے جیسا کہ اپنی گم شدہ شئے کے ملنے پر انسان محسوس کرتا ہے، اسلام نے علم وتحقیق کی کبھی مخالفت نہیں کی بلکہ اس کی حوصلہ افزائی فرمائی، مسلمانوں نے حکماء اور سائنسدانوں کو جس طرح اپنے سر آنکھوں پر بیٹھایا اور ان کے ساتھ اعزاز واحترام کا معاملہ کیا اسلام سے پہلے اس کی کوئی مثال نہیں ملتی، مسلمانوں نے کبھی کلیسائی نظام کی طرح علم وتحقیق کے کاموں کی مخالفت نہیں کی اور نہ سائنسدانوں کو پوپ اور پادریوں کی طرح ایسے حکماء اور دانشوروں کو سزائے موت سنائی۔

اسی لئے سائنس کے تمام شعبوں میں مسلمانوں کی خدمات بہت ہی نمایاں ہیں، فلکیاتی سائنس (Cosmology) بہت ہی مشکل شعبہ سمجھا جاتا ہے؛ کیوں کہ انسان اس میں ایسی حقیقتوں سے بحث کرتا ہے جہاں تک رسائی حاصل کرنے سے وہ قاصر ہے مسلمان سائنسدانوں کی اس میدان میں بڑی اعلیٰ خدمات ہیں، مسلمان محققین میں غالباً اس سلسلے کا پہلا نام حکیم یحییٰ منصور (۲۱۴ھ) کا ملتا ہے، یحییٰ منصور نے دمشق میں قاسیون نامی مقام پر رصدگاہ تعمیر کرائی تھی، ان کو فلکیات کا پہلا مصنف مانا گیا ہے، حکیم یحي نے چاند اور بعض سیاروں سے متعلق نئے انکشافات کئے، ستاروں کے متعلق سب سے پہلے اسی سائنسداں نے زیچ (Astronomical Tables) تیار کی اور اس کا نام خلیفہ وقت مامون الرشید کی طرف

نسبت کرتے ہوئے ''زیچ مامونی'' رکھا۔

مامون رشید ہی کے دور میں فلکیات کا ایک اور محقق عباس بن سعید جوہری (م: ۲۲۹ء) تھا، اس نے مامون سے دو رصدگاہیں تعمیر کروائیں، ایک بغداد میں شماسہ کے مقام پر اور دوسری دمشق کے قریب قاسیون میں، ان رصدگاہوں کی تعمیر اور آلات رصدیہ کو نصب کرانا اور ان کی دیکھ بھال کرنا جوہری کے ذمہ تھی، اس نے اپنے تجربات اور مشاہدات کو ایک کتاب کی صورت میں مرتب کیا، اسی دور کا ایک اور ماہر فلکیات خالد بن ولید مروزی (م: ۲۳۱ھ) ہے، اس نے سورج سے متعلق نئی نئی تحقیقات کیں، اور زیچ مامونی کی ترتیب میں حکیم یحییٰ منصور کا تعاون کیا، اس دور میں چار سائنس دانوں کو فلکیاتی سائنس کا عناصر اربعہ کہا جاتا تھا، جن کے نام اس طرح ہیں :

حکیم یحییٰ بن منصور، خالد بن عبد الملک مروزی، سند بن علی، اور عباس بن سعید جوہری، یہ اس دور کے بہت ہی ممتاز اور کلیدی سائنس داں تھے۔

مسلم سائنس دانوں میں ایک معروف نام ابوعباس احمد محمد فرغانی (م: ۲۴۳ھ) کا آتا ہے، یہ شخص علم ہیئت میں ید طولیٰ رکھتا تھا، یہی دھوپ گھڑی کا موجد ہے، اسی نے طغیانی ناپنے کا آلہ ایجاد کیا، جس سے دریا کے پانی کا صحیح اندازہ ہوجاتا تھا، اور سیلاب کے بارے میں معلومات ہوتی تھیں، یہ بھی مامون رشید کے ایوان علم وحکمت سے وابستہ تھا، مامون کو خیال ہوا کہ زمین کے گھیر کی پیمائش کی جائے، اس کے لئے اس نے سائنس دانوں اور انجینئروں کی ایک کمیٹی مقرر کی، جس میں قطب تارے کو بنیاد بنا کر زمین کی پیمائش کی، ان سائنس دانوں کی تحقیق کے مطابق ۲۵ ہزار ۹ میل ہے، موجودہ زمانہ کی تحقیق کے مطابق زمین کا گھیر ۲۴ ہزار ۸۵۸ میل ہے، گویا ان دونوں کے درمیان صرف ۱۵۱ میل کا فرق ہے، جو کوئی بڑا فرق نہیں، اس سے فرغانی اور اس کے رفقاء کی مہارت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے، فلکیات پر فرغانی کی ایک مشہور کتاب ''جوامع علم النجوم'' کے نام سے ہے، جس کا لاطینی زبان میں بارہویں صدی ہجری میں ترجمہ ہوا، پھر جرمنی میں ۱۵۳۷ء اور فرانسیسی میں ۱۵۴۶ء میں اس اہم کتاب کا ترجمہ شائع

ہوا۔

علی بن عیسی اصطرلابی (م: ۲۲۴ھ) کا نام فلکیاتی سائنس میں ایک نا قابل فراموش نام ہے، جس نے چاند، تاروں اور سورج کے درمیان فاصلوں کی پیمائش کا طریقہ ایجاد کیا اور اسی نے سب سے پہلے آلۂ سدس (Sex Tant) تیار کیا، جس سے کم سے کم فاصلہ بھی جانا جاسکتا ہے، پہلے اجرام فلکی کی تحقیق میں اسی آلہ سے کام لیا جاتا تھا، موجودہ زمانہ میں ورنیر اسکیل (Vernierscal) سے لیا جاتا ہے، جسے ایک فرانسیسی انجینئر نے سولھویں صدی میں ایجاد کیا ہے۔ جابر بن سنان حرانی (م: ۲۹۱ھ) بھی علم ہیئت کے ماہرین میں ہیں، ان کو فلکیاتی مشاہدات سے بڑی دلچسپی تھی، اس نے کئی آلات رصدیہ ایجاد کئے، جن میں ایک اہم آلہ ''کروی اصطرلاب'' (Spherical Astrolobe) سے معروف ہے، جس کے ذریعہ اجرامِ فلکیہ کے مشاہدہ کے وقت اس کے فاصلہ کی پیمائش بھی کی جاسکتی ہے۔

تیسری صدی ہجری میں ہی فلکیات کی ایک اہم شخصیت ابوعبداللہ محمد بن جابر بنانی (م: ۳۰۵ھ) کی ہے، زمین کی گردش اور سورج کی رفتار اس کی تحقیق کا اہم موضوع تھا، اس کی تحقیق ہے کہ سورج کی گذرگاہ کا جھکاؤ ۲/۱ء ۲۳ درجہ نہیں؛ بلکہ ۲۳ درجہ ۳۵ منٹ ہے، جابر نے یہ بات بھی ثابت کی ہے کہ زمین سورج کے گرد جس مدار میں گھومتی ہے وہ دائرہ کی طرح گول نہیں ہے بلکہ بیضوی شکل کا ہے، اس نے علم ہیئت سے متعلق کئی نقشے تیار کئے اور ان نقشوں کے مطابق زیچ (Astronomical Tables) تیار کی، جسے زیچ البنانی کہتے ہیں، جرمنی میں کئی بار یہ کتاب شائع ہوچکی ہے، اس کا ترجمہ پہلی مرتبہ لاطینی زبان میں ۱۱۱۳ء میں شائع ہوا، اس کے بعد یورپ کی متعدد زبانوں میں یہ اہم کتاب شائع ہوکر اہلِ علم ودانش کے درمیان قبول عام حاصل کرچکی ہے۔

بنانی کے شاگردوں میں ایک اہم نام حکیم ابومحمد العدلی القاینی (م: ۳۷۷ھ) کا آتا ہے، یہ بھی فلکیات کے ماہرین میں تھے، رصدگاہ کی تعمیر میں انھوں نے کئی نئے نئے آلات ایجاد کئے، اور رصدگاہ میں ان کو نصب کیا، محمد بن جابر حرانی اپنے عہد کے بڑے دانش ور بھی

تھے اور دولت مند بھی، انھوں نے ایک رصدگاہ تعمیر کی، جو مامون رشید کی شاہی رصدگاہ کے بعد سب سے اعلیٰ معیار کی حامل سمجھی جاتی تھی، سیاروں کے باہمی فاصلہ کو بھی انھوں نے زیادہ درست طریقہ پر معلوم کیا اور اپنے تجربات کو کتابی شکل میں مرتب کیا۔

فلکیات میں ایک نہایت اہم نام ابوالحسن یونس صوفی (م: ۳۹۵ھ) کا آتا ہے، یہ نہایت ہی ذہین، حوصلہ منداور عالی دماغ ماہر ہیئت تھا، اوراس نے ایسی دریافتیں پیش کیں کہ آج بھی سائنس داں اس کی تحقیقات سے اتفاق کرتے ہیں، اس نے جن چیزوں کو دریافت کیا ہے ان میں ایک اہم مسئلہ دائرۃ البروج کے انحراف (Inclination of the Eciplic) کا ہے، جو ابن یونس صوفی کے نزدیک ۲۳ درجہ ۳۵ منٹ ہے اور یہ جدید تحقیق کے مطابق ہے، صوفی نے ''اوج شمس'' (Sun's Apogee) کا فلکی طول ۸۶ درجہ ۱۰ منٹ قرار دیا، جو آج کی تحقیق سے پوری طرح ہم آہنگ ہے، اسی طرح صوفی کے نزدیک اعتدالین کے استقبال (Percession of Equinoxes) کی قدر (۵۱۴۲) سکنڈ سالانہ ہے، اس سلسلہ میں موجودہ زمانہ کی دریافت (۵۳۴۷) سکینڈ ہے، ظاہر ہے کہ یہ بہت ہی معمولی فرق ہے، غرض، یہ فلکیات کی تاریخ میں نہایت اہم سائنس داں ہیں، اور حیرت انگیز طور پر آج تک ان کی تحقیقات جدید ترین تحقیق سے ہم آہنگ ہیں۔

فلکیات میں ابوالوفاء بوزجانی (م: ۳۸۷ھ) کا گمنام نام بھی ناقابل فراموش ہے، جہاں وہ ایک ماہر ریاضی داں تھا، وہیں فلکیات کا ایک قابل قدر سائنس داں بھی؛ چنانچہ اس نے پہلی بار ثابت کیا کہ سورج میں کشش ہے اور چاند بھی گردش کرتا ہے، عمر خیام (م: ۱۰۳۹ء) یوں تو ایک شاعر اور ادیب کی حیثیت سے معروف ہے، اور شاعری نے اسے بدنام بھی کیا ہے؛ لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ ایک زبردست سائنس داں بھی تھا، اور خاص کر فلکیات اس کا اصل موضوع تھا، ملک شاہ نے ایک اعلیٰ درجہ کی رصدگاہ اصفہان میں تعمیر کرائی تھی، یہ رصدگاہ اس زمانہ میں ماہرین فلکیات کی تحقیق وریسرچ کا سب سے بڑا مرکز تھا، عمر خیام اس کا افسر اور نگراں تھا، اس نے نہایت گہرائی سے اجرام فلکی کا مطالعہ اور مشاہدہ کیا، عمر

خیام نے نہایت باریک بینی سے شمسی اور قمری سال کی پیمائش کی، اور ثابت کیا کہ شمسی سال ۳۶۵ دن ۵ گھنٹے ۴۰؍منٹ ہے، یہ موجودہ تحقیق سے صرف (۱۱ء۳) سکینڈ زیادہ ہے، اس سے عمر خیام کی مہارت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے، قمری سال بہ مقابلہ شمسی سال کے ۱۱ دن چھوٹا ہوتا ہے، اس طرح ۳۲ شمسی سال میں ۳۳ قمری سال ہوجاتے ہیں، سرکاری خزانہ کو اس ایک سال کے اخراجات سے بچانے کے لئے عمر خیام نے یہ صلاح دی کہ مذہبی امور تو قمری تقویم سے متعلق رہیں اور مالیہ، بجٹ اور تنخواہوں کی ادائیگی شمسی سال سے ہو، شمسی سال میں ہر سال ۳۰ دن کے مہینے کے لحاظ سے ۵ دن بڑھ جاتے تھے، جس کو عرب ''کبیسہ'' کہتے تھے، خیام نے اس کے لئے یہ تدبیر کی کہ بعض مہینوں کو ۳۱ دن کا بنادیا، تاکہ ان کا مجموعہ ۳۶۵ دن قرار پائے، پھر ۳۶۵ دن کے سال کے بعد بھی ہر سال قریب چھ گھنٹہ زیادہ ہوتا تھا، اس کا حل یوں نکالا کہ ہر چوتھے سال میں ایک دن کا اضافہ کرکے ۳۶۶ دنوں کا سال قرار دیا، یہی شمسی تقویم ہے جو آج تک یورپ میں مروج ہے، شمسی تقویم کی یہ اصلاح خیام کا ایسا کارنامہ ہے، کہ اہل یورپ کو ہمیشہ ان کا شکر گذار اور احسان شناس ہونا چاہئے۔

غرض، یہ ہمارے بزرگوں ہی کے علمی کارنامے ہیں، جن سے روشنی حاصل کرکے یورپ ستاروں سے آگے اپنی کمند ڈالنے کے لئے فکرمند ہے اور ہم ایسے گرد کارواں ہیں کہ خود اپنے کارواں کو فراموش کرچکے ہیں۔

(۲۶؍مئی ۲۰۰۰ء)

میڈیکل سائنس اور مسلمانوں کی خدمات

اسلام میں بنیادی طور پر علم کی دو ہی قسمیں کی گئی ہیں، علم نافع اور علم غیر نافع، علم نافع سے ایسے علوم مراد ہیں جو انسانیت کے لئے دنیا یا آخرت کے اعتبار سے فائدہ مند ہوں، غیر نافع وہ علوم مراد ہیں جو دین یا دنیا کے اعتبار سے بے فائدہ یا نقصان دہ ہوں، رسول اللہ ﷺ نے ایسے علم سے اللہ کی پناہ مانگی ہے جو غیر مفید ہو اور ایسے علم کی اللہ سے دُعاء مانگی ہے جو نفع بخش ہو، آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا کہ حکمت مؤمن کا گمشدہ مال ہے: "**الحکمة ضالة المومن**" اس ارشاد کا منشاء بھی یہی ہے کہ جو علم وحکمت کی بات حاصل ہو اور وہ انسانیت کے مفاد میں ہو، اسی کو اس رغبت اور اشتیاق کے ساتھ حاصل کرنا چاہئے، جیسا کہ کوئی شخص اپنے گمشدہ مال کو محبت وتڑپ اور شوق ورغبت کے ساتھ حاصل کرتا ہے۔

جو علوم انسانیت کے لئے نافع اور فائدہ مند ہیں، ان میں ایک طب اور میڈیکل سائنس ہے، یہ خدمت خلق کا نہایت اہم ترین اور ضروری ترین ذریعہ ہے؛ کیوں کہ کوئی انسان اس ضرورت سے بری نہیں، دولت مند ہو یا غریب، بادشاہ ہو یا رعایا، طاقت ور وتنومند ہو یا جسمانی اعتبار سے کمزور ونحیف بیماری کے پنجہ سے کوئی محفوظ نہیں، یہ بیماری ہی دراصل انسان کے عجز اور خدا کے سامنے اس کی مجبوری ومقہوری کی سب سے بڑی دلیل ہے، ورنہ نہ جانے انسان کس قدر خودسر اور سرکش ہوجائے، اس لئے میڈیکل سائنس نہ صرف انسان؛ بلکہ تمام حیوانات کے لئے ایک ناگزیر ضرورت ہے اور اب تو طب وعلاج کا دائرۂ فیض نباتات تک متعدی ہوگیا ہے، اسی لئے سیدنا حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اصل علم تو دو ہی ہیں ایک تو فقہ طریقۂ زندگی کو سمجھنے کے لئے اور دوسرے طِبّ اصلاح بدن کے لئے: "**العلم علمان، علم الفقه للأديان وعلم الطب للأبدان**" اسی طرح کی بات مشہور فقیہ اور محدث امام شافعیؒ

سے بھی منقول ہے۔

اسی لئے مسلمانوں نے شروع سے اس فن کو اپنی تحقیق کا خاص موضوع بنایا ہے اور اس سلسلہ میں مسلمان اطباء کی خدمات اتنی واضح اور نمایاں ہیں کہ ان کو ہر گز نظر انداز نہیں کیا جاسکتا، مغرب نے باوجود اس کے کہ مسلمانوں کی علمی اور سائنسی خدمات پر پردہ رکھنے کی بے حد کوششیں کی ہیں، اس کے باوجود کہیں کہیں وہ بھی اس بات پر مجبور ہوئے کہ مسلمان سائنس دانوں کی خدمات کا اعتراف کریں، مسلمان اہل فن کا عام طریقہ رہا ہے کہ وہ کسی کام کو اپنی طرف منسوب کرنے سے گریز کرتے تھے اور اس کو اخلاص کے خلاف سمجھتے تھے، اسی لئے آج کل جس طرح نو ایجاد دواؤں اور دریافتوں کو لوگ اپنے نام سے موسوم کرتے ہیں، مسلمانوں کے یہاں یہ طریقہ مروج نہیں تھا، اس لئے مسلمانوں کی بہت سی تحقیقات پر پردۂ گمنامی پڑا ہوا ہے، اس کے باوجود مسلمان سائنس دانوں کی جو خدمات روشنی میں آ گئی ہیں، وہ بھی کچھ کم نہیں ہیں، اس وقت ان ہی خدمات کا ایک سرسری تذکرہ مقصود ہے۔

اس سلسلہ میں ایک اہم ترین نام ابوالحسن علی بن سہل طبری (۲۵۱ھ) کا آتا ہے، جو بغداد کے تمام شفا خانوں پر نگرانِ اعلیٰ تھے، یہ اپنے طبّی تجربات کو ڈائری میں قلمبند کرتے جاتے تھے جس کا تعلق ادویہ کی خصوصیات، علم الحیوانات، صحت، موسم اور آب و ہوا سے ہوتا، ان ہی تجربات کو انھوں نے ایک ضخیم کتاب کی صورت میں ابجدی ترتیب سے ''فردوس الحکمت'' کے نام سے مرتب کیا، یہ پہلی طبّی انسائیکلوپیڈیا ہے، جو طبری کا بہت بڑا کارنامہ ہے، اس کے علاوہ بھی طب کے موضوع پر طبری کی بعض اور بھی کتابیں ہیں، طب کا ایک اہم شعبہ آنکھ سے متعلق علاج کا رہا ہے، آنکھ انسانی جسم کا انتہائی نازک عضو ہے، جو بہت ہی باریک شریانوں پر مشتمل ہے، ابوالقاسم عمار موصلی (۳۷۷ھ ۱۰۰۵ء) امراضِ چشم کے نہ صرف بڑے ماہر تھے؛ بلکہ اس شعبہ میں کئی جدید تحقیقات و اکتشافات بھی پیش کئے، موتیا بند کا آپریشن سب سے پہلے عمار موصلی ہی نے کیا، گویا موصلی آنکھوں کا سب سے بڑا سرجن ہے، آنکھ سے متعلق بیماریوں اور ان کے علاج کے طریقوں کی بابت اپنی تحقیقات اور تجربات کا نچوڑ

موصلی نے ''علاج العین'' کے نام سے مرتب کیا، جو اس فن کی نہایت اہم کتاب تصور کی جاتی ہے، یورپ میں اس کا ترجمہ بہت پہلے ہو چکا ہے، ۱۹۰۵ء میں جرمنی زبان میں بھی بڑے اہتمام سے اس کا ترجمہ شائع ہوا ہے۔

اس کے بعد طبّ کی تاریخ میں وہ عظیم الشان نام آتا ہے، جسے میڈیکل سائنس کی تاریخ ابوالقاسم زہراوی (۳۹۵ھ،۱۰۰۹ء) کے نام سے یاد کرتی ہے اور اس کے سامنے جبین عقیدت خم کرتی ہے، یہ طب کی تاریخ کا پہلا سرجن ہے، جس نے آپریشن کے فن کو مرتب کیا، اس کے آلات بنائے اور ایک سو سے زیادہ آلات سرجری ایجاد کئے، موتیا بند اور ٹونسل کا آپریشن کیا، آپریشن کے ذریعہ ہڈیوں کو جوڑا، جسم کے اندرونی حصہ میں آپریشن کے نازک طریقے ایجاد کئے، حلق، سر، گردہ، پیٹ اور آنکھوں کے آپریشن کا طریقہ بتایا، مریض کو بے ہوش کرنے کے سلسلہ میں مناسب دواؤں کی رہنمائی کی، کینسر کے مرض پر خاص تحقیق کی اور بتایا کہ کینسر کے پھوڑے یا زخم کو چھیڑنا نہیں چاہئے، غرض! سرجری کی دنیا میں اس کے کارنامے نا قابل فراموش ہیں، مغربی مصنفین کو بھی جس کا اعتراف ہے، زہراوی نے اپنے طبی تجربات کو ڈائری کی صورت میں لکھنے کا اہتمام کیا، یہ ڈائری ''تصریف'' کے نام سے موسوم ہے اور سرجری کے فن میں نہایت اعلیٰ کتاب تصور کی جاتی ہے۔

تاریخ طب کا کون رمز آشنا ہوگا، جو امام ابوبکر محمد زکریا رازی (۳۰۸ھ، ۹۳۲ء) کے نام سے نا آشنا ہو، ۱۹۳۰ء میں پیرس میں رازی کی ہزار سالہ برسی بڑے اہتمام سے منائی جا چکی ہے اور بین الاقوامی طبی کانگریس کے اجلاس لندن منعقدہ ۱۹۱۳ء میں رازی اور فنِ طب کو ایک اہم موضوع کی حیثیت سے شریک رکھا گیا اور ان کو فن طب کا امام تسلیم کیا گیا، طب کے میدان میں رازی کی خدمات بہت وسیع ہیں، فرسٹ ایڈ کا طریقہ رازی ہی کی ایجاد ہے، اس نے جڑی بوٹیوں پر بہت تجربات کئے ہیں، وہ طبعیات (Physics) کا بھی بڑا ماہر تھا، اسی نے نامیاتی اور غیر نامیاتی کیمیا کی تقسیم کی ہے، دواؤں کے صحیح صحیح وزن کے لئے ''میزان طبعی'' (Hydrostatic balance) ایجاد کی، جس سے چھوٹی چیز کا بھی وزن معلوم کیا جا سکتا

ہے جراحی کے لئے نشتر (Seton) اسی نے بنایا ہے، الکحل جو آج ایک کثیر المقاصد محلول ہے، رازی ہی اس کا موجد ہے، رازی کا سب سے بڑا طبی کارنامہ چیچک کے بارے میں اس کی تحقیقات ہیں، اس نے چیچک پر تحقیق کی، اس کے اسباب دریافت کئے، احتیاط اور علاج کا طریقہ بتایا اور اس مرض کے بارے میں اپنی تمام تحقیقات کو کتابی شکل میں مرتب کیا، جو چیچک کے موضوع پر دنیا کی پہلی کتاب ہے، یہ کتاب مدتوں یورپ کے میڈیکل کالجوں میں داخل نصاب رہی ہے، اس کے علاوہ الحاوی، المصوری اور متعدد کتابیں رازی کے قلم کی رہین منت ہیں اور اکثر کتابوں کا یورپین زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے، رازی کو حکومت وقت نے ایک اچھے اسپتال کے قیام کے لئے مامور کیا اور بہتر جگہ کے انتخاب کرنے کا مشورہ دیا، امام رازی نے یہ تدبیر کی کہ شہر کے مختلف مقامات اور محلوں میں گوشت کے بڑے بڑے ٹکڑے لٹکا دئے اور تین دِنوں تک اس کے رنگ، بو، اور مزے میں ہونے والی تبدیلیوں کا جائزہ لیتا رہا، تین دن گذر جانے کے باوجود جس مقام کا گوشت زیادہ سے زیادہ اپنی کیفیت پر باقی رہا، رازی نے اس جگہ کا ہسپتال کے لئے انتخاب کیا، اس سے اس عظیم محقق کی ذہانت اور خداداد فراست کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

پیشہ طب میں سنان بن ثابت حرانی (۳۲۰ھ، ۹۴۳ء) کا نام بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا، جس نے فنِ طب میں پیشہ ورانہ اصلاحات کیں، اطباء کے لئے اسناد جاری کی گئیں، مطب کرنے کی اجازت دی گئی اور عطائی قسم کے اطباء کو علاج سے منع کیا گیا، اس نے حکومت کی طرف سے فنِ طب کی اہلیت کا دعویٰ کرنے والے ایک ہزار امیدواروں کا امتحان لیا، جن میں سات سو کامیاب ہوئے، ان ہی کو مطب سرٹیفکٹ جاری کی گئی، گویا پہلی بار سرکاری رجسٹریشن اور مطب کے لئے اجازت نامہ کے حصول کو لازم قرار دیا گیا، سنان بن ثابت حرانی نے گشتی شفاخانہ کا طریقہ بھی ایجاد کیا، کچھ اطباء اس بات پر مامور تھے کہ دواؤں کے ساتھ مختلف محلوں کا دورہ کریں اور مریض کا ان کے مقام پر علاج کردیں۔

علم وفن کی دنیا میں ایک نہایت قابل احترام شخصیت حکیم ابونصر فارابی (۳۳۸ھ

۹۵۰ء) کی ہے، جس کا شمار تاریخ کے ذہین انسانوں میں ہوتا ہے، فارابی مختلف علوم وفنون کا ماہراور جامع شخص تھا، ریاضی اور علم تمدن فارابی کا خاص موضوع ہے، اس کے ساتھ ساتھ وہ علم نفسیات کا بھی ماہر تھااور اس فن کوطب وعلاج سے جوتعلق ہے وہ ظاہر ہے۔

ادویہ اور میڈیسین کی تحقیق میں ایک نہایت نمایاں اور ناقابل فراموش کام ؛ بلکہ کارنامہ ابومنصور موفق ہروی (۳۴۰ھ ۹۶۱ء) کا ہے، ابومنصور نباتات (Botany) کا بڑا اعلیٰ درجے کا محقق تھا، نباتات کے علاوہ اس نے جماداتی ادویہ پر بھی تحقیق کی ہے، ادویہ پر اس کی کتاب ’’حقائق الادویۃ‘‘ بڑے معرکہ کی چیز سمجھی جاتی ہے، اس کتاب میں ۵۸۵ دواؤں کے نام اوران کی صحیح پہچان کی نشاندہی کی گئی ہے، اس نے ادویہ کوتین حصوں میں تقسیم کیا ہے، معدنی، نباتاتی اورحیواناتی، اسی نے خاصیت اور اثرات کے لحاظ سے دواؤں کے چاردرجے کئے ہیں: گرم وتر، گرم وخشک، سردوتر، سردوخشک، معدنی مفردات اورمرکبات میں ان کی کئی ایجادات اور نئے انکشافات ہیں، غرض وہ دواؤں کے مثبت اورمنفی خواص کا ماہر تھا، اس نے اس مقصد کے لئے بہت سارے تجربات کئے اورطویل و پُرمشقت اسفارکو برداشت کیا۔

’’حمل اورجنین‘‘ طب کاایک اہم اورنازک موضوع ہے، اس کے ماہر تھے عریب بن سعد الکاتب قرطبی (۳۵۶ھ، ۹۷۶ء) امراض نسواں عریب بن سعد کا خاص موضوع تحقیق ہے، حمل کے استقرار اورجنین کی حفاظت، زچہ اور بچہ نیز دایہ گری کے موضوع پرعریب کی بہت اہم تالیفات ہیں، جواس کے بہت طویل تجربات اورتحقیقات کا نچوڑ ہیں، وہ نباتات کا بھی ماہر تھا، اوراس نے نباتات سے متعلق بھی بڑے قیمتی تجربات بیان کئے ہیں۔

امراض چشم کے ماہرین میں ایک نہایت اہم نام علی بن عیسیٰ (۴۴۱ھ ۱۰۳۱ء) کا ہے، عمار موصلی کے بعد یہ دوسرے بڑے ماہر امراضِ چشم ہیں، علی بن عیسی نے امراضِ چشم سے متعلق تین جلدوں میں نہایت مفصل کتاب ’’تذکرۃ الکحلین‘‘ لکھی ہے، جو گویا اس موضوع پرانسائیکلو پیڈیا ہے، اس کتاب میں آنکھ سے متعلق ۱۳۰ بیماریوں کا ذکر آیا ہے، نیز

آنکھوں کے لئے مفید ۱۴۳ مفرد دواؤں کے نام اور ان کی خصوصیات اس کتاب میں مذکور ہیں، ۱۴۹۹ء میں اٹالین، ۱۹۰۳ء میں فرانسیسی اور ۱۹۰۴ء میں جرمنی زبان میں اس کا ترجمہ شائع ہو چکا ہے اور بڑے بڑے اہل فن نے مصنف کی عبقریت اور کتاب کی اہمیت کا اعتراف کیا ہے۔

اب اس کے بعد فنِ طب کے امام الائمہ شیخ حسین بوعلی سینا (۴۲۸ھ ۱۰۳۸ء) کا نام نامی آتا ہے، جن کے نام پر دنیاءِ طب کے بڑے بڑے اصحاب تحقیق اور ماہرین فن کی گردنِ اعتراف بھی خم ہوجاتی ہے، شیخ بوعلی سینا سو سے زیادہ کتابوں کے مصنف ہیں، جن میں سے اکثر کتابیں یورپین زبانوں میں منتقل ہوچکی ہیں، شیخ کو دنیا کی عظیم باکمال شخصیتوں میں شمار کیا گیا ہے، طبعیات، حیاتیات، تشریح الاعضاء (Biology)، منافع اعضاء (Physiology) نیز علم العلاج اور علم الامراض وعلم الادویہ کا عظیم ماہر اور محقق سمجھا جاتا ہے، شیخ کی کتابوں اور خدمات کے سرسری تعارف کے لئے بھی بڑی تفصیل مطلوب ہے، شیخ کو علم النفس کا موجد سمجھا جاتا ہے، شیخ نے اعضاء جسمانی کی اعضاء مفردہ اور اعضاء مرکبہ کی حیثیت سے جو تقسیم کی ہے وہی آج تک قائم ہے، شیخ نے روشنی کی رفتار پر بھی تحقیق کی ہے، شیخ کی مشہور کتاب ''القانون'' صدیوں یورپ کی طبی درس گاہوں میں داخل نصاب رہی ہے، اس کتاب کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ لاطینی زبان میں پندرہویں صدی میں سولہ بار اور سولہویں صدی میں بیس بار اس کا ترجمہ طبع ہو چکا ہے، ۱۹۳۰ء میں اس کا انگریزی ترجمہ ہوا، یہ کتاب پانچ جلدوں میں ہے، تشریح اعضاء، منافع اعضا اور علم العلاج اس کا موضوع ہے، ڈاکٹر ہورٹن نے جرمن زبان میں شیخ کی کتاب ''الشفاء'' کا ترجمہ کیا ہے اور اس کی شرح لکھی ہے۔

تشریح اجسام کے ماہرین اور امراضِ چشم کے باکمال معالجین میں ایک نمایاں نام، علاء الدین ابوالحسن ابن النفیس قرشی (۱۲۰۱-۱۲۸۹ء) کا ہے، ابن النفیس کا شمار دنیا کے ممتاز اطباء میں ہے، اس نے شیخ بوعلی سینا کی کتاب القانون پر بھی بحث کی ہے اور بعض اُمور

میں ان سے اختلافِ رائے بھی کیا ہے، ابن النفیس کا بہت بڑا کارنامہ حیوانی اجسام میں دورانِ خون کے نظام کی دریافت ہے، اسی نے سب سے پہلے یہ ثابت کیا کہ دورانِ خون مسلسل جاری ہے، جو پھیپھڑوں میں پہنچ کر تازہ ہوا حاصل کر کے پورے جسم میں دوڑتا رہتا ہے، عام طور پر اس تحقیق کا سہرا ولیم ہاروے "William Harvey" (۱۶۸۷ء) کے سر باندھا جاتا ہے، یہ تاریخ کے ساتھ صریحاً ناانصافی ہے، درحقیقت سب سے پہلے اس کی دریافت ابن النفیس نے کی ہے۔

طبّی تحقیقات میں لسان الدین بن خطیب (۱۳۱۳ء تا ۱۳۷۴ء) کو بھی بھلایا نہیں جاسکتا، اسی نے سب سے پہلے متعدی اور غیر متعدی امراض کی شناخت کی، پھر متعدی امراض پر تحقیق کرتے ہوئے اس بات کو ثابت کیا کہ کچھ ان دیکھے جراثیم بھی پائے جاتے ہیں، جو امراض کے متعدی ہونے کا باعث ہوتے ہیں، یقیناً یہ ابن الخطیب کا بہت بڑا کارنامہ ہے، طاعون کے مرض پر بھی اس کی تحقیقات نہایت قیمتی سمجھی جاتی ہیں، بعد میں فن طب میں جو ترقیاں ہوئیں ان میں جراثیم کے وجود کے نظریہ کو بڑی اہمیت حاصل ہوئی اور اسی کی روشنی میں نئی نئی دوائیں ایجاد پذیر ہوئیں اور جن امراض کو لاعلاج سمجھا جاتا تھا، ان کی دوائیں ایجاد پذیر ہوئیں۔

(۱۴؍جنوری ۲۰۰۰ء)

تعلیمی پسماندگی — مرض اور علاج

میرے محلہ میں ایک غیر مسلم بھنگی ہے، وہ سی، آر، پی کی ملازمت کی وجہ سے ملک کے اکثر علاقوں میں جا چکا ہے اور اب ریٹائر ہونے کے بعد محلہ ہی میں خدمت کر کے پیٹ کی آگ بجھاتا ہے، لمبا چوڑا، چھ فٹ سے بھی اونچا قد، برسات کی رات سے بھی زیادہ سیاہ رنگ، اور اوپر کی طرف چڑھی ہوئی گھنی اور بڑی مونچھیں، جہاں کام کرے وہاں اس شان سے سیلوٹ کرتا ہے کہ عام آدمی کو بھی اپنے بارے میں اعلیٰ سیاسی عہدیدار ہونے کا خیال پیدا ہو جائے، وہ اپنے ڈیل ڈول، بے آمیز رنگ اور سر اٹھائی ہوئی مونچھوں کی وجہ سے جلاد سا نظر آتا ہے؛ لیکن شکل وصورت کے اعتبار سے وہ جس قدر ڈراؤنا اور درشت محسوس ہوتا ہے، طبیعت کے اعتبار سے اسی قدر نرم و بردبار، مزاج میں بچھاؤ، کیا مجال کہ کوئی کام کہا جائے اور انکار کر جائے، اس کی اسی صفت کی وجہ سے وہ لوگوں کے درمیان ''ایک انار سو بیمار'' کا مصداق بنا رہتا ہے اور صبح ہوتے ہی کئی گھروں کے فرستادے اس کے گھر موجود ہوتے ہیں۔

کوئی سال ڈیڑھ سال پہلے کی بات ہوگی کہ مسلسل دس پندرہ دنوں نہ وہ کام پوچھنے آیا، اور نہ اس پر کہیں نگاہ پڑی، میں نے اس کے بارے میں استفسار کیا تو معلوم ہوا کہ اسے کتے نے کاٹ لیا ہے، میں نے سوچا کہ جو شخص ہمیشہ لوگوں کی خدمت کرتا ہے، یقیناً وہ بھی ہمارے حسن سلوک کا مستحق ہے؛ چنانچہ میں عیادت کے لئے اس کے گھر پہنچا، وہ واقعی بیمار تھا، یہ جان کر کہ میں عیادت کے لئے آیا ہوں، اس کا چہرہ خوشی سے دمک اُٹھا؛ کیوں کہ اس کے خیال میں بھی نہیں تھا کہ میں خود اس کی عیادت کے لئے پہنچونگا، آج کل غریب اور عزت و مرتبہ کے اعتبار سے کم درجے کا پڑوسی یا ملازم اس لائق نہیں سمجھا جاتا کہ اس کے ساتھ پڑوسیوں جیسا سلوک کیا جائے، اس لئے وہ میری آمد پر بے حد خوش تھا، اس نے اپنے گھر کے

تمام لوگوں کو میری ملاقات کے لئے بلایا، برادران وطن کے انداز میں سب نے ہاتھ جوڑ جوڑ کر پرنام کہے، ان میں کئی نو عمر اور بعض نو جوان لڑکے اور لڑکیاں بھی تھیں، یہ سب اس کے پوتے پوتیاں اور نواسے نواسیاں تھے، اس نے مجھ سے ایک ایک کا تعارف کرایا، اس کا نام یہ ہے، یہ فلاں کلاس میں زیر تعلیم ہے، اس نے فلاں امتحان پاس کرلیا ہے، غرض کوئی چھوٹا اور بڑا ایسا نہیں تھا، جو تعلیم میں مشغول نہ ہو۔

مجھے واپس کرتے ہوئے وہ بہت خوش تھا اور اس کے چہرہ کے نقوش سے شکریہ کے جذبات عیاں تھے؛ لیکن خود میں ایک خاص تاثر اور فکر کے ساتھ واپس ہورہا تھا، مجھے یہ بات بے چین کررہی تھی کہ یہ غریب گھر گھر جا کر غلاظتیں صاف کرتا ہے، دو دو چار چار پیسے محنت و مزدوری کے ذریعہ حاصل کرتا ہے؛ لیکن اس میں اس درجہ تعلیمی شعور ہے کہ گھر کے ایک ایک لڑکے اور لڑکی کو تعلیم دلانے میں مشغول ہے، اسی محلہ میں بہت سے مسلمان بھی آباد ہیں، اگر ان گھروں کا تعلیمی سروے کیا جائے تو شاید ہی دو چار فیصد بھی ایسے لوگ نکل پائیں، جن کی تعلیم میٹرک تک ہو؛ حالاں کہ ان کے پاس وسائل نسبتاً زیادہ ہیں، بچوں کی بڑی تعداد سڑکوں پر گلّی ڈنڈا اور گولیاں کھیلتی نظر آئے گی، ان کے پاس اچھے سے اچھے کپڑے ہیں، تیز رفتار موٹر سائیکلیں ہیں، تفریح کے لئے گھر میں ٹی وی اور ٹیپ رکارڈ وغیرہ کی سہولتیں ہیں اور آج کی دنیا جن آسائشوں کی خوگر ہے، ان کا پورا سروسامان بھی؛ لیکن والدین تعلیم کی اہمیت اور تعلیمی شعور سے خالی ہیں اور بچے پڑھنے لکھنے کے شوق اور جذبۂ مسابقت سے عاری۔

ایسا نہیں ہے کہ تمام مسلمان محلوں اور آبادیوں کا یہی حال ہے؛ لیکن یہ ایک حقیت ہے کہ ہم دن ورات جن اقوام کے ساتھ رہتے ہیں، ان کے یہاں حصولِ تعلیم کا جذبہ جتنا بے پناہ ہے، ہم ابھی اس میں بہت پیچھے ہیں، اس وقت صورتِ حال یہ ہے کہ دلت جنھیں ہندوستانی معاشرہ میں کوے اور چیل کے برابر سمجھا جاتا تھا، تعلیم کے میدان میں وہ بھی نمایاں مقام حاصل کرنے کے لئے شب و روز کوشاں ہیں، جن گھروں میں اسکول جانے کا کوئی تصور بھی نہیں تھا، اور بچے عقل و ہوش سنبھالتے ہی اپنے ہاتھوں میں کدال اور پھاوڑے لے کر محنت و

مزدوری کے لئے کھیتوں اور بازاروں میں گھومتے رہتے تھے، اب ان کی پیٹھ پر کتابوں کے بھاری بیگ ہوا کرتے ہیں اور انھوں نے اسکول کی دنیا کو اپنے آپ سے آباد کر رکھا ہے۔

لیکن ہم مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ ہمارا سفر پیچھے کی طرف ہے، ہم نے ترقی کی بجائے تنزل کو اور محنت کی بجائے تن آسانی وسہل انگاری کو اپنی منزل بنالیا ہے، اس کے کئی اسباب ہیں، پہلا سبب تعلیم کے معاملہ میں ہماری بے شعوری ہے، مسلمانوں میں آج بھی ایک بڑی تعداد ان لوگوں کی ہے جو تعلیم کی اہمیت سے نابلد ہیں، مسلمانوں میں جو مزدور اور کم معاش طبقہ ہے، وہ ابھی تک اسی فکر کا اسیر ہے کہ اپنے بچوں کو پتھر پھوڑنے، ہوٹلوں کی میز صاف کرنے اور اس طرح کے دوسرے کاموں میں لگا دیا جائے؛ تاکہ یومیہ دس بیس روپے آجائیں اور گھر چلانے میں آسانی ہو، باشعور مسلمانوں کی ذمہ داری ہے کہ انھیں بتائیں کہ یہ چند پیسے ان کے روشن مستقبل کو تاریک کرنے کا ذریعہ ہیں، اس لئے وہ ابھی تکلیفیں اُٹھا کر اور مشقتیں جھیل کر اپنے بچوں کو تعلیم دلائیں تو آج کے دس روپے کل دس ہزار لا سکتے ہیں، رسول اللہ ﷺ نے بدر کے قیدیوں میں پڑھے لکھے لوگوں کے لئے دس بچوں کی نوشت وخواند سکھانے کو فدیہ قرار دیا تھا، یہ وہ وقت تھا کہ مسلمان فاقہ مستیوں سے دوچار تھے اور ان کو مالی وسائل کی زیادہ احتیاج تھی؛ لیکن آپ ﷺ نے معاشی ضرورت پر تعلیمی ضرورت کو مقدم رکھا۔

تعلیم سے غفلت تاجروں کے طبقہ میں بھی پائی جاتی ہے، بعض لوگ خیال کرتے ہیں کہ اگر یہ پڑھ لکھ کر اعلیٰ تعلیم بھی حاصل کرلیں تو اس کو اسی تجارت یا کاروبار میں لگنا ہے، ایسی صورت میں زیادہ تعلیم کی کیا ضرورت ہے؟ اگر بہ قدر ضرورت تعلیم کے بعد اسے کاروبار میں لگا دیا جائے تو پیسے بھی بچیں گے اور وقت بھی بچے گا، نیز جتنی مدت اس کے حصولِ تعلیم میں لگتی، اس میں اسے کام کا اچھا خاصا تجربہ ہو جائے گا؛ لیکن یہ کھوٹی سوچ ہے، کاروبار میں اُتار چڑھاؤ ہوتا رہتا ہے، یہ کوئی قابل بھروسہ ذریعۂ معاش نہیں ہے، دُکانیں جلائی جاسکتی ہیں، سامان واسباب لوٹے جاسکتے ہیں؛ لیکن علم ایسی متاع گراں مایہ ہے کہ نہ اسے لوٹا جاسکتا ہے اور نہ جلایا جاسکتا ہے، علم انسان کا اصل جوہر ہے، اس سے انسان کی عزت اور اس کے کنبے اور قوم کا

وقار متعلق ہے، اس لئے علم بجائے خود ایک بہت بڑی نعمت ہے، جسے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا، قرآن نے اسی لئے کہا ہے کہ علم رکھنے والے اور علم سے بے بہرہ برابر نہیں ہوسکتے :

هَلْ يَسْتَوِى الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ۔ (الزمر:۹)

تعلیمی پسماندگی کا دوسرا سبب ہمارا اسراف اور فضول خرچی ہے، صورتِ حال یہ ہے کہ شادی بیاہ، بچوں کی بسم اللہ، ختنہ اور عقیقہ کی تقریبات نیز موت سے متعلق طبع زاد رسم و رواج کی تکمیل میں ہم اپنے پیسے پانی کی طرح بہاتے ہیں، سودی قرض لینے اور اپنی بنیادی ضرورت کی چیزوں کو فروخت کرنے سے بھی گریز نہیں کرتے، ظاہر ہے کہ جب ہمارے پیسے ایسی بیکار چیزوں میں خرچ ہونگے تو جائز ضروریات کے لئے پیسے کیسے بچ سکیں گے؟ اگر ہم اس اسراف کے خلاف مہم چلائیں اور اپنے اور اپنی قوم کے بچوں کی تعلیم کی فکر کریں تو انھیں پیسوں کے ذریعہ ہم ان کی تعلیمی ضرورت کو پورا کرسکتے ہیں، اگر متوسط آمدنی کے لوگ یہ طے کرلیں کہ وہ سادہ طریقہ پر اپنے بچوں کی تقریبات نکاح انجام دیں گے اور بچے ہوئے پیسوں سے اپنے بچوں کے علاوہ قوم کے ایک بچہ کی تعلیمی کفالت کریں گے، تو اس طرح سماج کے کتنے ہی غریب بچوں کی تعلیم کی صورت نکل آئے گی۔

ہماری تعلیمی پسماندگانی کا تیسرا سبب طلبہ وطالبات کے اولیاء کا اپنے بچوں کی تعلیم کی طرف سے بے تعلق اور غافل رہنا ہے، صورتِ حال یہ ہے کہ لوگ اپنے بچوں کو اسکول میں داخل کردیتے ہیں اور پھر کبھی پلٹ کر اس بات کا جائزہ نہیں لیتے کہ ان کا تعلیمی رجحان کیا ہے؟ وہ پابندی سے اسکول جا بھی رہے ہیں یا نہیں؟ مسلمان اولیاء طلبہ وطالبات سے عام طور پر اسکول کے ذمہ داروں کو یہ شکایت ہے، اولیاء کی غفلت کا نوعمر اور مستقبل کے نفع ونقصان سے بے خبر بچے بھی فائدہ اٹھاتے ہیں، وہ کثرت سے غیر حاضر رہتے ہیں، مفوضہ کام کو انجام نہیں دیتے، ڈسپلن شکنی کرتے ہیں، اساتذہ اور ذمہ داروں کے ساتھ بدتمیزی کا رویہ اختیار کرتے ہیں، اور اولیاء کے عدمِ تعاون کی وجہ سے ان کی بروقت فہمائش نہیں ہوپاتی، اس لئے ان کی بیماری بڑھتی جاتی ہے، یہاں تک کہ ناقابل علاج ہوجاتی ہے، حقیقت یہ ہے کہ تعلیم میں طلبہ،

اولیاءِ طلبہ اور اساتذہ تینوں کی ذمہ داری برابر درجہ کی ہے، اولیاءِ طلبہ کی غفلت کی وجہ سے نہ صرف ایک تہائی ذمہ داری متأثر ہوتی ہے؛ بلکہ طلبہ بھی اپنے فرائض سے غافل ہوجاتے ہیں، اس طرح دوہرا نقصان ہوتا ہے، اس لئے اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ جو اولیاءِ طلبہ خود تعلیم یافتہ ہوں وہ تو آپ اس کی اہمیت محسوس کریں اور جو اولیاء ناخواندہ یا کم پڑھے لکھے ہیں ان میں یہ شعور پیدا کیا جائے کہ وہ وقتاً فوقتاً اپنے بچوں کی تعلیم کے سلسلہ میں اسکول پہنچ کر تفتیش حال کریں۔

ہماری تعلیمی پسماندگی کا ایک اہم سبب مسلمانوں کے زیر انتظام تعلیم گاہوں کی زیادہ سے زیادہ نفع حاصل کرنے کی پالیسی رہی ہے، ہم اسٹیج پر تو اپنی قوم کو تعلیم کی طرف متوجہ کرتے ہیں؛ لیکن جو اسکول ہمارے زیر انتظام ہیں، ہم نے ان میں ''نہ نفع اور نہ نقصان'' کے بجائے ''زیادہ سے زیادہ نفع'' حاصل کرنے کی پالیسی اختیار کر رکھی ہے اور اب تعلیم ایک نفع خیز تجارت بن چکی ہے، یہ نہایت ہی تکلیف دہ رجحان ہے، جو لوگ اصحابِ ثروت ہیں، وہ تو اپنے بچوں کو کہیں بھی تعلیم دِلا لیں گے؛ لیکن قوم کے جو غریب لوگ ہیں، وہ اپنے بچوں کی تعلیم کا کیا انتظام کریں؟ اصل تو ان کی تعلیم کا مسئلہ ہے، یہ ضروری نہیں ہے کہ ہماری درس گاہوں کی عمارتیں عظیم الشان ہوں، اعلیٰ سے اعلیٰ فرنیچر ہو، اگر سادہ عمارت اور بنیادی ضروریات کے ساتھ ہم معیاری تعلیم فراہم کر سکیں اور اسے سستی بنا سکیں تو یہ قوم وملت کے ساتھ بڑا احسن سلوک ہوگا اور نہ صرف دنیا میں نیک نام بلکہ آخرت میں بھی انشاء اللہ وہ سرخرو ہوں گے، کاش! درس گاہوں کے ذمہ داران اس پر توجہ دیں!!

(۱۷ رمئی ۲۰۰۲ء)

بچے — ہماری ذمہ داریاں

کل ۱۴ رنومبر ہے، اس تاریخ کو ''یوم اطفال'' کی حیثیت سے منایا جاتا ہے، گویا یہ ''بچوں کا دن'' ہے جس کا مقصد سماج کو بچوں کے حقوق اور بچوں کے تئیں ان کی ذمہ داریوں کی طرف متوجہ کرنا ہے، یہ ایک حقیقت ہے کہ بچے اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا عطیہ ہیں، خود قرآن نے ان کو آنکھوں کی ٹھنڈک قرار دیا ہے، (الفرقان: ۷۴) اور اللہ تعالیٰ نے دو اولوالعزم پیغمبروں حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت زکریا علیہ السلام کے سلسلہ میں ذکر فرمایا، کہ انھوں نے خدا سے اولاد کے لئے دُعاء فرمائی اور اللہ تعالیٰ نے اس کو قبول فرمایا، (الصافات: ۱۰۰، مریم: ۵) اس سے معلوم ہوا کہ بچوں کی خواہش انسان کی ایک فطری اور جائز خواہش ہے، اللہ تعالیٰ ہی نے ان کو انسان کے لئے آنکھوں کا نور اور دل کا سرور بنایا ہے، بچوں کے بغیر کسی خوبصورت اور جاذبِ قلب ونظر سماج کا تصور بھی ممکن نہیں۔

اسلام نے جیسے سماج کے مختلف طبقات کے حقوق اور واجبات متعین کئے ہیں، اسی طرح بچوں سے متعلق ان کے سرپرستوں اور سماج کے فرائض کی بھی رہنمائی کی ہے، بچوں سے متعلق اسلام کا پہلا سبق یہ ہے کہ انسان دُنیا میں نئے انسان کی آمد پر خوش ہو نہ کہ غمگین اور فکرمند، اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حضرت اسحاق علیہ السلام (ھود: ۷۱/۶۹) اور حضرت زکریا علیہ السلام کو حضرت یحییٰ علیہ السلام (آل عمران: ۲۹) کی پیدائش کی اطلاع دی، تو اس کو ''خوشخبری'' سے تعبیر فرمایا گیا، بچوں کی پیدائش خوشی کی بات ہے، اس میں لڑکوں اور لڑکیوں کی کوئی تفریق نہیں، اسلام سے پہلے لوگ لڑکیوں کی پیدائش پر رنجیدہ خاطر ہوتے اور اس کو اپنے لئے باعثِ عار تصور کرتے تھے، قرآن مجید نے اس کو کافرانہ طریقہ قرار دیا ہے اور اس کی مذمت فرمائی ہے، (الزخرف: ۱۷) کیوں کہ انسان نہیں جانتا کہ اس کے لئے لڑکے زیادہ مفید ہوں گے یا لڑکیاں؟

اور کون مشکل وقتوں میں اس کے کام آئے گا؟

بچوں کا سب سے بنیادی حق ان کے زندہ رہنے کا حق ہے، ہندوستان نے بچوں کے حقوق پر منعقدہ کنونشن کے دستاویز پر دستخط کیا ہے، اس میں پہلا حق یہی ہے، اسلام نے جس طرح اس حق کی رعایت رکھی ہے، شاید ہی اس کی مثال مل سکے، عام طور پر بچہ کا قانونی وجود اس وقت مانا جاتا ہے جب اس کی پیدائش ہو چکی ہو؛ لیکن اسلام کی نگاہ میں جس روز ماں کے رحم میں تخم انسانی نے قرار پکڑا، اسی دن سے وہ ایک قابل احترام اور لائقِ حفاظت انسان ہے؛ اسی لئے اسلام کی نظر میں اسقاط حمل جائز نہیں، بچہ کی پیدائش کے بعد اس کی حفاظت اور بقاء کا انتظام نہ صرف والدین اور سرپرست؛ بلکہ پوری انسانی برادری کا فریضہ ہے، اسی مقصد کے لئے شریعت نے ماں پر یہ اخلاقی حق رکھا ہے کہ وہ بچوں کو دودھ پلائیں، قرآن مجید نے ایک سے زیادہ مواقع پر اس کا ذکر کیا ہے؛ اس لئے کہ میڈیکل سائنس میں یہ ایک تسلیم شدہ امر ہے کہ بچوں کے لئے ماں کے دودھ سے زیادہ مفید کوئی غذا نہیں، پھر جب تک بچے اس لائق نہ ہو جائیں کہ خود کسبِ معاش کر سکیں، اس وقت تک بچوں کی کفالت والدین اور والدین نہ ہوں تو دوسرے قریبی رشتہ داروں پر رکھی گئی ہے، ماں باپ کے لئے یہ روا نہیں رکھا گیا کہ وہ نابالغ بچوں کو مزدوری پر لگائیں اور اپنی ذمہ داری سے پہلو تہی برتیں۔ (الدر المختار مع الرد: ۵/۳۳۷)

آپ ﷺ نے سرپرستوں کو اس بات کی تعلیم دی ہے کہ بچوں کے معاملہ میں ایثار سے کام لیا جائے، چنانچہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''خدا نے ہر شخص کے لئے مجھ سے پہلے جنت کا داخلہ حرام کر دیا ہے؛ لیکن میں قیامت کے روز اپنی داہنی طرف ایک عورت کو جنت کے دروازے کی سمت دوڑتے ہوئے دیکھوں گا، میں کہوں گا کہ اسے کیا سوجھی کہ مجھ سے پہلے جنت میں داخل ہونے کی کوشش کر رہی ہے؟ مجھ سے کہا جائے گا کہ یہ ایک خوبصورت بیوی تھی، اس کی یتیم لڑکیاں تھیں، اس نے اپنی ساری خوبصورتی ان لڑکیوں کی تربیت کی بھینٹ چڑھا دی، یہاں تک کہ لڑکیاں جوان ہو گئیں، اللہ تعالیٰ نے اس کے اس فعل کی قدردانی کی، اس کا نتیجہ آپ دیکھ رہے ہیں۔ (کنز العمال)

سب سے زیادہ آپ ﷺ نے جس بات کی تاکید فرمائی وہ بچوں کی تعلیم اوران کی تربیت ہے، اگر یہ کہا جائے کہ اسلام بچوں کی جبری تعلیم کا بھی قائل ہے تو بے جا نہ ہوگا؛ کیوں کہ آپ ﷺ نے ہر مسلمان کے لئے تحصیل علم کو فرض قرار دیا ہے، (ابن ماجہ عن انسؓ) ظاہر ہے کہ فرائض میں ضرورت پڑنے پر جبر سے بھی کام لیا جاسکتا ہے، امام بخاریؒ نے اپنی کتاب میں ایک عنوان کے تحت ثابت کیا ہے کہ پانچ سال کی عمر میں تعلیم کا آغاز ہونا چاہئے۔ (بخاری، باب الغتباط فی العلم والحکمۃ)

''تعلیم'' میں دین کی تعلیم بھی داخل ہے کہ بقدرِ ضرورت علم دین حاصل کئے بغیر نہ انسان اپنی دُنیا کو بہتر بنا سکتا ہے اور نہ آخرت سنور سکتی ہے؛ اس لئے ایسے علم کا حصول بھی ضروری ہے، جس کے ذریعہ وہ اپنی معاشی ضروریات کو پوری کرسکے اور ایک باعزت اور خود دار شہری کی حیثیت سے زندگی بسر کرنا اس کے لئے ممکن ہو، قرآن مجید نے اس کے لئے ایک جامع تعبیر اختیار کی ہے کہ اپنے آپ کو اور اپنے اہل وعیال کو دوزخ سے بچاؤ: ''قُوْا أَنْفُسَكُمْ وَ اَهْلِيْكُمْ نَارًا'' (التحریم:٦) بچوں کو دوزخ سے بچانے کے لئے دین کی تعلیم تو ضروری ہے ہی، طریقۂ معاش کی بھی تعلیم ضروری ہے؛ تاکہ وہ جائز طریقہ پر اپنی ضروریات کو پوری کرسکیں اور غیر سماجی طریقہ اختیار کرنے پر مجبور نہ ہوں۔

بچوں کی تعلیم اسلام کی نگاہ میں کس درجہ اہم ہے؟ اس کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ گو اُصولی طور پر بالغ ہونے کے بعد بچوں کی کفالت باپ پر واجب نہیں، سوائے اس کے کہ وہ معذور ہو؛ لیکن اگر لڑکے حصولِ تعلیم میں مشغول ہوں اور والدین ان کے اخراجات ادا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں، تو پھر ان کا نفقہ بھی واجب ہے، اسی طرح فقہاء نے طلبہ کے لئے زکوۃ کو جائز قرار دیا اور بعض اہل علم نے ان کو بھی قرآن مجید کے بیان کئے ہوئے زکوٰۃ ''فی سبیل اللہ'' کے زمرہ میں رکھا ہے۔

بچوں کی تعلیم کے ساتھ ان کی تربیت بھی ضروری ہے، تربیت ہی دراصل انسان کو انسان بناتی ہے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ کسی شخص نے اپنی اولاد کو اچھے اخلاق وآداب سے بہتر عطیہ نہیں دیا، (ترمذی، باب ماجاء فی ادب الولد) ایک اور موقع پر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ

اپنے بچوں کوتہذیب اورشائستگی سکھاؤ: ''أحسنوا أدبھم'' (ابن ماجہ، باب برالوالد الخ) آپ ﷺ واقعی انسانی نفسیات کے عارف اور رہبر انسان تھے اور ہر چھوٹے بڑے معاملہ مین رہنمائی فرمایا کرتے تھے؛ چنانچہ ایک موقعہ پر نہایت جامعیت کے ساتھ آپ ﷺ نے بچوں کے ان حقوق کا ذکر فرمایا، جو والدین پر ہیں، ارشاد ہوا :

> ساتویں دن بچہ کا عقیقہ کیا جائے ، اس کا نام رکھا جائے اور نہلایا دھلایا جائے، تیرہ سال میں نماز وروزہ کے لئے سرزنش کی جائے، سولہ سال کی عمر میں باپ اس کی شادی کردے ، پھر اس کا ہاتھ پکڑے اور کہے: میں نے تجھے اخلاق سکھادئے ، (**قد أدبتک**) تعلیم دے دی اور تمہارا نکاح کردیا، میں اللہ کی پناہ چاہتا ہوں ، اس سے کہ تو دُنیا میں میرے لئے فتنہ کا یا آخرت میں عذاب کا باعث بنے ۔ (مسند احمد، ابن حبان عن انسؓ)

آپ ﷺ نے اپنے اسوہ اور ارشادات کے ذریعہ ہمیں بچوں کی تعلیم وتربیت کے طریقوں سے بھی آگاہ فرمایا، اس سلسلہ میں بنیادی بات یہ ہے کہ بچوں کے مزاج اور موقع ومحل کو دیکھتے ہوئے کبھی نرمی کا اور کبھی سختی کا معاملہ کیا جائے ، بے جا تشدد اور ہر وقت سخت گیری فائدہ کم اور نقصان زیادہ پہنچاتی ہے؛ اس لئے اصل میں بچوں کے ساتھ شفقت مطلوب ہے، حضرت انس رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ میں نے کسی شخص کو بال بچوں میں رسول اللہ ﷺ سے زیادہ شفیق نہیں دیکھا، (مسلم) ایک بار حضرت اقرع بن حابس رضی اللہ عنہ نے حضور ﷺ کو دیکھا کہ آپ ﷺ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا بوسہ لے رہے ہیں، حضرت اقرع رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میرے دس بیٹے ہیں میں نے کبھی ان کا بوسہ نہیں لیا، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو رحم نہیں کرتا اس پر رحم نہیں کیا جاتا'' آپ ﷺ کی شفقت ومحبت کچھ اپنے ہی بچوں کے ساتھ مخصوص نہیں تھی؛ بلکہ دوسرے کے بچوں کے ساتھ بھی آپ ﷺ بہت ہی شفقت اور بے تکلفی کا معاملہ فرماتے، جب سفر میں جاتے یا سفر سے واپس تشریف لاتے تو مدینے سے جو بچے آپ ﷺ کو چھوڑنے یا آپ ﷺ کے استقبال کے

لئے آگے تک جاتے ، آپ ﷺ ان کو اپنی سواری پر آگے پیچھے بیٹھا لیتے ، بچوں کے ساتھ ہمیشہ بے احترامی اور حوصلہ شکنی کا رویہ بہتر نہیں ، ان کے مزاج اور نفسیات کا لحاظ ضروری ہے۔

جہاں حد سے زیادہ سختی بچوں کی تربیت کے لئے مضر ہے ، وہیں یہ بھی روا نہیں کہ جہاں تنبیہ اور ڈانٹ ڈپٹ کی ضرورت ہو ، وہاں بھی اپنے آپ کو مہر بہ لب رکھا جائے ، اس سے بچوں کی تربیت نہیں ہو پاتی اور ان میں بدتہذیبی کا رجحان بڑھتا جاتا ہے ، بعض بچوں میں اپنی ہر ضد کو پورا کرنے کا مزاج بن جاتا ہے ، یہ بات بچوں کے مستقبل کے لئے بہت ہی نقصان دہ ہے ؛ اسی لئے آپ ﷺ نے حسبِ ضرورت بچوں کی تنبیہ کا بھی حکم دیا ہے ؛ چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ جب بچے دس سال کے ہوجائیں اور نماز پڑھنے میں کوتاہی کریں تو ان کی کسی قدر سرزنش بھی کی جائے ، (ترمذی : ۱/ ۹۳) اسی لئے فقہاء نے والدین کو بال بچوں کی اور اساتذہ کو طلباء کی مناسب حد میں رہتے ہوئے تادیب اور سرزنش کی اجازت دی ہے۔

بچوں کے لئے دُعاءِ خیر بھی ان کا ایک حق ہے ، اپنے بچوں کے لئے بھی اور قوم کے بچوں کے لئے بھی ؛ کیوں کہ دُعاء بہر حال ایک اثر رکھتی ہے ، قرآن مجید میں بعض انبیاء کی دُعائیں ذکر کی گئی ہیں ، جن میں اللہ تعالیٰ سے اولاد کی صالحیت اور حق پر استقامت کا ذکر آیا ہے ، اس سلسلہ میں مشہور محدث اور صاحبِ دل امام عبداللہ بن مبارکؒ کا واقعہ مشہور ہے کہ وہ اپنی ابتدائی زندگی میں گانے بجانے اور عیش وعشرت میں مست رہتے تھے ، یہاں تک کہ شراب بھی منھ سے لگ گئی تھی ، آپ کے والدین کو اس پر بڑی کڑھن تھی اور دن رات رو رو کر اللہ سے دُعائیں کرتے تھے ، اسی درمیان جب ایک دن عیش ونشاط کی بزم آراستہ تھی اور شراب کا دور چل رہا تھا کہ آپ کی آنکھ لگ گئی اور آپؒ نے خواب میں دیکھا کہ ایک خوبصورت باغ ہے ، جس میں ایک ٹہنی پر پرندہ بیٹھا ہوا ہے اور وہ اس آیت کو پڑھ رہا ہے :

> کیا ایمان لانے والوں کے لئے ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کے ذکر سے پگھلیں اور اس کے نازل کردہ حق کے آگے جھکیں ۔ (الحدید : ۱۶)

امام عبد اللہ بن مبارکؒ بے چین ہو کر اٹھے، ان کی زبان پر تھا کہ ''خدایا! وہ وقت آ گیا'' پھر تو اسی وقت جام وسبو چکنا چور کر دئے، رنگین کپڑے اُتار پھینکے، غسل کیا اور خدا کے حضور توبہ کی، یہاں تک کہ علم ومعرفت کے اُفق پر خورشید بن کر چمکے کہ شاید ہی کوئی محدث اور فقیہ ہو جس نے ان کی علمی عظمت اور فضل وتقوی کا اعتراف نہ کیا ہو، کہا جاتا ہے کہ یہ والدین کی دُعاء کا اثر تھا۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ موجودہ مشینی دور میں بچوں کو سرپرست اپنا وقت نہیں دے پاتے، جو بچوں کے لئے سب سے اہم ضرورت ہے، وہ باپ اور بزرگوں کی سچی محبت سے محروم ہیں اور بچوں کی تربیت کے پہلو پر بے توجہی عام ہے، کتابوں کی دکانوں پر ایسی کتابوں کی بھرمار ہے جس سے بچوں کے اخلاق بگڑتے ہیں؛ لیکن ایسا لٹریچر مقدار اور معیار کے اعتبار سے بہت کم ہے جو بچوں کی فطری اور اخلاقی تربیت کا سروسامان ہو، ٹی وی اور دوسرے ذرائع ابلاغ بھی بچوں میں تعمیری رجحان پیدا کرنے کے بجائے تخریبی اور غیر اخلاقی میلان پیدا کرنے کا کام کر رہے ہیں؛ اس لئے بچوں کا حق صرف یہ نہیں کہ ان کے لئے خورد ونوش کا انتظام کر دیا جائے؛ بلکہ ان کے لئے اصل کرنے کا کام یہ ہے کہ ذرائع ابلاغ کو معلم اخلاق بنایا جائے اور لوگوں کو یہ بات سمجھائی جائے کہ بچوں کے لئے کمانا ہی سب کچھ نہیں؛ بلکہ بچوں پر اپنے وقت کا صرف کرنا بھی بنیادی اور اہم ہے، اور ان کو اس سے محروم رکھنا ان کے ساتھ ناانصافی اور حق تلفی ہے!!

(۱۳؍نومبر ۱۹۹۸)

تعلیم اور ہماری ذمہ داریاں

رسول اللہ ﷺ جس وقت دنیا میں تشریف لائے، یہ دنیا ہر طرح کی برائیوں کی آماجگاہ تھی، کوئی برائی نہ تھی جو عرب کے سماج میں نہ پائی جاتی ہو، لوگوں کی جان محفوظ تھی نہ مال اور نہ عزت وآبرو، بے حیائی کا یہ حال تھا کہ اور مواقع تو کجا، کعبہ کا طواف بھی بے لباس کرتے تھے، مرد بھی عورت بھی، ظلم و جور کی کوئی حد نہ تھی اور سماج کے تمام فیصلے ''جس کی لاٹھی اس کی بھینس'' کے اصول پر ہوا کرتے تھے، مذہبی پہلو سے دیکھئے تو بدترین شرک تھا، جس میں عرب گرفتار تھے اور عرب سے لے کر چین تک پوری مشرقی دنیا علانیہ شرک میں مبتلا تھی، سلطنتِ روم کا مذہب گو عیسائیت تھا؛ لیکن یہاں بھی توحید کے پردہ میں شرک ہی کی حکمرانی تھی اور ایک خدا کے بجائے تین افراد پر مشتمل خدا کا کنبہ تشکیل پاچکا تھا اور ان سب کی پرستش کی جاتی تھی۔

ان حالات میں رسول اللہ ﷺ پیدا ہوئے اور جب عمر مبارک چالیس سال ہوئی تو نبوت کا تاج گہربار سر مبارک پر رکھ دیا گیا، بہ ظاہر یہ خیال ہوتا ہے کہ ان حالات میں جو پہلی وحی نازل ہوتی، وہ اصلاحِ عقیدہ کے پہلو سے توحید کے اثبات اور شرک کے رد میں ہوتی، یا انسانی نقطۂ نظر سے ایسی آیت ہوتی جس میں ظلم و جور سے منع کیا گیا ہو اور انسانی اُخوت و ہمدردی اور محبت و مروت کی طرف دعوت دی گئی ہو، یا سماجی اصلاح سے متعلق کوئی آیت ہوتی، جس میں بے شرمی اور بے حیائی سے روکا گیا ہو۔

آپ ﷺ پر سب سے پہلے جو آیت نازل ہوئی، اس میں ان میں سے کسی بات کا تذکرہ نہیں؛ بلکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا :

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ ، خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ، اِقْرَاْ وَرَبُّکَ الْاَکْرَمُ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ، عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ یَعْلَمْ ۔ (العلق:۱-۵)

اپنے رب کے نام سے پڑھ جو سب کا خالق ہے، جس نے آدمی کو
جمے ہوئے لہو سے بنایا، پڑھ اور تیرا رب بڑا کریم ہے، جس نے قلم
سے علم سکھایا، آدمی کو وہ سکھایا جو وہ نہ جانتا تھا۔

یعنی سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے تعلیم اور پڑھنے کی طرف متوجہ فرمایا؛ اس لئے کہ علم کی مثال روشنی کی سی ہے، اگر کسی تاریک کمرہ میں سانپ بھی ہو، بچھوبھی اور دوسرے تکلیف دہ کیڑے مکوڑے بھی، آپ ان سب کو مارنے اور بھگانے کے لئے الگ الگ محنت کریں، تو وقت بھی زیادہ لگے گا اور شاید کامیابی بھی نہ ہو؛ لیکن اگر آپ ایک چراغ جلا کر رکھ دیں، تو خود بخود یہ کیڑے مکوڑے اپنا بسیرا اٹھالیں گے؛ کیوں کہ تاریکی ہی ان کی پناہ گاہ ہے، یہی کیفیت انسانی سماج میں علم کی ہے، عقیدہ وعمل اور معاشرت واخلاق کی تمام برائیاں جہالت کا نتیجہ ہیں، جہالت کی تاریکی ہی میں یہ تمام مفاسد پرورش پاتے ہیں، تعلیم کی روشنی جتنی پھیلے گی، یہ بگاڑ بھی خود بہ خود دور ہوتا جائے گا، تعلیم کے بغیر سماج کی برائیوں کو دور کرنے کی مثال جڑوں کے بجائے ٹہنیوں اور پتوں پر پانی دینے کی ہے کہ اس سے وقتی فائدہ تو ہوسکتا ہے؛ لیکن کسی دیرپا تبدیلی کی امید نہیں رکھی جاسکتی۔

اسی لئے تعلیم کی بڑی اہمیت ہے، ایسا نہیں ہے کہ اسلام نے صرف مذہبی تعلیم ہی کو اہمیت دی ہو؛ بلکہ اسلام نے علم کی تقسیم علم نافع اور علم غیر نافع سے کی ہے، جو علم انسان کو دینی یا دنیوی اعتبار سے نفع پہنچائے اور ان کے مسائل کو حل کرے وہ علم نافع ہے اور جو علم انسانیت کے لئے ہلاکت اور مضرت کا سامان ہو وہ علم غیر نافع ہے، رسول اللہ ﷺ علم نافع کے لئے دُعاء کیا کرتے تھے اور جو علم نافع نہ ہو، اس سے پناہ چاہتے تھے، اس اُصول پر غور فرمایئے تو اکثر عصری علوم وفنون علم نافع کی فہرست میں آتے ہیں، طب انسانی جسم کے لئے نفع بخش ہے، انجینئرنگ انسانی ضروریات کی تکمیل میں مفید ہے، علم قانون میں انسان کی عزت وآبرو کی حفاظت ہے، ادب وصحافت کے ذریعہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا کام ہوتا ہے، جس پر سماج کی اخلاقی اور وحانی اقدار کا تحفظ موقوف ہے، تجارت اور معاشیات سے متعلق علوم کا

مقصد فرد اور سماج کی معاشی ضروریات کو پورا کرنا اور اس کے صرف کے جائز اور مناسب مواقع کی رہنمائی کرنا ہے، جس کے مفید اور نافع ہونے سے کس کو انکار ہوسکتا ہے؟ اس لئے یہ تمام علوم اسلام میں مطلوب ہیں اور ان کی حیثیت فرض کفایہ کی ہے۔

اسلام نے کبھی علم وتحقیق سے عداوت نہیں رکھی؛ بلکہ لوگوں کو کائنات کی مخفی حقیقتوں میں غور وفکر اور تدبر کی دعوت دی اور حکمت ودانائی کی ہر بات کو مؤمن کی متاعِ گم گشتہ قرار دیا، علم کے اعتراف میں اپنے اور بے گانے کا فرق نہیں کیا، حضور ﷺ نے اُمیہ بن صلت کے اشعار کی تعریف فرمائی، جو زمانۂ جاہلیت کا شاعر تھا اور علم کی تحصیل میں بھی آپ ﷺ نے کبھی دوست اور دشمن کا فرق نہیں کیا، غزوۂ بدر میں جو لوگ قید ہوکر آئے، ان کے بارے میں آپ ﷺ نے یوں فرمایا کہ ان میں جو لوگ پڑھے لکھے ہوں، وہ دس مسلمانوں کو پڑھنا لکھنا سکھا دیں، یہی ان کا فدیۂ رہائی ہوگا، ظاہر ہے کہ وہ دشمن تھے نہ کہ دوست اور یہ بھی ظاہر ہے کہ وہ مشرک تھے ،علم دین تو ان سے حاصل ہو نہیں سکتا تھا، اگر آپ ان سے تعلیمی فدیہ وصول کرنے کے بجائے مالی فدیہ ہی وصول کرنے پر اصرار کرتے تو معاشی نقطۂ نظر سے اہل مدینہ کے لئے یہ مناسب ہوتا؛ کیوں کہ اس وقت مسلمان سخت غریب اور افلاس کی حالت میں تھے اور فاقہ کشی کے ساتھ گذر بسر عام تھی؛ لیکن آپ ﷺ نے ان حالات میں بھی تعلیم کو ترجیح دی، یہ گویا اس بات کا سبق ہے کہ تعلیم کا حاصل کرنا بہر حال ضروری ہے، چاہے اس کے لئے پیٹ کاٹنا پڑے، یا فاقے برداشت کرنے پڑیں؛ لیکن بچوں کی تعلیم کو کسی قیمت پر نظر انداز نہ کیا جائے۔

آج مسلمانوں کو یہی سمجھانے کی ضرورت ہے کہ وہ معمولی کھائیں، معمولی کپڑے پہنیں، عیش وعشرت کے دوسرے اسباب سے اپنے آپ کو بچائیں، معاشی تنگی کو گوارا کریں؛ لیکن ہر قیمت پر اپنے بچوں کو تعلیم دلائیں، ہمارے سماج کا کوئی بچہ ایسا نہ ہو جو تعلیم سے محروم رہے۔ عام طور پر غریبوں کی مدد اور تعاون کا مطلب یہ سمجھا جاتا ہے کہ وقتی طور پر کچھ پیسے دے دئے جائیں، کچھ کھانے پینے کی چیز مہیا کر دی جائے، عید کا موقع ہو تو کپڑے دیئے جائیں، ہم اسی کو بڑی خدمت سمجھتے ہیں؛ حالاں کہ خدمت کا زیادہ بہتر طریقہ یہ ہے کہ کسی شخص

کے ساتھ ایسا طریقہ اختیار کیا جائے کہ اس کے لئے روزگار اور معاشی سطح کو مستقل طور پر اونچا اٹھانے کی تدبیر ہو، جیسے کوئی دوکان لگا دی جائے، کہیں ملازمت دلا دی جائے، اس کی فضیلت زیادہ ہے اور رسول اللہ ﷺ سے ایسی تدابیر کا اختیار کرنا ثابت ہے، ایسی ہی تدابیر میں ایک یہ ہے کہ کوئی شخص اگر خود اپنے بچہ کو پڑھانے کی صلاحیت نہ رکھتا ہو، تو اس کے بچوں کو تعلیم دلا دی جائے، یہ صدقۂ جاریہ ہوگا اور اس بچہ کے ذریعہ خود اس کی، اس کے والدین کی اور خاندان وسماج کی جو کچھ خدمت ہوگی، یہ اس کے اجر میں شریک ہوگا، یہ انسانی خدمت کا سب سے اہم اور مفید طریقہ ہے، اگر کسی شخص کے دو بچے ہوں تو اس کو خیال کرنا چاہئے کہ گویا اس کے تین بچے ہیں اور وہ اپنے دو بچوں کے ساتھ اپنی قوم کے ایک اور بچہ کی تعلیم وتربیت کی ذمہ داری قبول کر لے، یقینا یہ بہت بڑی خدمت ہوگی اور اس طرح سماج کی بہت سی مشکلات حل ہوسکیں گی، جب تک پورا سماج نہ بڑھے اور پوری قوم ترقی نہ کرے، یقینا ہماری ترقی ادھوری اور ناتمام ہوگی۔

عام طور پر دیکھا جاتا ہے کہ مسلمان بچوں کی ایک اچھی خاصی تعداد پرائمری کے بعد تعلیم کا سلسلہ منقطع کر دیتی ہے، بہت سے طلبہ ہائی اسکول کی سطح پر تعلیم ترک کر دیتے ہیں اور اعلیٰ فنی تعلیم میں تو ہمارے بہت ہی کم بچے پہنچ پاتے ہیں، یہ نہایت افسوس ناک بات ہے، ترکِ تعلیم کی وجہ کبھی معاشی ہوتی ہے، کبھی طالب علم کی پست ہمتی اور بہت سے گھروں میں والدین کی جہالت اور سرپرستوں کی ناواقفیت، ضرورت اس بات کی ہے کہ مسلمان رہنما اور اہل دانش نئے تعلیمی سال کے آغاز کے موقع پر گاؤں گاؤں اور شہر کے مختلف محلوں میں چند پڑھے لکھے رضا کاروں کی ایک کمیٹی بنائیں، جو سلسلۂ تعلیم منقطع کرنے والے بچوں اور ان کے سرپرستوں کے حالات کا جائزہ لیں، اگر طالب علم پست ہمتی کا شکار ہو رہا ہے تو اس کے لئے کچھ کوچنگ کا انتظام کریں اور ان کی ہمت بڑھائیں، اگر سرپرستوں کی غفلت اور ناسمجھی ہو تو ان کا شعور بیدار کریں اور جو مواقع گورنمنٹ کی طرف سے حاصل ہیں، ان کو ان سے استفادہ کی راہیں بتائیں اور جو بچے معاشی پسماندگی کی وجہ سے تعلیم سے محروم ہو رہے ہوں،

ان کی تعلیمی وسائل میں مدد کریں اور اہل خیر کو اس جانب متوجہ کریں، کسی کو کتابوں کی ضرورت ہو تو کتاب دلا دیں، کسی کو اسکولوں کی داخلہ فیس کا مسئلہ ہو تو اس میں تعاون کر دیں، اس طرح ہم تھوڑی سی کوشش اور فکر مندی کے ذریعہ بہت سے طلبہ کے سلسلۂ تعلیم کو جاری رکھ سکتے ہیں۔

ایک اہم مسئلہ زبان کا بھی ہے، اسلام کسی زبان کا مخالف نہیں؛ بلکہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ تمام زبانیں اللہ ہی کی پیدا کی ہوئی ہیں، خود آپ ﷺ کے حکم سے حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے کئی زبانیں سیکھیں اور ان میں مہارت حاصل کی؛ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ کسی مضمون کی تعلیم کے لئے سب سے بہتر ذریعہ ''مادری زبان'' ہے، اجنبی زبان میں طالب علم کو دوہری مصیبت پیش آتی ہے، ایک زبان کو سمجھنے کی اور دوسرے اس مضمون کو اپنے گرفت میں لانے کی، مادری زبان ایک دشواری کو آسان کر دیتی ہے اور طالب علم کو اپنا ذہن اس مضمون کے سمجھنے پر مرکوز رکھنے کا موقع ملتا ہے، اس لئے ہر سال اچھے رینک لانے والے اور مقابلاتی امتحان میں بہتر پوزیشن حاصل کرنے والے بچے وہ ہوتے ہیں، جو مادری زبان کو ذریعہ تعلیم بناتے ہیں، اس حقیقت کو تمام ماہرین تعلیم تسلیم کرتے ہیں؛ بلکہ کہا جا سکتا ہے کہ مادری زبان کی اہمیت کی طرف خود قرآن مجید میں بھی اشارہ ملتا ہے؛ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ: ہم نے ہر قوم میں اس قوم کی زبان میں پیغمبر بھیجا ہے: ''وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ''۔ (ابراہیم: ۴)

بدقسمتی سے مسلمان اُردو زبان کے بارے میں احساس کمتری کا شکار ہیں، جو لوگ اُردو زبان کے تحفظ کی تحریک چلاتے ہیں؛ بلکہ اردو ہی کی روٹی کھاتے ہیں، وہ خود بھی اپنے بچوں کے لئے اُردو ذریعہ تعلیم کو پسند نہیں کرتے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ حکومت اُردو اقامتی اسکول قائم کرتی ہے؛ لیکن بچے دستیاب نہیں ہوتے، یونیورسٹیوں میں اُردو کے شعبے ہیں؛ لیکن طلبہ کے نہ ہونے کی وجہ سے اندیشہ ہے کہ وہ بند ہو جائیں، یہ نہایت تکلیف دہ صورتِ حال ہے اور اس سلسلہ میں قومی سطح پر شعور کو بیدار کرنے کی ضرورت ہے، ورنہ آہستہ آہستہ ہم سے ہماری زبان بھی چھن جائے گی۔

قوم سے صحیح محبت یہی ہے کہ ہم اپنی نسلوں کو تعلیم میں آگے بڑھائیں اور جس شرمناک تعلیمی پسماندگی سے ہم دوچار ہیں، پوری قوم کو اس سے باہر نکالنے کی کوشش کریں، مسلم جماعتیں ایک لائحۂ عمل مرتب کریں اور ایک محدود مدت کا پروگرام بنائیں کہ ہم اس مدت میں مکمل طور پر ناخواندگی کو مٹادیں گے اور ہمارے سماج کا کوئی لڑکا یا لڑکی ایسا نہ ہوگا جو تعلیم سے محروم ہو!

(۱۸/جون ۱۹۹۹ء)

تعلیم کی تجارت

علم انسانیت کا سب سے بیش قیمت جوہر ہے اور اسی سے انسان کی عزت وتکریم ، کائنات کی تسخیر کی صلاحیت اور اس کی ساری سربلندیاں اور سرفرازیاں متعلق ہیں ؛ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے صاف ارشاد فرمایا کہ علم والے اور علم سے محروم برابر نہیں ہو سکتے : ’’**قل هل یستوی الذین یعلمون والذین لا یعلمون**‘‘ چنانچہ مسلمانوں کے لئے علم کے حصول کو فرض قرار دیا گیا ہے، افسوس کہ اسلام میں جس قدر حصول علم کی تاکید آئی ہے، دین سے دوری کی وجہ سے مسلمان اسی قدر تعلیم سے دور ہیں اور آج جہالت اور لاعلمی مسلمانوں کی پہچان بن کر رہ گئی ہے۔

ان حالات کے پس منظر میں بحمد اللہ تعلیمی بیداری کے لئے مختلف تحریکات اُٹھ رہی ہیں اور اس میں شبہ نہیں کہ بحیثیت مجموعی ان تحریکات سے بڑے فوائد ہوئے ہیں اور اُمید ہے کہ مستقبل میں ان کے گہرے اثرات مرتب ہوں گے ؛ لیکن دوسرا افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ اکثر و بیشتر جن شخصیتوں، اداروں اور تنظیموں نے تعلیمی ادارے قائم کئے ہیں، انھوں نے ان اداروں کو کمرشیل بنیاد پر قائم کیا ہے اور وہ اسی حیثیت سے اسے چلا رہے ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ مسلمانوں میں جو اصحاب ثروت ہیں اور جو دوسری درسگاہوں میں بھی منھ مانگی رقم دے کر تعلیم حاصل کر سکتے تھے، وہ تو ان تعلیم گاہوں سے استفادہ کر رہے ہیں ؛ لیکن مسلمانوں کا غریب اور متوسط طبقہ جو مسلم آبادی کا پچاس فیصد یا شاید اس سے بھی زیادہ ہے وہ ان اداروں سے کسی قسم کا استفادہ کرنے سے قطعاً قاصر ہے۔

کچھ فنی اعلیٰ تعلیمی ادارے تو ایسے ہیں جن میں بہت ہی قیمتی مشنریز کی ضرورت پڑتی ہے، یا ملازمین واساتذہ کو اعلیٰ تنخواہیں دینی پڑتی ہیں، ان میں تو ایک حد تک یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ کافی اخراجات اس کے لئے مطلوب ہوتے ہیں ؛ لیکن اب صورتِ حال یہ ہے کہ

پرائمری ادارے بھی اس بات کے لئے تیار نہیں ہیں کہ ڈونیشن کے معاملہ میں وہ دوسروں سے پیچھے رہیں ، نرسری اور کے جی، کے لئے بھی ہزار ہا رقم کی بطورِ ڈونیشن طلب کی جاتی ہے ، مسلمانوں کے اقامتی اسکولوں کا حال یہ ہے کہ ایک بچہ کی ماہانہ فیس پانچ ، چھ ہزار روپے لی جاتی ہے ؛ حالاں کہ ان کے کھانے پینے ، رہائش اور تعلیم کا معیار معمولی ہی سا ہے ، یہ بہت ہی تکلیف دہ صورتِ حال ہے ، اس لئے بعض تعلیمی ادارے اور ان کے سربراہان جب مسلمانوں کو دعوت دیتے ہیں کہ آپ اپنے بچوں کو تعلیم دلایئے تو ان سے درخواست کرنے کو جی چاہتا ہے کہ آپ اس اپیل میں کچھ اضافہ کیجئے ؛ تاکہ واقعہ کے مطابق ہو جائے اور یوں کہئے کہ ''اگر آپ مالدار ہیں ، تو اپنے بچوں کو تعلیم دلایئے اور غریب ہیں تو ہمارے اداروں کے قریب بھی مت پھٹکئے'' ! گو یہ بات ہمارے بہت سے بھائیوں کو تلخ محسوس ہوگی ؛ لیکن یہ حقیقت کی تلخی ہے ، جسے ہمیں گھونٹنا چاہئے ۔

اسلامی نقطۂ نظر سے تعلیم ، صحت اور انصاف یہ تین چیزیں ایسی ہیں جن کی مفت فراہمی حکومت کی ذمہ داری ہے ؛ لیکن بدقسمتی سے اس وقت یہی تینوں چیزیں سب سے زیادہ مہنگی ہیں ، انصاف کا حال یہ ہے کہ غریب انسان تو عدالت کا دروازہ کھٹکھٹانے کے بجائے صبر کرنے میں ہی عافیت محسوس کرتا ہے ، وکیل صاحب کی بیش مقدار فیس ، پھر ہر پیشی پر مختلف عنوانات سے کچھ نہ کچھ وصول کرنا اور مقدمہ کو طول دینا ، فریقِ مخالف کی طرف سے رشوت لینا اور اس رشوت کو روکنے کے لئے مؤکل کی جانب سے بار بار منھ بھرنا ، پھر فیصلہ کے لئے عمر نوح اور صبر ایوب کی ضرورت ، یہ ایسی سرگرانیاں ہیں کہ شریف لوگ بالکل اضطرار و مجبوری ہی کے درجہ میں عدالت کے زینہ پر چڑھتے ہیں اور اگر خدانخواستہ کسی معاملہ میں پولیس سے رجوع کرنا پڑا تو ''الامان و الحفیظ'' یہاں تو مال کے ساتھ جان اور عزت وآبرو کے بھی لالے پڑ جاتے ہیں ۔

صحت کا معاملہ بھی اس سے چنداں مختلف نہیں ، سرکاری دواخانوں کے بارے میں لوگوں کا تصور ہے کہ جس سخت جان کو جلدی موت نہ آتی ہو وہ یہاں آجائے کہ یہاں بہت کم

وقت میں وہ ملک الموت کی ملاقات سے شرفیاب ہوسکتا ہے، اور اب یہی حال تعلیم کا ہے، سرکاری درسگاہوں میں عملہ کی فرض ناشناسی اور کوتاہ عملی کی وجہ سے لوگوں کو یقین ہو گیا ہے کہ یہاں اپنے بچوں کو داخل کرنا ان کی عمر اور وقت کو ضائع کرنے کے مترادف ہے، اس لئے نجی اسکولوں میں تعلیم کا رجحان بڑھ رہا ہے خود اعلیٰ سرکاری عہدہ داران اور بلند قامت سیاسی رہنما بھی سرکاری اداروں سے پہلو تہی برتتے ہیں، جب اصحاب رُسوخ کا یہ حال ہے تو بے چارے عوام کیا کرسکتے ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ مسلمانوں کا ایک بہت بڑا طبقہ یا تو اپنے بچوں کو تعلیم دِلانے سے قاصر ہے، یا تعلیم میں تسلسل برقرار رکھنے سے عاجز۔

ان اداروں میں طلبہ وطالبات کے اولیاء سے کثیر رقم حاصل کرنے کی غرض سے مختلف حربے اپنائے جاتے ہیں، ہر سال دو سال پر نصاب تعلیم میں تبدیلی، ایسی کتابوں کو نصاب میں شامل کرنا جو بہت مہنگی؛ لیکن جن کی تعلیمی افادیت کتاب کے حجم کے لحاظ سے بہت محدود ہے، وقتاً فوقتاً یونیفارم کی تبدیلی، ماہانہ تعلیمی فیس کے علاوہ مختلف عنوانات سے نئی نئی فیسوں کا عائد کرنا، یہ نہایت ہی تکلیف دہ صورتحال ہے، اور زبان حال سے لوگوں کو کہنا ہے ''کہ آپ اپنے بچوں کو اپنی اس غربت کے ساتھ تعلیم دلانے کا حوصلہ نہیں رکھیں'' اس تعلیمی تجارت کا مستقبل کے اعتبار سے بھی بڑا نقصان ہے، علم کا اصل مقصود خدمت خلق ہے، نہ کہ صرف اپنی ذات کی خدمت؛ لیکن جو بچہ تین سال کی عمر سے لے کر چوبیس، پچیس سال کی عمر تک تجارت گاہوں سے علم کو خرید کرتا ہے اور گھر بار بیچ کر سودی قرض لے کر، تکلیفیں اور مشقتیں اٹھا کر اور لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلا کر تعلیم کی قیمت فراہم کرتا ہے، کل ہو کر جب وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے نکلے گا ڈاکٹر یا انجینئر بنے گا، قانون داں، یا صحافی بنے گا اور منتظم یا استاذ بنے گا تو وہ اپنے آپ کو ایک ایسا شخص محسوس کرے گا جس نے بہت مہنگی قیمت میں اپنے فن کا سودا خرید کیا ہے اور اسے جلد سے جلد بھر پور قیمت لے کر اس سودے کو نئے گاہک کے ہاتھ فروخت کرنا ہے، وہ ایک خرید وفروخت کرنے والا ایک تاجر ہے، وہ ایک بنیا ہے نہ کہ قوم و ملک کا خادم، وہ سوداگر ہے نہ کہ انسانیت کا غمخوار و رہبر، وہ پیسہ کمانے والی مشین ہے نہ کہ انسان کے غم میں

گھلنے والا انسان، وہ خوب کمانے کے لئے پیدا ہوا ہے نہ کہ انسانیت کو فائدہ پہنچانے کے لئے، اس کے نزدیک دل سے زیادہ قیمت پیٹ کی اور انسانی محبت سے زیادہ قیمت بے جان سکوں کی ہوگی، ایسا ہونا ایک فطری بات ہے اور آج اس کا شب و روز مشاہدہ کیا جاسکتا ہے، ایک غریب مریض چاہے اپنی جان توڑ دے اور ڈاکٹر کا ایک معمولی نشتر بظاہر اسے بچا سکتا ہے؛ لیکن کیا مجال کہ ڈاکٹر اپنے سینہ پر اس مریض کے درد کی کوئی چوٹ محسوس کرے، ایک مظلوم و ستم رسیدہ چاہے انصاف کے حاصل کرنے سے محروم رہ جائے؛ لیکن ممکن نہیں کہ قانون داں اپنے سینہ میں اس کے لئے جذبۂ رحم کی کوئی رمق پائے، اس اخلاقی انحطاط، بے مروتی، انسانیت سوزی، دردِ دل سے محرومی اور رشتۂ انسانیت سے مہجوری کا بڑا سبب ہمارا یہ تعلیمی نظام ہے، اس لئے تعلیم کا تجارت بن جانا صرف افراد کا نقصان نہیں؛ بلکہ پوری قوم کا نقصان ہے اور اس سے صرف معاشی مسئلہ متعلق نہیں؛ بلکہ اخلاقی وانسانی مسائل بھی اس سے متعلق ہیں۔

بنیادی طور پر تعلیم تین مقاصد کے لئے حاصل کی جاسکتی ہے، کسبِ معاش، یعنی خالص مادی مقصد کے لئے، فلاح معاد یعنی آخرت کی کامیابی اور خالص روحانی مقصد کے لئے، خدمت خلق یعنی انسانی بھلائی کے لئے، اسلام کی نگاہ میں تعلیم کا اصل مقصد روحانی ترقی اور انسانی خدمت ہے، کسبِ معاش تعلیم کا اصل مقصود نہیں؛ بلکہ ضرورت کے درجہ میں اس کی گنجائش ہے، اسی لئے اسلامی تاریخ میں جو مشہور علماء اور سائنسداں گذرے ہیں، ان کا حال یہ تھا کہ وہ نہ صرف مفت تعلیم دیتے تھے؛ بلکہ اپنے طلبہ کی ضروریات بھی خود پوری کرتے تھے، انھیں اپنے طلبہ سے اولاد سے بڑھ کر محبت ہوتی تھی اور چوں کہ تعلیم و تعلم کا یہ رشتہ بے غرضی پر مبنی ہوتا تھا، اس لئے طلباء کو اپنے اساتذہ سے ماں باپ سے بھی بڑھ کر محبت ہوا کرتی تھی، ان کا تعلق اپنے اساتذہ سے روح وقلب کا ہوتا تھا، نہ کہ پیسوں کا، اسی لئے رسول اللہ نے کلمہ خیر سکھانے اور تعلیم دینے کو صدقہ قرار دیا ہے، صدقہ وہ مال ہے جو محض اجر وثواب کے لئے دیا جائے جس پر نہ ستائش کی تمنا ہو اور نہ صلہ کی آرزو، ایسا بھی ہوا ہے کہ اساتذہ نے فاقوں پر فاقے کئے ہیں؛ لیکن طلبہ کی طرف سے ایک وقت کا کھانا بھی گوارہ نہیں کیا۔

ہندوستان میں مسلمانوں کے طویل ترین عہدِ حکومت میں مفت تعلیم کا نظم رہا، یہی کیفیت انگریزوں کے عہد میں تھی، جن کے ظلم و جبر کی داستانیں بیان کرتے ہماری زبانیں نہیں تھکتی ہیں، آج بھی مغربی ممالک میں ضروری حد تک تعلیم کا مفت اور موثر نظام موجود ہے اور بہت سے ممالک میں تو اعلیٰ ترین تعلیم کے اخراجات بھی حکومت ادا کرتی ہے؛ لیکن یہ بدقسمتی ہے کہ ہمارے ملک میں گورنمنٹ تو ٹیکس اتنے ہی حاصل کرتی ہے، جتنے ان ممالک میں حاصل کئے جاتے ہیں؛ لیکن نہ حکومت کی طرف سے تعلیم کا معقول انتظام ہے، نہ مریضوں کا کوئی پرسان حال، نہ بے روزگاروں کے لئے کوئی وظیفہ، نہ بے سہارا لوگوں کے لئے کوئی تنخواہ، خیر حکومت کی اہلیت و نااہلی کے بارے میں تو وہ جوابدہ ہے؛ لیکن ہم مسلمانوں کے لئے یہ بات سوچنے کی ہے کہ کیا ہم محض ایک معاشی حیوان ہیں، کیا ہم صرف اپنے اور اپنے بال بچوں کے لئے پیدا ہوئے ہیں اور امت کا ہم پر کوئی حق نہیں، ہماری تعلیم گاہیں قوم کے تعمیری مراکز ہیں، یا بنیوں کی دکانیں؟

تجارت میں بھی نفع کا ایک تناسب ہوتا ہے، ایک دو فیصد سے بیس پچیس فیصد تک نفع پر مختلف تجارتیں کی جاتی ہیں؛ لیکن علم کی یہ تجارت گاہیں ایسی ہیں کہ جن میں ڈیڑھ سو دو سو فیصد نفع کمانے کی کوشش کی جاتی ہے، یہ اتنا بڑا قومی المیہ ہے کہ اس پر جس قدر رویا جائے کم ہے، ان تعلیم گاہوں کے ذمہ داروں کو چاہئے کہ وہ دینی مدارس کے نظام کو دیکھیں، جو مسلمانوں کے بہت ہی معمولی تعاون سے چلتے ہیں، جو ان لوگوں تک علم کی روشنی پہنچاتے ہیں جہاں چراغ کی ٹمٹماتی ہوئی لَو بھی موجود نہیں، جہاں اساتذہ جذبۂ دین سے سرشار ہو کر بہت ہی معمولی تنخواہوں پر علم کی خدمت کر رہے ہیں، مدرسہ کی جانب سے جو اوقاتِ تعلیم مقرر ہوتے ہیں وہ خود اپنی طرف سے اس سے زیادہ وقت تعلیم و تربیت میں خرچ کرتے ہیں، اور جو کام ان کے ذمہ نہیں ہوتا کسی کے کہے بغیر خالصۃً لوجہ اللہ بوقت ضرورت اسے انجام دیتے ہیں اور فی طالب علم اتنے کم اخراجات میں ان کے قیام و طعام اور ضروریات کا مناسب انتظام کرتے ہیں، جو ان کی خوش انتظامی اور خوش سلیقگی کا بہترین نمونہ ہے، ضرورت اس بات کی ہے کہ ان مدارس کے

خطوط پر اقامتی عصری درسگاہیں قائم کی جائیں اور کوشش کی جائے کہ ان کے نقش قدم پر چلتے ہوئے کفایتی فیس مقرر کی جائے جو متوسط طبقہ کے لوگوں کے لئے قابل برداشت ہو اور تعلیم کو تجارت بنانے کا مزاج ہم اپنی قوم میں نہ بنائیں، اگر ہم اس میں کامیاب ہو جائیں تو نئی نسل کا بہت بڑا طبقہ تعلیم سے محروم نہ رہنے پائے اور جہالت و ناخواندگی کا جو داغ اس اُمت کے دامن پر آج لگا ہوا ہے اور جس کی شہرت اور اپنوں اور بے گانوں کی زبان سے جس کا تذکرہ ہر غیرت مند مسلمان کو بے چین کر کے رکھ دیتا ہے، اس شرم ساری سے پوری قوم کو نجات ملے، ہم تجارت ضرور کریں لیکن تعلیم و اخلاق کی نہیں ؛ کیوں کہ یہ انسانیت اور اسلامی اخوت کے مغائر ہے!

(۶/جولائی ۲۰۰۱ء)

مخلوط تعلیم — ایک جائزہ

آج کل تعلیم نے بھی چونکہ بزنس اور تجارت کی صورت اختیار کرلی ہے، اس لئے جب اسکولوں میں داخلہ کا وقت آتا ہے تو خالص تاجرانہ انداز پر داخلہ کے لئے تشہیر کی جاتی ہے، بڑے بلند بانگ دعوے کئے جاتے ہیں اور سرپرستوں کو لبھانے کے لئے طرح طرح کی باتیں کہی جاتی ہیں، انگریزی زبان اور بول چال کی صلاحیت، عصری وسائل کی فراہمی، باصلاحیت اساتذہ، کمپیوٹر اور نہ جانے کن کن باتوں کے حوالے دئے جاتے ہیں، ان ہی ترغیبات میں ایک Co-Education (مخلوط تعلیم) کا تذکرہ گویا مخلوط تعلیم بھی ایک قابل تعریف اور باعث ترجیح امر ہے، میں سمجھتا ہوں کہ نہ صرف اسلامی بلکہ انسانی اور سماجی نقطۂ نظر سے بھی یہ بیمار ذہنیت اور کھوٹی فکر کا نمونہ ہے، بُرائی کے غلبہ کی انتہاء یہ ہے کہ بُرائی ندامت وشرمندگی کا سبب اور معذرت خواہی کا باعث بننے کے بجائے وجہ افتخار اور باعثِ اعزاز بن جائے۔

یہ بات بہت سنجیدگی سے سوچنے کی ہے، کہ تعلیم کا مخلوط نظام کس حد تک قابل قبول ہے؟ مخلوط تعلیم کے مسئلہ میں دو پہلو قابل توجہ ہیں، اول یہ کہ کیا لڑکوں اور لڑکیوں کا نصابِ تعلیم ایک ہی ہونا چاہئے یا جُداگانہ؟ دوسرے لڑکوں اور لڑکیوں کی تعلیم ایک ساتھ ہونی چاہئے، یا الگ الگ؟ جہاں تک نصاب تعلیم کی بات ہے تو کچھ اُمور ضرور ایسے ہیں جو دونوں کے درمیان مشترک ہیں، اور ان کا نصاب لڑکوں اور لڑکیوں کے لئے یکساں ہوسکتا ہے، جیسے زبان وادب، تاریخ، جنرل نالج، جغرافیہ، ریاضی، جنرل سائنس اور سوشل سائنس وغیرہ؛ لیکن کچھ مضامین اور تعلیمی میدان ایسے ضرور ہیں جن میں لڑکے اور لڑکیوں میں فرق کرنا ہوگا، مثلاً انجینئرنگ کے بہت سے شعبے، عسکری تعلیم، ٹیکنیکل تعلیم کی یقیناً لڑکیوں کو ضرورت نہیں، میڈیکل تعلیم میں ایک اچھا خاصا حصہ خاص خواتین سے متعلق ہے اور اس لئے زمانۂ قدیم ہی سے ''امراض نسواں''

طب کا مستقل موضوع رہا ہے، یہ لڑکیوں کے لئے نہایت اہم ہے، لڑکیوں کی تعلیم میں اُمورِ خانہ داری کی تربیت ضرور شامل ہونی چاہئے، سلائی، کڑھائی، پکوان، بچوں کی پرورش کے اصول اور اس طرح کے مضامین ضرور شریک ہونے چاہئیں، اس سے نہ صرف گھریلو زندگی میں لڑکیاں زیادہ بہتر رول ادا کرسکتی ہیں؛ بلکہ ازدواجی زندگی کی خوشگواری، خاندان میں ہر دلعزیزی اور مشکل اور غیر متوقع حالات میں آپ اپنی کفالت کے لئے یہ آج بھی بہترین وسائل ہیں، اس کے ساتھ ساتھ لڑکیوں کے لئے ان کے حسبِ حال آداب معاشرت کی تعلیم نہایت اہم ہے؛ کیوں کہ ایک لڑکی اگر بہتر بیوی اور بہتر ماں نہ بن سکے تو سماج کو اس سے کوئی فائدہ نہیں، اس لئے رسول اللہ ﷺ نے مردوں سے علاحدہ خواتین کی تعلیم وتذکیر کے لئے ہفتہ میں ایک دن مستقل طور پر متعین فرمادیا تھا، جس میں خواتین جمع ہوتیں اور آپ ﷺ ان کو ان کے حسبِ حال نصیحتیں فرماتے اور ہدایات دیتے، (بخاری: کتاب العلم، حدیث نمبر: ۱۰۱) آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ خواتین کی دل بہلائی کے لئے بہترین مشغلہ دھاگے کاتنا ہے، (**کنزل العمال**، حدیث نمبر: ۴۰۶۱۱، **باب اللهو واللعب والغنی**)؛ کیوں کہ اس زمانہ میں دھاگے کاتنا ایک گھریلو صنعت تھی اور آج سے پچاس سال پہلے تک بھی بہت سے گھرانوں کا اسی پر گذران تھا۔

غور کیجئے کہ جب قدرت نے مردوں اور عورتوں میں تخلیقی اعتبار سے فرق رکھا ہے، اعضاء کی ساخت میں فرق، رنگ وروپ میں فرق، جسمانی قُویٰ میں فرق، مزاج ومذاق میں فرق اور پسند وناپسند میں فرق، پھر قدرتی طور پر افزائش نسل اور اولاد کی تربیت میں دونوں کے کردار مختلف، تو کیوں کر ممکن ہے کہ سماج میں دونوں کے فرائض اور ذمہ داریاں الگ الگ نہ ہوں اور جب ذمہ داریاں علاحدہ ہیں، تو ضرور ہے کہ اسی نسبت سے دونوں کے تعلیمی اور تربیتی نصاب اور مضامین میں بھی ایک دوسرے سے مختلف ہوں، اگر اس فرق کو ملحوظ نہ رکھا جائے تو یہ کسی بھی معاشرہ کے لئے نہایت ہی مہلک اور مضرت رساں ہے، علامہ اقبالؒ نے خوب کہا ہے:

جس علم کی تاثیر سے زن ہوتی ہے نازن
کہتے ہیں اُسی علم کو اربابِ نظر موت

بیگانہ رہے دیں سے اگر مدرسۂ زن
ہے عشق و محبت کے لئے عِلم و ہنر موت

خواتین کو بھی چاہئے کہ وہ تعلیم کے لئے وہ میدان تلاش کریں جو سماج میں ان کے کردار سے مطابقت رکھتا ہے اور تعلیم کے وہ شعبے جو ان کے لئے موزوں نہیں، ان میں ان کا داخل ہونا بے سود ہے اور آئندہ اس شعبہ میں ملازمت سماج کے لئے اور خود ان کے لئے مہلک اور نقصان دہ، اس لئے قرآن مجید نے ایک اُصول بتا دیا ہے کہ مرد اور عورت اپنے اپنے دائرہ میں رہتے ہوئے جدوجہد کریں، اپنے دائرہ سے ہٹ کر دوسرے کے دائرہ عمل میں قدم رکھنے کی کوشش نہ کریں، ارشاد ہے :

وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ ، لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا وَلِلنِّسَاءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ وَاسْئَلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ ، اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا ۔ (النساء:۳۲)

اللہ تعالیٰ نے تم میں سے ایک کو دوسرے پر جو فضیلت عطا کی ہے، اس کے بارے میں رشک میں مبتلا نہ ہو، مردوں کے لئے ان کے اعمال میں حصہ ہے اور عورتوں کے لئے ان کے اعمال میں اور اللہ تعالیٰ سے اسی کا فضل و کرم مانگتے رہو، بے شک اللہ ہر چیز سے واقف ہیں۔

یہ آیت دراصل معاشرتی زندگی کے آداب کے سلسلے میں آب زر سے لکھے جانے کے لائق ہے، کہ قدرت نے سماج کو اختلاف اور رنگا رنگی پر پیدا کیا ہے، کسی بات میں مردوں کو فوقیت حاصل ہے تو کسی معاملہ میں وہ عورتوں کا محتاج اور دست نگر ہے، قدرت نے جس کو جو کام سپرد کیا ہے، اس کے لئے وہی موزوں ہے؛ کیوں کہ خالق سے بڑھ کر کوئی مخلوق کی فطرت وصلاحیت اور ضرورت سے واقف نہیں ہوسکتا، یہ مغرب کی خود غرضی اور بے رحمی ہے کہ اس نے عورتوں سے ''حق مادری'' بھی وصول کیا اور ''فرائض پدری'' میں بھی اس کو شریک ہونے پر

مجبور کیا اور چوں کہ مرد اپنی ذمہ داری کا بوجھ بھی اس کے کاندھوں پر رکھنا چاہتا تھا، اس لئے اس نے ایسا نظامِ تعلیم وضع کیا، جس میں عورتوں کو مرد بنانے کی صلاحیت ہو پیغمبر اسلام ﷺ نے خوب ارشاد فرمایا، کہ تین افراد وہ ہیں جو جنت میں کبھی داخل نہ ہوں گے، ان تین میں سے ایک کا ذِکر کرتے ہوئے فرمایا: ''اَلرَّجُلَۃُ مِنَ النِسَاءِ'' (سنن ابی داؤد: ۶۱۰۱) یعنی ''عورتوں میں سے مرد'' دریافت کیا گیا، عورتوں میں مرد سے کون لوگ مراد ہیں؟ فرمایا: وہ عورتیں جو مردوں کی مماثلت اختیار کریں: ''والمتشبہات من النساء بالرجال'' (بخاری، حدیث نمبر: ۵۸۸۵) غالباً جو عورتیں تعلیم وتربیت اور پھر اس کے بعد عملی زندگی میں مردوں کی صف میں کھڑا ہونا چاہتی ہیں وہ اسی حدیث کا مصداق ہیں۔

مخلوط تعلیم کا دوسرا پہلو لڑکوں اور لڑکیوں کی مشترک درس گاہ اور مشترک تعلیم ہے، ابتدائی عمر جس میں صنفی جذبات سے بچے عاری ہوتے ہیں اور ان میں ایسے احساسات نہیں پیدا ہوتے، مخلوط تعلیم کی گنجائش ہے، آٹھ، نو سال کی عمر اور پرائمری کی سطح تک مشترک تعلیمی نظام رکھا جاسکتا ہے، اسی لئے اسلام نے بے شعور بچوں کو غیر محرم عورتوں کے پاس آنے جانے کی اجازت دی ہے، اور قرآن مجید نے اس کی طرف اشارہ کیا ہے؛ (النور: ۵۸) لیکن جب بچوں میں جنسی شعور بیدار ہونے لگے اور ایک حد تک صنفی جذبات کی پہچان پیدا ہوجائے، تو ایک ساتھ ان کی تعلیم آگ اور بارود کو ایک جگہ جمع کرنے کے مترادف ہے۔

اسلام کا نقطۂ نظر اس سلسلہ میں بالکل واضح اور بے غبار ہے کہ ایک مرد کا غیر محرم عورت پر نظر ڈالنا کسی طرح روا نہیں، حج کے ایام ہیں، فضل بن عباس رضی اللہ عنہما رسول اللہ ﷺ کے ساتھ اونٹنی پر سوار ہیں، قبیلۂ بنو خثعم کی ایک لڑکی ایک شرعی مسئلہ دریافت کرنے کے لئے حضرت کی طرف متوجہ ہوتی ہے اور فضل بن عباس کی نظر ایک لمحہ اس لڑکی پر جم جاتی ہے، آپ ﷺ نے فوراً حضرت فضل بن عباس رضی اللہ عنہما کا چہرہ موڑ دیا، جب حج کے پاکیزہ ماحول اور رسول اللہ ﷺ کے تربیت یافتہ صحابہ وصحابیات کے بارے میں بھی آپ ﷺ نے یہ احتیاط برتی تو اوروں کا کیا ذکر؟ چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ نگاہ شیطان کے تیروں میں سے ایک تیر ہے؛

کیوں کہ اصل میں ساری بُرائیوں کی جڑ یہی بدنگاہی ہے، نگاہ ہی سے سارے فتنے جاگتے ہیں ، جب بار بار نگاہیں چار ہوتی ہیں ، تو جرأت بڑھتی ہے، زبان کو گفتگو کا حوصلہ ہوتا ہے، پھر دست ہوس آگے بڑھتا ہے، ملاقاتیں ہوتی ہیں اور آخر شرم وحیا کے سارے ہی حجابات اُٹھ جاتے ہیں، اس لئے نظر کی فتنہ سامانی کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا، بالخصوص ایسی صورت میں کہ چست اور دیدہ زیب یونیفارم ہوں اور نہ صرف چہرہ ورخسار؛ بلکہ بے لباس ٹانگیں بھی نگاہ ہوس کو دعوت نظارہ دیتی ہوں۔

مذہبی اور اخلاقی نقطۂ نظر سے تو شاید ہی کوئی سلیم الفطرت انسان اس بات سے انکار کر سکے کہ یہ اختلاط اخلاق کے لئے تباہ کن ہے؛ لیکن علاوہ اس کے تعلیمی اور انتظامی لحاظ سے بھی اس کی مضرتیں دن ورات سامنے آتی ہیں، چھیڑ چھاڑ اور فقرہ بازی اب ایسی درس گاہوں کے معمولات میں ہیں، اس سے درس گاہ کا ماحول بے وقار اور غیر مامون ہوجاتا ہے، ستم ظریفی یہ ہے کہ ’’طلبۂ عزیز‘‘ کے ساتھ ساتھ بعض اوقات ’’اساتذۂ گرامی قدر‘‘ بھی اس حمام میں اُتر جاتے ہیں اور پھر پولیس کیس بھی بنتا ہے، اغواء کے واقعات بھی پیش آتے ہیں، وقتی محبت میں فرار اور بعد میں ندامت کی خبریں اخبارات کی زینت بنتی ہیں اور کتنی ہی ناگفتنی پیش آتی ہے۔

یہ مخلوط تعلیم کا انتظامی پہلو ہے، اب خالص تعلیمی نقطۂ نظر سے دیکھئے، تعلیم دراصل دو باتوں کا نام ہے، جس مضمون کا درس ہو رہا ہے، اسے پوری طرح سمجھنا اور ذہن کی گرفت میں لانا، دوسرے اس مضمون کو اپنے حافظہ اور یادداشت میں محفوظ رکھنا، ان دونوں باتوں کے لئے ضروری ہے کہ طالب علم پوری طرح اپنے مقصد میں منہمک اور یکسو ہو اور یکسوئی کے لئے دو باتوں کی ضرورت ہوتی ہے، ایک یہ کہ جو پڑھ رہا ہے یا سُن رہا ہے اس کی طرف پوری توجہ، دوسرے ہر طرح کے خوف وخطر اور اندیشوں سے اس کے ذہن ودماغ کا محفوظ اور مامون ہونا، اب اول تو بہ تقاضۂ سن وسال یہ مخلوط بیٹھک لڑکوں اور لڑکیوں کی توجہ کو منتشر کرتی رہتی ہے، دوسرے شریف لڑکیاں اوباش لڑکوں کی طرف سے ایک طرح کے اندیشہ سے دوچار رہتی ہیں، اور سہمی سہمی درس گاہ میں اپنا وقت گذارتی ہیں، ایسے ماحول میں تعلیم وتعلم کا کام پوری یکسوئی،

توجہ اور اِنہماک کے ساتھ کیوں کر انجام پا سکتا ہے؟؟ کیوں کہ :

رُسوا کیا اس دَور کو جلوت کی ہوس نے
روشن ہے ہوس آئینۂ دل ہے مکدر
بڑھ جاتا ہے جب ذوقِ نظر اپنی حدوں سے
ہوجاتے ہیں افکار پراگندہ و ابتر

میرا خیال ہے کہ اگر کوئی ادارہ یا شخص ان طلبہ و طالبات کا سروے کرے جو جداگانہ نظام میں تعلیم حاصل کرتے ہیں اور ان کا جو مخلوط درس گاہوں میں زیرِ تعلیم رہے ہیں، تو غالباً تعلیمی اعتبار سے وہ لڑکے اور لڑکیاں زیادہ کامیاب ہوں گے جنھوں نے پہلی قسم کی درس گاہوں میں تعلیم پائی ہے، اگر ہم نے موجودہ حالات میں جب کہ ٹی وی نے معاشرہ کو بگاڑنے کے لئے صورِ قیامت پھونک رکھا ہے اور بیرونی کمپنیوں کی آمد نے رہی سہی کسر پوری کر دی ہے اور ایک زبردست یلغار ہے جو مشرقی تہذیب وثقافت پر پوری قوت سے جاری وساری ہے، جداگانہ نظامِ تعلیم نہ اختیار کریں، لڑکیوں کے لئے علاحدہ اسکول کا صحیح بندوبست اور اعلیٰ فنی تعلیم کے ادارے قائم نہ کریں اور ان کے حسبِ حال نصاب نہ مقرر کریں، تو ہمارے لئے اپنی سماجی اور مذہبی قدروں کا تحفظ ممکن نہ ہوگا اور مغرب کی غیر سنجیدہ نقالی ہمیں کہیں کا نہ رکھے گی۔

(۱۴؍جولائی ۲۰۰۰ء)

ریگنگ — مذہب اور اخلاق کی میزان میں

جون کا مہینہ آیا، گرمی نے رخت سفر باندھا اور دہکتی ہوئی فضاء پر ہر سو اَبر رحمت چھا گیا، نئے موسم کے ساتھ اسکولوں اور کالجوں میں بھی نئی بہار آئی، پوسٹروں، ورقیوں اور اخبارات کے ذریعہ ہر طرف تعلیم گاہوں کے تعارف اور اس میں داخلہ کی ترغیب کا سلسلہ جاری ہے، بازار میں طلبہ اور طالبات کے نئے نئے خوبصورت اور دیدہ زیب یونیفارم اور بھاری بھرکم کتابوں کے بستوں کا ایک سیلاب سا آیا ہوا ہے، جن کتب خانوں پر کوئی بھول کر پھٹکتا بھی نہیں تھا، وہیں اب نصابی کتابیں خرید نے والوں کی قطار در قطار لگی ہوئی ہے، ماں باپ اُمیدوں اور آرزوؤں کے حسین خواب سجا کر اپنے بچوں کو داخل کر رہے ہیں اور معصوم بچے نئی کتابوں، کاپیوں، دوستوں اور سہیلیوں کو پا کر شاداں وفرحاں ہیں۔

اس خوش منظر اور دلفریب موسم میں ایک ہی چیز ہے جو حساس دلوں میں کانٹے کی طرح چبھتی ہے اور وہ ہے اعلیٰ تعلیم کے مراکز، یونیورسیٹیوں اور کالجوں میں ریگنگ (Ragging) کا رواج، نئے طلبہ کے ساتھ قدیم طلبہ کا یہ وہ رویہ ہے جو بہت سے لڑکوں کو کالج چھوڑنے؛ بلکہ تعلیم سے محروم ہونے پر مجبور کر دیتا ہے، اخبارات میں ایسے واقعات بھی آچکے ہیں کہ بعض طلبہ وطالبات کو بے لباس تک کر دیا گیا اور ایسا بھی ہوا کہ انھوں نے اپنی تذلیل وتحقیر کے صدمہ سے دو چار ہو کر خودکشی کر لی، ایک تو یہ بجائے خود انتہائی غیر اخلاقی وغیر انسانی سلوک ہے اور خاص طور پر تعلیم گاہوں اور دانش گاہوں میں ایسے واقعات کا پیش آنا مزید قابل افسوس ہے کہ جہاں سے پوری قوم اور پورے ملک کو اخلاق ومروت کی روشنی ملنی چاہئے، خود وہیں ایسی تہہ در تہہ تاریکی ہو: ''**ظلمات بعضها فوق بعض**''۔

اسلام اس طرح کے عمل کو نہایت مذموم سمجھتا ہے، آپ ﷺ نے ہر آنے والے کا گرم

جوشی اور محبت آمیز استقبال کرنے اور ان کے ساتھ احترام وتوقیر کا معاملہ کرنے کا حکم دیا، اسی لئے آپ ﷺ نے ملاقات کرتے ہوئے ایک دوسرے کو سلام کرنے اور سلام کا جواب دینے کا حکم دیا ''سلام'' نہایت جامع اور بامعنی دُعاء ہے، جس میں انسان مخاطب کو ہر طرح کی تکلیف سے سلامت و عافیت اور رحمت و برکت کی دُعاء دیتا ہے، سلام کا منشاء ہی یہ ہے کہ مخاطب انسان سے مانوس ہو اور وہ سمجھے کہ وہ اپنے خیر خواہوں اور مخلصوں کے درمیان ہے، اس کو ماحول سے وحشت اور گھبراہٹ نہ ہو، اسے اپنائیت کا احساس ہو نہ کہ بیگانگی کا۔

آپ ﷺ آنے والوں کا بہت ہی پرتپاک خیر مقدم فرماتے تھے، ایک وفد خدمت اقدس میں حاضر ہوا، تو آپ ﷺ نے یہ کہتے ہوئے استقبال فرمایا: ''**مرحبا غیر خزایا ولا ندامی**'' (بخاری: ۱۹/۱) یعنی: ''تمہارا آنا مبارک، تمہارے لئے خوش آمدید، نہ تمہارے لئے ذلت ورسوائی ہے اور نہ ندامت و پشیمانی'' عربی زبان میں ''مرحب'' کے اصل معنی کشادہ جگہ کے ہیں، عربی زبان کے اس لفظ کے ذریعہ مہمانوں سے کہا جاتا ہے کہ تمہاری آمد بارِ خاطر نہیں، تمہارے لئے دل میں بھی اور مکان میں بھی خوب وسعت ہے، حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ نے فتح مکہ کے موقعہ سے اسلام قبول کیا، جب آپ ﷺ کے پاس آئے، تو آپ ﷺ نے کھڑے ہو کر ان کا استقبال کیا اور ''مرحبا'' کے لفظ سے ان کو خوش آمدید کہا؛ حالاں کہ عکرمہ رضی اللہ عنہ اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کے بدترین دشمن رہ چکے تھے۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ حضرت عیینہ رضی اللہ عنہ بن حصن آپ ﷺ کے پاس تشریف لائے، اس وقت حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ وعمر رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کے پاس تھے اور تینوں یوں ہی زمین پر بیٹھے تھے، آپ ﷺ نے حضرت عیینہ رضی اللہ عنہ کے لئے قالین منگوائی اور اس پر ان کو بٹھایا، (مجمع الزوائد: ۱۶/۸) حضرت جریر بن عبداللہ بجلی رضی اللہ عنہ خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے حجرۂ مبارکہ میں بہت ازدحام تھا، جریر رضی اللہ عنہ دروازہ ہی پر بیٹھ گئے، آپ ﷺ نے دائیں بائیں دیکھا، جب کوئی جگہ نظر نہیں آئی تو اپنی رداءِ مبارک لپیٹ کر حضرت جریر رضی اللہ عنہ کی طرف پھینکی اور فرمایا کہ اسی پر بیٹھ جاؤ، جریر رضی اللہ عنہ نے چادر لی، اپنے سینہ سے لگایا، بوسہ دیا، پھر

حضور ﷺ کو واپس کردی، احتراماً اس پر بیٹھنا گوارا نہیں کیا اور عرض کیا: اللہ کے رسول ﷺ! جیسے آپ ﷺ نے میری عزت کی ہے، اللہ تعالیٰ آپ ﷺ کو بھی عزت عطا فرمائے: ”**أکرمک اللہ کما أکرمنی**“۔ (مجمع الزوائد: ۸/۱۵)

آپ ﷺ کا یہ سلوک اچھے اور نیک لوگوں ہی کے ساتھ نہیں تھا؛ بلکہ بدخلق لوگوں کے ساتھ بھی آپ ﷺ خوش اخلاقی ہی کا رویہ اختیار کرتے تھے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ ایک صاحب نے حضور ﷺ سے حاضری کی اجازت چاہی، آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہ شخص اچھا آدمی نہیں ہے، پھر ملاقات کی اجازت مرحمت فرمائی، جب وہ آئے تو آپ ﷺ نے ان سے بہت ہی نرم خوئی کے ساتھ گفتگو فرمائی، جب حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا کہ آپ ﷺ نے ان کے بارے میں ایسی بات کہی؛ لیکن گفتگو بہت نرمی کے ساتھ کی، تو ارشاد فرمایا کہ بد ترین آدمی وہ ہے جس کو لوگ اس کی بدکلامی کی وجہ سے چھوڑ دیں، (ترمذی: ۲/۲۰) ایک روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: عنقریب تمہارے پاس ایسے لوگوں کے قافلے بھی آئیں گے جن کو تم ناپسند کرتے ہوگے؛ لیکن پھر بھی جب وہ آئیں تو ان کو خوش آمدید کہنا۔ (مجمع الزوائد: ۸/۱۷)

اسی لئے اسلام میں مہمان نوازی کی بڑی اہمیت ہے، مسلمان ہو یا غیر مسلم، جانا پہچانا ہو یا اَن پہچان، معروف آدمی ہو یا غیر معروف، بحیثیت مہمان ہر آنے والے کا احترام مسلمان کا فریضہ ہے، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتا ہو، اسے چاہئے کہ اپنے مہمان کے ساتھ اکرام سے پیش آئے، (بخاری: ۲/۹۰۶) نئے طلبہ کی حیثیت دراصل قدیم طلبہ کے لئے مہمان کی ہے، درس گاہ کی نئی فضا ان کے لئے نامانوس اور نئے چہرے ان کے لئے اجنبی ہیں، اس لئے ہونا یہ چاہئے کہ ان کے ساتھ نسبتاً زیادہ حسن سلوک اور خوش اخلاقی کو روا رکھا جائے، ان کا تعاون کیا جائے اور ان کی دلداری کا خیال رکھا جائے؛ تاکہ وہ اس ماحول سے متوحش نہ ہوں اور گھبرا نہ جائیں، نہ یہ کہ خاص طور پر ایسے سروسامان کئے جائیں جو نئے ماحول سے ہم آہنگ ہونے میں ان کے لئے رکاوٹ و دشواری کا باعث بن جائیں۔

کسی بھی ماحول میں جو لوگ پہلے سے ہوں اور ''سینئر'' کہلاتے ہوں، ان کے لئے نئے واردین ''جونیر'' کی نسبت سے شفقت ومحبت اور نصح وہمدردی کا رویہ رکھنا ضروری ہے، اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جو بڑے کا احترام نہ کرے، اپنے چھوٹوں کے ساتھ شفقت کا برتاؤ نہ رکھے اور علماء کا مرتبہ شناس نہ ہو، وہ میری اُمت میں سے نہیں ہے، (مجمع الزوائد: ۸/ ۱۴) جب بڑے چھوٹوں کے ساتھ محبت، خیر خواہی اور شفقت کا معاملہ کریں گے، تب ہی وہ چھوٹوں کے دل میں اپنا گھر بنا سکیں گے اور احترام کئے جائیں گے۔

مزاح کی ایک حد تک ضرور اسلام میں گنجائش ہے، بعض مواقع پر آپ ﷺ نے لطیف مزاح فرمایا اور اسی لئے حدیث وسیرت کی کتابوں میں آپ ﷺ کے مزاح پر مستقل باب موجود ہے، ایک روایت میں ہے کہ ایک بوڑھی خاتون خدمتِ اقدس میں آئیں، آپ ﷺ نے ان سے فرمایا کہ بوڑھیاں جنت میں نہیں جائیں گی، وہ خاتون رونے لگیں، آپ ﷺ نے فرمایا کہ جب لوگ جنت میں جائیں گے تو وہ جوان کردئے جائیں گے، بوڑھوں کے جنت میں نہ جانے کا یہ مطلب ہے، (احیاء علوم الدین: ۱۳۸/۳) حضرت اُم ایمن رضی اللہ عنہا خدمت میں حاضر ہوئیں اور درخواست کی کہ میرے شوہر آپ ﷺ کو مدعو کرتے ہیں، آپ ﷺ نے فرمایا کہ وہی جس کے آنکھ میں سفیدی ہے؟ انھوں نے کہا کہ بخدا! میرے شوہر کی آنکھ میں سفیدی نہیں ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں ہاں، ضرور سفیدی ہے، وہ انکار کرتی رہیں، آپ ﷺ فرماتے رہے کہ سفیدی ہے، آپ ﷺ کی مراد پتلی کی سفیدی نہیں بلکہ حلقۂ چشم کی سفیدی تھی، جو ہر انسان کی آنکھ میں رہتی ہے، (حوالہ سابق) اس طرح کے سنجیدہ اور پاکیزہ مذاق اپنے بے تکلف احباب اور اقارب سے آپ ﷺ فرمایا کرتے تھے۔

ایسا مذاق جو تکلیف دہ ہو، جس سے دوسروں کی تحقیر ہوتی ہو اور ان کا تمسخر مقصود ہو، قطعاً جائز نہیں، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے کہ ایک گروہ دوسرے گروہ سے تمسخر نہ کیا کرے، ممکن ہے کہ تم جن سے تمسخر کرتے ہو، وہی بہتر ہوں اور نہ عورتیں عورتوں کا تمسخر کریں، ہوسکتا ہے کہ جن عورتوں کا تمسخر کیا جاتا ہو وہی بہتر ہوں، (الحجرات: ۱۱) تکلیف دہ مذاق کو آپ ﷺ نے

بہت ہی ناپسند فرمایا ہے، ایک دفعہ کچھ لوگ آپ ﷺ کے ساتھ شریک سفر تھے، ایک صاحب سو گئے، بعض حضرات نے دل لگی کے طور پر سونے والے شخص کی ایک رسی لے لی، وہ بیدار ہوئے اور رسی نہ پا کر گھبرا گئے، آپ ﷺ نے اس پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا اور ارشاد فرمایا: کہ کسی مسلمان کے لئے دوسرے مسلمان کو خوفزدہ اور گھبراہٹ میں مبتلا کرنا حلال نہیں: ''**لا یحل لمسلم أن یروع مسلما**''۔ (ابوداؤد: ۲/۸۳)

''ریگنگ'' کے معنی درگت بنانے اور عملی مذاق کرنے کے ہیں، گویا درسگاہوں کے قدیم طلبہ نئے طلبہ کی درگت بناتے ہیں، کہا جاتا ہے کہ یہ نئے طلبہ کو قابو میں کرنے اور سرخمیدہ رکھنے کا ایک طریقہ ہے؛ لیکن ظاہر ہے کہ اولاً یہ جذبہ ہی غیر انسانی اور غیر اخلاقی ہے کہ دوسروں کو اپنے سامنے جھکا کر رکھا جائے اور ان کے ساتھ مساویانہ اور برادرانہ سلوک کرنے کے بجائے دوسرے اور تیسرے درجے کا سلوک کیا جائے، پھر اس کے لئے جو طریقہ اختیار کیا جاتا ہے وہ محبت اور احترام کے بجائے بغض اور نفرت کو جنم دینے والا ہے، اس سے گروپ بندیاں اور پارٹی بازیاں جنم لیتی ہیں اور نئے طلبہ گو وقتی طور پر اپنی تحقیر و تذلیل کو برداشت کر لیں؛ لیکن وہ ایسے بدطینت اور بدقماش لڑکوں کو اپنے ذہن سے فراموش نہیں کر سکتے اور انتقام کے لئے موقعہ کی تاک میں رہتے ہیں، پھر اس سے ماحول میں عمومی بداخلاقی، بے احترامی، تحقیر و تذلیل اور بے ادبی کی فضا قائم ہوتی ہے اور ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کا جذبہ پروان چڑھتا ہے، پھر یہ کتنی بڑی محرومی ہے کہ بعض طلبہ اس ''بے ہودہ استقبال'' کی تاب نہ لا کر تعلیم ترک کر دیں یا اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھیں!

یہ کردار نہ صرف اسلامی نقطۂ نظر سے نہایت نامناسب ہے؛ بلکہ کوئی بھی مذہب اور اخلاقی نظام اس کی اجازت نہیں دے سکتا، ہونا یہ چاہئے کہ قدیم طلبہ نئے طلبہ کو داخلہ کی کاروائی میں مدد دیں، دفتری کاموں کی تفصیل سے واقف کرائیں، ان کو اپنے پاس ٹھہرائیں، ان کی تعلیم اور مطالعہ میں ان کی مدد کریں، ان کو بہتر اساتذہ اور ذی صلاحیت طلبہ کی رہنمائی کریں اور جب تک کوئی مناسب انتظام نہ ہو، ان کو اپنا مہمان بنائیں، اگر نئے ماحول کی وجہ

سے وہ وحشت وگھبراہٹ محسوس کریں تو انھیں مانوس کرنے کی سعی کریں، بحمداللہ اب بھی دینی مدارس میں یہ فضا موجود ہے اور بڑی اسلامی جامعات میں قدیم طلبہ، جدید طلبہ سے نہایت شفقت و ہمدردی کا معاملہ کرتے ہیں اور دفتری اُمور کی انجام دہی میں حد درجہ معاون ہوتے ہیں۔

مقامِ فکر ہے کہ یہ درسگاہیں اور دانش گاہیں جہاں سے ملک وقوم کو چھوٹے بڑے افسر، کارکن اور خدمت گار ملنے والے ہیں، جو ملک کی تقدیر ہیں اور ملک کا مستقبل جن کے ہاتھوں میں ہے، ان میں اخلاقی پسماندگی اور تہذیبی انحطاط کا یہ حال ہو، وہ لوگوں کی ایذاء رسانی کو کھیل کود کی معمولی بات خیال کرتے ہوں، تکلیف پہنچانے میں انھیں لطف آتا ہو، کیسے توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ مستقبل میں قوم کے سچے بہی خواہ اور حقیقی خیر خواہ ثابت ہوسکیں گے؟ وہ دکھی انسانیت کے زخموں کا مرہم بن سکیں گے، اور پریشان حال انسانوں کی مدد کے لئے آگے بڑھیں گے، لوگوں کو اخلاق کا درس دیں گے اور اخلاق و انسانیت سکھائیں گے؟ اس لئے ضروری ہے کہ عصری درسگاہوں میں اخلاقی اور مذہبی تعلیم کا کچھ حصہ رکھا جائے، ناشائستہ اور غیر مہذب روایات کو ختم کیا جائے اور ان کی اخلاقی تربیت پر بھرپور توجہ دی جائے کہ ڈاکٹر، انجینئر، قانون داں، صحافی اور ادیب بننا آسان ہے اور ''انسان'' بننا مشکل ہے، مولانا حالیؒ کے بقول :

فرشتوں سے مشکل ہے انسان بننا
مگر اس میں پڑتی ہے محنت زیادہ

(۳؍جولائی ۱۹۹۸ء)

مسلمانوں کے زیر انتظام عصری درسگاہیں

کچھ مخلصانہ مشورے

اللہ کا شکر ہے کہ گذشتہ ایک دہے میں مسلمانوں نے درسگاہوں کے قیام پر خصوصی توجہ دی ہے اور ملک کے اکثر علاقوں میں مسلمانوں نے اپنی درسگاہیں قائم کیں، پرائمری اور میڈل اسکول سے لے کر کالجز اور اعلیٰ فنی تعلیم کے بہت سے ادارے ہیں، جو اس وقت مسلم انتظامیہ کے تحت کام کر رہے ہیں، ہندوستان کے جن شہروں میں اس اہم کام کی طرف زیادہ توجہ دی ہے، ان میں ایک ہمارا شہر ''حیدرآباد'' بھی ہے، یہ نہایت ہی مبارک اور مسعود قدم ہے اور انشاءاللہ مستقبل میں اس کے بڑے مفید نتائج ظاہر ہونگے، عام طور پر لوگ اعلیٰ فنی تعلیم کے اداروں ہی کو اہم سمجھتے ہیں اور اہمیت دیتے ہیں؛ لیکن شاید ایسا سمجھنا درست نہ ہو، اگر ہم اپنے بچوں کو پرائمری سطح سے ہائی اسکول کی سطح تک بہتر تعلیم نہ دلاسکیں، اور معیاری تعلیم کا اہتمام نہ کر پائیں، تو میڈیکل اور انجینئرنگ کالجوں کا قیام چنداں مفید نہ ہوگا، کیوں کہ ہمارے بچے مقابلاتی امتحان میں کامیاب نہیں ہوسکیں گے، نتیجہ یہ ہوگا کہ محنت آپ کریں گے، پیسے آپ لگائیں گے؛ لیکن خود آپ کے بچے ان درسگاہوں میں پڑھنے سے محروم رہیں گے، اس لئے یہ اولین ضرورت ہے کہ ہائی اسکول سطح تک تعلیم پر ہم بھرپور توجہ دیں، یہی زمانہ ہے جس میں ذہن وفکر کی تعمیر ہوتی ہے اور تعلیم کی بنیادیں مضبوط ہوتی ہیں، اگر اس مرحلہ پر توجہ نہ دی گئی، تو وہ طالب علم ہمیشہ کمزور اور پست ہمتی کا شکار ہی رہے گا کہ :

خشت اول چوں نہد معمار کج
تا ثریا می رود دیوار کج

لیکن سوال یہ ہے کہ مسلمان انتظامیہ کے تحت مستقل درسگاہوں کے قیام کا مقصد سرکاری یا غیر مسلم انتظامیہ کے تحت چلنے والے نجی درسگاہوں کی طرح مجرد تعلیم ہے، یا کوئی اور بڑا مقصد بھی ہے؟ اس مقصد کے لئے تو پہلے ہی بڑی تعداد میں اسکولس اور کالجز موجود ہیں، اصل مقصود مسلمانوں کے زیر انتظام درسگاہوں کا یہ ہے کہ ان کو جدید تعلیم کے ساتھ ساتھ اسلامی ماحول میسر ہو، ان کے دِلوں میں اسلامی اقدار کی عظمت بیٹھے، وہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے احساس کمتری میں مبتلا نہ ہوں، وہ سب کچھ ہوں؛ لیکن پہلے مسلمان ہوں، بہ قول اکبرؔ الہ آبادی :

تم شوق سے کالج میں پڑھو پارک میں پھولو
جائز ہے غباروں پر اُڑو چرخ پر جھولو
لیکن یہ سخن بندۂ عاجز کا رہے یاد
اللہ کو اور اپنی حقیقت کو نہ بھولو

اس کے لئے چند باتیں نہایت ہی ضروری ہیں اور مسلمان انتظامیہ کا مذہبی اور اخلاقی فریضہ ہے کہ وہ ان پر توجہ دے۔

پہلی بات یہ ہے کہ اسکول کے ماحول میں اسلامی معاشرہ کو فروغ دیا جائے اور بچوں کا رہن سہن اسلامی تہذیب اور اسلامی کلچر کا نمائندہ ہو، مسلمانوں کے زیر انتظام اسکولوں میں طلبہ اور طالبات کو تربیت دی جاتی ہے کہ وہ ملاقات کے وقت ''گڈ مورننگ'' Good Morning گڈ آفٹر نون Good Afternoon گڈ ایوینگ Good evening ، کہا کریں، ظاہر ہے کہ یہ ملاقات کا غیر اسلامی طور وطریق ہے، اسلام سے پہلے عربوں میں سلام وملاقات کے لئے اس قسم کے الفاظ وحروف تھے کہ ''**انعم اللہ بک عینا**'' (اللہ تمہاری آنکھ کو ٹھنڈی رکھے، اور ''**انعم صباحا**'' (تمہاری صبح بخیر ہو) لیکن رسول اللہ ﷺ نے ان کلمات کو پسند نہیں فرمایا، اور ارشاد فرمایا کہ اس کے بجائے ملاقات کے وقت کہا جائے السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ یعنی تم کو اللہ تعالیٰ دین ودنیا کے تمام نقصانات سے محفوظ رکھے اور تم پر اللہ کی رحمتیں اور برکتیں ہوں یہ نہایت جامع دُعاء ہے، ایک مسلمان دوسرے مسلمان کو اس سے بہتر اور کوئی دُعاء نہیں

دے سکتا ہے، ہماری درسگاہوں میں بچوں کو اس طرز ملاقات کا عادی بنایا جائے، کہ اس سے ہماری شناخت اور پہچان بھی متعلق ہے۔

اسی طرح یونیفارم کا مسئلہ ہے، یونیفارم ایسا ہونا چاہئے، جو شریعت کے دائرہ میں ہو، آج کل بہت سے مسلمان اسکولوں میں بھی لڑکیوں کو ''اسکارف'' کے استعمال سے منع کیا جاتا ہے، ایسی قمیص پہننے کو کہا جاتا ہے جس میں بازو کھلے ہوئے ہوں، بعض اسکولوں میں پائجامہ کے بجائے لڑکیاں ''اسکرٹ'' پہنتی ہیں، قریب البلوغ اور بالغ لڑکیاں ہیں؛ لیکن ان کے بال کھلے ہوئے، بازو کھلے ہوئے، ٹانگیں کھلی ہوئیں، کپڑا چست، ظاہر ہے کہ یہ نہ صرف اسلام بلکہ شرافتِ انسانیت کے بھی مغائر ہے، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: عورت سراپا پردہ ہے: ''المرأة عورة'' ایسے کپڑے جس سے جسم کی رنگت چھلکتی ہو، جن سے اعضا کا نشیب وفراز محسوس کیا جاسکتا ہو اور جسم کی ساخت نمایاں ہوتی ہو، قطعاً جائز نہیں اور نفسیاتی اعتبار سے بھی ایسے یونیفارم مقرر کرنا نقصان دہ ہی ہے، جس ماحول میں اس طرح بے حجاب لڑکیاں چلتی اور رہتی ہوں، آنکھوں سے آنکھیں ٹکراتی ہوں، کھلے ہوئے بازو اور ٹانگوں پر نگاہ پڑتی ہو، تو ضرور ہے کہ یہ چیز لڑکوں کی ذہنی یکسوئی میں خلل انداز ہوگی، دل میں وساوس پیدا ہونگے اور ذہن میں ہیجان کی لہریں اُٹھیں گی، ایسا طالب علم کیونکر اپنے سبق اور استاذ کی لکچر کی طرف متوجہ رہ سکتا ہے؟ اور جب توجہ اور یکسوئی باقی نہ رہے، تو کیسے وہ کتاب کے مضامین کو حل کر سکے گا، لڑکیوں کو اس کی وجہ سے دو چیزوں میں دشواری کا سامنا کرنا پڑتا ہے، ایک تو یہی نفسیاتی الجھن لڑکیوں کے ساتھ بھی پیدا ہوں گی دوسرے ایسے لباس کی وجہ سے ان کو اوباش اور آوارہ لڑکوں کی مزاحمت کا بھی سامنا کرنا پڑتا ہے، فقرہ بازی، چھیڑ چھاڑ، مسلسل نظر بازی کے نتیجہ میں لڑکیاں ذھنی تناؤ سے دوچار رہتی ہیں، اور درسگاہ میں آتے جاتے اور اُٹھتے بیٹھتے یہ احساس ستاتا رہتا ہے کہ کچھ اوباش نگاہیں ان کا تعاقب کر رہی ہیں، ظاہر ہے ایسے خوف اور ذہنی تناؤ کے ماحول میں کیسے ان کو ذہنی یکسوئی حاصل ہوسکتی ہے؟

اس لئے یونیفارم میں اسلامی اور اخلاقی قدروں کا لحاظ ہونا چاہئے، شرٹ، پتلون

اسکارف اور بالغ لڑکیوں کے لئے نقاب تاکہ جسم ڈھکا چھپا رہے، لڑکوں کے لئے بھی دیدہ زیب؛ لیکن اسلامی وضع قطع کا نمائندہ لباس ہو، بعض پڑوسی ممالک میں دیکھا گیا ہے کہ پٹھانی سوٹ اسکول کا یونیفارم متعین کیا گیا ہے، یہ خوبصورت بھی ہے، ڈھیلا ڈھالا ہونے کی وجہ سے طبّی نقطۂ نظر سے صحت کے لئے مفید بھی اور پوری طرح ساتر بھی، اگر مسلمان انتظامیہ اسکولوں میں ایسے یونیفارم مقرر کرے تو اس میں کیا قباحت ہے؟ کیا جسم کی نمائش اور غیر ساتر لباس سے طالب علم کی ذہنی وفکری قوت میں اضافہ ہوجاتا ہے؟ کیا انسان کی قوت حفظ اور ذکاوت میں بھی اسکو کچھ دخل ہے؟ اور علم وفن کی تاریخ میں جو ممتاز شخصیتیں گذری ہیں، وہ اس قسم کے یونیفارم پہن کر ہی علمی اور قلمی کام کیا کرتے تھے؟ ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہے، یہ مغربی تہذیب سے مرعوبیت اور اپنی تہذیب وتمدن کے بارے میں احساس کمتری اور فکری ہزیمت کا آئینہ دار ہے!

اسی سے متعلق دوسری اہم چیز لڑکوں اور لڑکیوں کے لئے جداگانہ تعلیمی نظام کا ہے، بدقسمتی سے اس وقت مخلوط تعلیم ''کوایجوکیشن'' کا فیشن سا ہوگیا ہے، فخریہ تشہیر کی جاتی ہے کہ ہمارے یہاں ''کوایجوکیشن'' (Co–Education) ہے، یہ سراسر نادانی ہے اور نہ صرف اسلام سے دوری؛ بلکہ تعلیمی نفسیات سے ناواقفیت اور ناآگہی بھی ہے، تعلیم وتعلم کے وقت استاد اور طالب علم کا ذہن پوری طرح ان مضامین پر مرتکز ہونا چاہئے، جو اس وقت ان کے سمجھنے اور سمجھانے کا موضوع ہے، درس گاہ کے ماحول میں کوئی ایسی چیز نہ ہونی چاہئے جو توجہ کو بانٹنے والی ہو کہ یہ تعلیم کے لئے سم قاتل ہے، سبق کی حیثیت ایک زنجیر مسلسل کی ہے، اگر بیچ سے ایک کڑی بھی غائب ہوتی، تو پورا سبق ضائع ہوجائے گا۔

اور یہ فطری بات ہے کہ ایک ہی ماحول میں لڑکوں اور لڑکیوں کا وجود ایک دوسرے کے لئے کشش کا باعث ہے، ایک ہی جگہ ان دونوں کا موجود رہنا نگاہوں کا ٹکرانا یقیناً ذہن کو متأثر کرے گا، توجہ کو بانٹے گا اور مدرس کی طرف پوری توجہ تسلسل کے ساتھ برقرار رکھنا دشوار ہوجائے گا، اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے عورتوں کے نمازیوں کے سامنے سے گزرنے کو منع فرمایا

اوراس کو''قاطع صلاۃ'' قرار دیا،یعنی نمازیوں کی توجہ کو بانٹنے والی چیز ہے،سماج میں بڑھتے ہوئے موجودہ اخلاقی بحران؛ بلکہ اخلاقی انارکی کے پس منظر میں جداگانہ نظام تعلیم ایک بہت بڑی ضرورت ہےاوراگرمسلمان بھی اس جانب توجہ نہ کریں، جوشرم وحیااورعفت وعصمت کے علم بردارہیں،توکن سےاس کی توقع کی جاسکتی ہے؟

مسلمانوں کے زیرانتظام عصری مدارس کی ایک بڑی ضرورت نصاب تعلیم میں ایسے مضامین کوشامل کرنا ہے، جومسلمان طلبہ اورطالبات کواسلام کے بارے میں واقفیت بھی فراہم کریں اوران کواحساسِ کمتری میں مبتلا ہونے سے بچائیں،محض چند دُعاؤں کا یاد دِلا دینا کافی نہیں؛ بلکہ توحید،شرک،رسالت،عبادات،معاشرتی زندگی اورمعاملات کے بارے میں ان کو معلومات فراہم کی جائیں،سیرت نبوی ﷺ اوراسلامی تاریخ کے بارے میں جوغلط فہمیاں پیدا کی جاتی ہیں، ان کے متعلق وہ حقائق سے آگاہوں، ہندوستان کی حقیقی تاریخ کہ مسلمانوں نے اس ملک کوکیا کچھ دیا؟ پڑھائی جائے، بابر،غزنوی وغوری اورحضرت اورنگ زیب عالم گیرؒ وغیرہ مسلم حکمرانوں کے بارے میں جو پروپیگنڈے کئے جاتے ہیں، ان کی حقیقت سمجھائی جائے؛ تاکہ آج ازسرنوتاریخ لکھنے کی جوکوشش کی جارہی ہے،اس کے زہر سے مسلم نوجوانوں کے ذہن کومحفوظ رکھا جاسکے،ان موضوعات پر بہت سی تحریریں موجود ہیں اوراگر ضرورت پڑے،تو اس نقطۂ نظر سے کچھ کتابیں مدون کی جائیں، یہ وقت کی نہایت اہم ضرورت ہےجن جماعتوں میں بورڈ کا امتحان دینا ہوتا ہے،ان جماعتوں کوچھوڑ کراگردوسری کلاسس میں ایسی کتابیں رکھی جائیں،توشایداس میں کوئی دقت نہ ہو۔

ایک افسوس ناک بات یہ ہے کہ تعلیم جوخدمتِ خلق کا ذریعہ تھی، آج وہ سب سے بڑی تجارت ہے،عیسائی مشنریزتواس تجارت سے لوگوں کا مذہب خریدکرتی ہیں اوراپنے دین کی تبلیغ کرتی ہے؛لیکن مسلمان انتظامیہ اس تجارت کوزیادہ تراپنے شخصی مفاداورزیادہ سے زیادہ حصولِ دولت کے لئے استعمال کرتی ہے؛ بلکہ بعض اوقات توغریب مسلمانوں کواس حوصلہ افزا مشورہ سے بھی سرفراز فرمایا جاتا ہے کہ''پڑھانا ہی کیا ضروری ہے،رکشہ چلوالو''اگرہماری درس

گاہوں کا مقصد صرف مرفہ الحال مسلمانوں سے پیسے وصول کرنا اوران کے بچوں کو پڑھانا ہے، تو یقینا یہ ادارے بے فیض ہیں، اور یہ مقصد تو غیرمسلم انتظامیہ کے تحت چلنے والی درس گاہوں سے بھی حاصل ہوسکتے ہیں اور ہوتے ہیں۔

حیرت ہوتی ہے کہ معقول داخلہ فیس اور تعلیمی فیس لینے کے باوجود ان اسکولوں میں عام طور پر اساتذہ کی تنخواہیں بہت قلیل ہوتی ہیں اور قلیل تنخواہ ہی کی نسبت سے ان اساتذہ کی صلاحیت اور استعداد بھی ہوتی ہے، تنخواہ کی کمی اساتذہ کے لئے بے اطمینانی کا باعث ہوتی ہے، اس لئے وہ بھی دوسری جگہ کی تلاش میں رہتے ہیں کہ شاید یہ ان کی تنخواہ میں کسی قدر اضافہ کا باعث ہوسکے، اس بے اطمینانی کی وجہ سے بار بار اساتذہ تبدیل ہوتے ہیں، اور یہ ظاہر ہے کہ بار بار اساتذہ کی تبدیلی تعلیم کے لئے نہایت ہی نقصان دہ ہے؛ کیوں کہ تعلیم کے لئے طالب علم اور مدرس کے درمیان ذہنی مناسبت اور مناسبت سے بڑھ کر موانست ضروری ہے، ہر شخص کی تفہیم کا انداز الگ الگ ہوتا ہے، زبان اور لب ولہجہ میں بھی فرق ہوتا ہے، ہفتہ عشرہ تو طالب علم کو اساتذہ سے مناسبت پیدا ہونے میں لگ جاتا ہے اور اساتذہ کے لئے طلبہ کی انفرادی صلاحیت اور مزاج کو پہچاننے میں تو اس سے بھی زیادہ وقت درکار ہوتا ہے، اس کے بعد ہی حقیقی طور پر استاذ اور طالب علم کا تعلیمی رشتہ استوار ہوتا ہے، اگر مدرس بار بار تبدیل ہو، یا خود مضامین ایک مدرس سے دوسرے مدرس کی طرف منتقل ہوتے رہیں، تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اچھا خاصا وقت ایک دوسرے سے ارتباط ہی میں چلا جائے گا۔

مسلمان انتظامیہ کا انسانی، اسلامی اور اخلاقی فریضہ ہے کہ تعلیمی اخراجات کو ایسا مناسب اور متوازن رکھیں کہ غریب مسلمان خاندان بھی تعلیم حاصل کرسکیں اور ''نہ نفع نہ نقصان'' یا ''اقل ترین نفع'' کی بنیاد پر ادارے چلائے جائیں، جبھی ہم غریب اور پس ماندہ مسلمانوں کو بھی زیورِ تعلیم سے آراستہ کرسکیں گے، یا کم سے کم اتنا کیا جائے کہ ہر طالب علم کی فیس میں کچھ حصہ (Poorfund) مان کر چلیں، مثلاً اگر ہم ایک ہزار داخلہ فیس لیتے ہیں، تو نو سو داخلہ فیس اور ایک سو ''غرباء کا فنڈ'' تصور کریں اور ہر دس طالب علم پر ایک غریب طالب علم کا مفت داخلہ

لیں، اس طرح کم سے کم دس فیصد داخلے غریب بچوں کے بھی ہو سکیں گے۔

موجودہ حالات میں ایک اہم مسئلہ اردو زبان کی تعلیم کا بھی ہے، اس میں شبہ نہیں کہ اُردو واحد زبان ہے جس کو مسلمانوں نے وجود بخشا ہے، اس زبان میں تقریباً ۷۵ فیصد الفاظ عربی اور فارسی ہیں، خود قرآن مجید کے الفاظ بہ کثرت اس زبان میں داخل ہیں، اسلامی اصطلاحات اور محاورات جس قدر اُردو زبان میں پائے جاتے ہیں، عربی زبان کے بعد کوئی زبان نہیں، جو اسلامی تعبیرات سے اس قدر مالا مال ہو، ایک غیر مسلم بھی جب اُردو زبان میں لکھتا اور بولتا ہے، تو ''**ماشاء اللہ، الحمد للہ**'' اور ''**سبحان اللہ**'' وغیرہ الفاظ اسے بھی بولنے اور لکھنے پڑتے ہیں۔

پھر اُردو زبان میں اسلامی علوم کا سرمایہ اتنی بڑی مقدار میں پایا جاتا ہے کہ سوائے عربی زبان کے کوئی زبان نہیں جو اتنی مال دار اور صاحبِ ثروت ہو، تفسیر، قرآن وحدیث کے ترجمے، مسنون حدیث کی شرحیں، فقہ اور فقہی کتابوں کے ترجمے، سیرت، اسلامی تاریخ، غرض تمام ہی اسلامی علوم پر اردو زبان میں ایک عظیم الشان کتب خانہ تیار ہو چکا ہے، ایک زمانہ میں عربی کے بعد سب سے زیادہ اسلامی لٹریچر فارسی زبان میں تھا؛ لیکن اب اُردو نے فارسی پر سبقت حاصل کر لی ہے۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اردو ایک بین الاقوامی زبان ہے، جو آج ایشیاء سے لے کر امریکہ تک اپنا مقام بنا چکی ہے، برصغیر آبادی کے اعتبار سے دنیا کا نہایت ہی گنجان علاقہ ہے، برصغیر کے اکثر علاقوں میں اُردو زبان سمجھی جاتی ہے، ایک محتاط اندازہ کے مطابق ہندوستان، پاکستان اور بنگلہ دیش میں ساٹھ کروڑ مسلمان بستے ہیں، ان میں پچاس کروڑ لوگ وہ ہیں جو اُردو سمجھتے ہیں اور کم سے کم چالیس کروڑ وہ ہیں، جو اُردو بولتے اور پڑھتے ہیں، یہ ایک بہت وسیع حلقہ ہے، اگر پوری دنیا میں اُردو بولنے اور سمجھنے والوں کی تعداد پچاس کروڑ ہی مان لی جائے، تو افردو بولنے والے کا تناسب بین الاقوامی زبانوں میں نہایت نمایاں ہے۔

اگر ہمارے بچے (جو عربی اور فارسی زبان سے بھی واقف نہیں) اُردو زبان سے بھی

نابلد رہ جائیں، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ بہت ہی عظیم اسلامی سرمایہ سے محروم ہو جائیں گے، اسلامی لٹریچر سے ان کا رابطہ کٹ کر رہ جائے گا اور اپنے سلفِ صالحین اور بزرگوں سے ان کا رشتہ منقطع ہو جائے گا، اسلام کے بارے میں یا تو ان کو کوئی واقفیت اور آگہی نہیں رہے گی، یا وہ اپنی معلومات کے لئے ان لوگوں کی تحریروں اور کتابوں پر انحصار کریں گے جو حقیقت میں اسلام کے معاند ہیں اور جن سے اسلام کی صحیح تصویر پیش کرنے کی توقع نہیں کی جاسکتی، اس لئے مسلم انتظامیہ کے تحت چلنے والے اسکولوں میں اُردو زبان کی تعلیم وقت کی نہایت اہم ضرورت ہے، اور اس سے چشم پوشی برتنا آنے والی نسلوں سے محرومی کو گوارا کرنے کے مترادف ہے، یہ ایک افسوس ناک حقیقت ہے کہ جو لوگ اُردو زبان کے تحفظ کی تحریک چلاتے ہیں، دین دار ہیں، دینی علوم سے وابستہ ہیں، اُردو زبان کی روٹی کھاتے ہیں، اُردو میں وعظ وتقریر اور شعر وسخن ان کا امتیاز ہے، خود ان کے بچے اُردو کو ''اچھوت'' سمجھتے ہیں، اس لئے ضرورت تو اس بات کی ہے کہ اُردو ذریعہ تعلیم کے زیادہ سے زیادہ معیاری اسکول قائم کئے جائیں؛ لیکن اگر اپنے اندر اتنی جرأت نہ پاتے ہوں، تو خواہ ذریعہ تعلیم انگریزی ہو، ثانوی زبان ہی کی حیثیت سے کم سے کم اردو کو داخل نصاب کریں، اس کے لئے اچھے تربیت یافتہ اساتذہ رکھیں اور اس کو پوری اہمیت دیتے ہوئے پڑھائیں، یہ موجودہ حالات میں آئندہ نسلوں کو اسلام پر باقی رکھنے اور مسلمان بچوں کا اسلام سے رشتہ استوار رکھنے کے لئے نہایت ضروری ہے۔

عصری درس گاہوں کے طلبہ کی اسلامی تربیت اور ذہن سازی میں دینی مدارس بھی اہم کردار ادا کر سکتے ہیں، اگر دینی مدارس ابتدائی مرحلہ میں پہلی جماعت سے ساتویں جماعت تک سرکاری نصاب کے ساتھ اسلامیات اور قرآن مجید پڑھ لیں، دو پارے حفظ کر لیں، سیرت اور دینیات کی کچھ کتابیں پڑھ لیں، نیز اسلامی عقائد اور تاریخ پر بھی کوئی کتاب ان کی ذہنی استعداد کے مطابق پڑھا دی جائے اور تربیت کا اسلامی ماحول ان کو دیا جائے، تو یہ نہایت ہی مبارک اور نافع قدم ہوگا، اس طرح بہت سے وہ ماں باپ جو اپنے بچوں کو حقیقی معنوں میں مسلمان دیکھنا چاہتے ہیں اور اس ذہنی ارتداد سے نالاں ہیں جو اس وقت مشنری

اسکولوں کی عام بیماری ہے، وہ اس سے فائدہ اٹھاسکیں گے، بچوں کا اگر ابتدائی مرحلہ میں اسلامی ذہن بنادیا جائے اور ان کی صحیح تربیت ہو جائے، تو پھر جو بھی پڑھیں اور بنیں، ایک مسلمان کی حیثیت سے بنیں گے اور انشاء اللہ ان کو کوئی طاقت ''سلمان رشدی'' اور ''تسلیمہ نسرین'' بنانے میں کامیاب نہ ہو سکے گی اور خود ان دینی مدارس کے لئے بھی یہ نہایت مفید اور نتیجہ خیز قدم ہوگا، ان مدارس کے فضلاء کے بارے میں جو شکایت ہے کہ یہ عصری معلومات سے بے خبر ہیں اور اپنے ماحول کے بارے میں بھی کوئی آگہی نہیں رکھتے، یہ شکایت بھی انشاء اللہ دور ہو جائے گی اور مدرسہ کی چہار دیواری سے نکلنے کے بعد اپنے آپ کو ماحول میں اجنبی اور نو وارد محسوس نہیں کریں گے۔

(۲۵/جون، ۲/جولائی ۱۹۹۹ء)

دینی تعلیم وتربیت کے لئے گرمائی کلاسس کچھ مشورے

تعلیم وتربیت کے کچھ شعبے وہ ہیں جن کی ضرورت ایک طبقہ کو پڑتی ہے، دوسرے طبقہ کونہیں پڑتی ہے، جیسے میڈیسن اور میڈیکل کہ اس کی ضرورت معالجین کو ہے، یا بہت سی اشیاء وہ ہیں، جن کی بنیادی معلومات ہر شخص کے لئے لازم ہے، جیسے راستہ پر چلنے کے قواعد، جرائم کے سلسلہ میں اس بات کا علم کہ کون سے کام قانون کی نظر میں جرم قرار پاتے ہیں، کھانے پینے کا طریقہ اور رہن سہن کا سلیقہ، یہ ایسی باتیں ہیں کہ انسانی سماج میں نشوونما پانے والے کسی شخص کے لئے ان سے نابلد رہنے کی گنجائش نہیں، ایسی ہی ضروری چیزوں میں دین کی بنیادی باتوں کا علم بھی ہے، جیسے غذا ہر شخص کی ضرورت ہے، سانس کے لئے ہوا ہر انسان کے لئے ضروری ہے اور جیسے کوئی زندہ آدمی پانی سے مستغنی نہیں ہوسکتا، اسی طرح دین ہر شخص کی ضرورت ہے مرد ہو کہ عورت، جوان ہو یا بوڑھا، امیر ہو یا غریب، پڑھا لکھا ہو یا جاہل، شہر کا رہنے والا ہو یا دیہات کا، اس نے اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم حاصل کر رکھی ہو اور اچھا سے اچھا ماہر فن ہو؛ لیکن علم دین سے وہ بے نیاز نہیں ہوسکتا؛ بلکہ ایسے لوگوں کو علم کی اور زیادہ ضرورت ہے؛ کیوں کہ اگر ایسے باصلاحیت افراد کے اندر دین اور دین کا شعور نہ آئے، تو وہ محض سکے ڈھالنے والی مشین بن جائیں گے اور انسانی خدمت کے اس حقیقی جذبہ سے محروم رہیں گے، جو ان کی تعلیم کا اصل مقصود ہے۔

جیسے شارعِ عام پر چلنے والے ہر شخص کے لئے ٹریفک قواعد کا علم ضروری ہے، اسی

طرح یہ کائنات بھی ایک راستہ ہے اور جتنے لوگ اس کائنات میں زندگی گزار رہے ہیں، وہ اس کے راہ رو ہیں، اس دنیا میں ہر شخص اس طرح زندگی گزارے کہ وہ دوسروں کے لئے ایذاء اور نقصان کا باعث نہ بنے، اور وہ اپنے آپ کو انسانی شرافت کی حدود میں باقی رکھے، اسی کے لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبروں اور رسولوں کے ذریعہ زندگی گزارنے کا طریقہ یعنی دین بھیجا ہے، یہ انسان کے لئے روحانی غذا ہے، یہ زندگی کے اندھیروں میں خدا کی روشنی (نور مبین) ہے، یہ آخرت کے ساتھ ہماری دنیا کی فلاح کا بھی ضامن اور محافظ ہے؛ اس لئے دین کی کم سے کم بنیادی تعلیم سے کسی کو مفر نہیں۔

اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ برصغیر میں انگریزوں کی آمد کے بعد علماء نے خالص قومی تعاون سے چلنے والے ایسے دینی مدارس کی بنیاد رکھی، جن میں مفت تعلیم اور مفت قیام وطعام کا نظم کیا گیا اور اللہ نے کچھ بے نوا فقیروں سے وہ خدمت لی، جو بادشاہوں کے نصیب میں بھی نہ آسکی، ان مدارس نے ایسے طبقہ کو علم سے آراستہ کیا ہے، جن کے لئے تعلیم کے دوسرے تمام راستے بند ہیں اور آج اس خطہ میں اسلامی تشخصات کا باقی رہنا بڑی حد تک ان ہی مدارس کی دین ہے؛ لیکن ظاہر ہے کہ ان مدارس میں جو طلبہ آتے یا لائے جاتے ہیں، ان کا تناسب شاید ایک فی ہزار بھی نہ ہو، تو ہمارے قوم کے یہ ہزاروں طلبہ وطالبات جو سرکاری اور سرکاری طرز کی درس گاہوں میں زیر تعلیم ہیں، کیا ان کی دینی تعلیم کے بارے میں ہم پر کوئی ذمہ داری نہیں ہے؟ ہمارے یہ بچے اور بچیاں اگر دین سے نابلد رہ جائیں، ان میں خدا اور اس کے رسول ﷺ کی معرفت اور محبت نہ پیدا ہو، تو یہ کس قدر محرومی کی بات ہوگی!

اپریل، مئی اور جون کا کچھ حصہ ان درس گاہوں میں تعطیلات کا ہوتا ہے، ان تعطیلات میں اسلامیات کے گرمائی کلاسس قائم کر کے ہم اس ضرورت کی تکمیل کر سکتے ہیں اور یہ یقیناً رسول اللہ ﷺ کی ایک سنت کی تکمیل ہوگی، آپ ﷺ کے پاس جو صحابہ رضی اللہ عنہم آتے ان میں بڑی تعداد ایسے لوگوں کی ہوتی جو ماہ دو ماہ کے لئے خدمتِ اقدس میں رہتے، صفہ میں قیام کرتے، اور آپ ﷺ سے اور آپ ﷺ کے قدیم صحبت یافتہ رفقاء سے دین کی ضروری باتیں سیکھ کر واپس

جاتے، یہ ایسا مختصر مدتی نظامِ تعلیم تھا جس سے اسلام کی روشنی دور دور تک پہنچی اور مسلمانوں میں کوئی شخص ایسا باقی نہ رہا جو دین کی بنیادی تعلیمات سے ناآشنا ہو، دوسری طرف وہ صحابہ رضی اللہ عنہم تھے، جنھوں نے اپنی پوری زندگی اس علم کے حاصل کرنے میں وقف کر رکھی تھی اور وہ استنباط واجتہاد کے مقام پر فائز تھے، پس آج بھی یہ بات ضروری ہے کہ اُمت کے مختلف طبقات بالخصوص طلبہ برادری کے لئے ایسا مختصر مدتی نظامِ تعلیم وضع کیا جائے، جو ان کو ضروریاتِ دین سے آشنا کر دے، اس کے علاوہ مختلف پیشوں سے تعلق رکھنے والے مسلمانوں جیسے: ڈاکٹروں، انجینئروں، قانون دانوں وغیرہ کے لئے بھی ایسے تربیتی کیمپ منعقد ہونے چاہئیں کہ وہ زندگی کے عام مسائل کے علاوہ اپنے پیشہ سے منسلک مسائل میں بھی اسلامی تعلیمات سے باخبر ہوسکیں، اس سے ہمارے ڈاکٹر واقعی مسلمان ڈاکٹر بن سکیں گے، ہمارے انجینئرس میں اپنے فن کو انسانی خدمت کے لئے استعمال کرنے کا جذبہ پیدا ہوگا اور ہمارے قانون داں ظالم اور مظلوم کی تفریق کرنا سیکھیں گے۔

طلبہ اور طالبات کے گرمائی تعلیمی نصاب میں کئی مضامین کو شامل ہونا چاہئے، یہ بھی بہت اہم ہے، ان میں بعض مضامین تو بنیادی ہیں :

اول : قرآن مجید کی تعلیم، اور اسی تعلیم کو ہم تین حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں، ایک تو تجوید کی رعایت کے ساتھ قرآن مجید کا ناظرہ، دوسرے: طلبہ کے سن وسال اور استعداد کے لحاظ سے قرآن مجید کی سورتوں کا حفظ، مثلاً بالکل مبتدی بچوں کے لئے سورہ فاتحہ تا سورہ اخلاص، اس سے اونچے معیار کے طلبہ کے لئے سورہ فیل تک اور اس سے اونچے معیار کے طلبہ وطالبات کے لئے سورہ ضحیٰ تک، جن طلبہ کو یہ سورتیں یاد ہوں، ان کے لئے مخصوص سورتوں، سورہ ملک، سورہ واقعہ، سورۃ بقرہ کا ابتدائی وانتہائی رکوع وغیرہ کا حفظ، قرآن کی تعلیم کا تیسرا پہلو قرآن کا ترجمہ اور معانی قرآن سے واقفیت ہے، اس کے لئے ضروری ہے کہ مختلف شعبہ ہائے زندگی سے متعلق آیات قرآنی کا ایک انتخاب ہو، ان آیات کو مع ترجمہ زبانی یاد کرایا جائے، اس میں عقیدہ واخلاق سے متعلق آیتیں بھی ضرور ہونی چاہئیں۔

دوسرا موضوع سیرت ہے، رسول اللہ ﷺ کی معرفت اور آپ کی محبت اس دین کی اساس و بنیاد ہے اور مسلمانوں کے ایمان کی حفاظت کا سب سے مؤثر ذریعہ بھی ہے؛ اسی لئے یہودی اور عیسائی مصنفین نے آپ ﷺ کی حیاتِ طیبہ کو مجروح کرنے کی اپنی دانست میں خوب کوششیں کی ہیں، جو پہلے بھی ناکام ہوئیں اور انشاء اللہ آئندہ بھی ناکام و نامراد ہی ہوں گی؛ اس لئے ضروری ہے کہ لازمی طور پر آپ ﷺ کی سیرت طیبہ کو پڑھانی چاہئے، سیرت پر متعدد مختصر رسائل جامعہ ملیہ دہلی سے شائع ہوئے ہیں اور طلبہ کی نفسیات کو سامنے رکھ کر لکھے گئے ہیں، انھیں پڑھایا جاسکتا ہے اور جو ان سے اونچے معیار کے طلبہ ہوں، ان کے لئے محترمہ امۃ اللہ تسنیم مرحومہ (ہمشیرہ مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ) کی تالیف ''ہمارے حضور ﷺ'' نہایت ہی مفید کتاب ثابت ہوسکتی ہے، اس کی زبان بہت سہل اور عام فہم ہے اور مختصر الفاظ میں سیرت کی تمام بنیادی باتیں آگئی ہیں، یہ کتاب واقعہ ہے کہ بچوں کے ادب کا بہترین نمونہ ہے، اس کے علاوہ موصوفہ ہی کی ایک اور کتاب ''بچوں کی قصص الانبیا'' ہے جس میں حضرت آدم علیہ السلام سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک کے حالات چار حصوں میں نہایت ہی آسان اور عام فہم زبان میں لکھے گئے ہیں، نیز انبیاء کے تمام قصص قرآن سے ماخوذ ہیں، اس میں دیوتاؤں کی کہانیوں، اسرائیلی اور موضوع روایتوں کا کہیں کوئی دخل نہیں ہے، اس طرح یہ مجموعہ نہ صرف بچوں کو انبیاء کی مبارک زندگی سے روشناس کرتا ہے؛ بلکہ قرآنی قصص سے بھی انھیں بڑی حد تک مانوس کر دیتا ہے۔

تیسرا ضروری موضوع احادیث اور دینی تربیت کا ہے، رسول اللہ ﷺ نے چالیس احادیث کے یاد کرنے کی خصوصی فضیلت بیان فرمائی ہے، اور اسی ارشاد نبوی کے پس منظر میں مختلف بزرگوں نے ''اربعین'' کے نام سے چالیس حدیثوں کے مجموعے مرتب فرمائے ہیں، طلبہ و طالبات کو ایسی مختصر چالیس حدیثیں اُردو یا انگریزی ترجمہ کے ساتھ یاد دلانی چاہئے، جو عقائد و اعمال، عبادات کی اہمیت و فضیلت اور اخلاق و آداب کے بارے میں اسلام کے مزاج و مذاق کی رہنمائی کرتی ہو، یہ ایک حقیقت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے ارشادات اپنے لفظی

حسن، معنوی گہرائی اور زندگی میں نافعیت کے اعتبار سے جواہر پاروں سے کم نہیں، ان اقوال زریں کو یاد کرنے سے رسول اللہ ﷺ کی عظمت اور آپ ﷺ کی محبت میں بھی اضافہ ہوگا۔

دینی تربیت میں ضروری اذکار واوراد اور شب وروز کی مختلف مواقع سے متعلق دُعائیں بھی شامل ہیں، ان دُعاؤں کو اردو اور انگریزی ترجمہ کے ساتھ یاد دلانا مناسب ہوگا، اس میں شبہ نہیں کہ دُعائیں عقیدہ وایمان کی بھی اصلاح کرتی ہیں، اللہ کا یقین بڑھاتی ہیں اور اسلامی ثقافتی تشخصات کو بھی ظاہر کرتی ہیں، ان دُعاؤں کے ذریعہ رسولِ اقدس ﷺ نے مؤمن کی پوری زندگی کو اللہ کی حمد وثنا اور جذبہ سپاس سے مربوط کر دیا ہے اور یہی تعلق مع اللہ انسانیت کا اصل جوہر ہے، دینی تربیت میں روزمرہ پیش آنے والی ضروریات یعنی کھانا، پینا، سونا، جاگنا، لوگوں سے ملاقات، پردہ، صفائی ستھرائی، استنجاء وغیرہ کے اسلامی آداب شامل ہیں، جن کی عملی مشق بھی ضروری ہے، اس سلسلے میں صحابۂ کرام اور سلف صالحین کے مستند واقعات بھی بچوں کو پڑھانے چاہئے اور جو خود نہیں پڑھ سکتے ان کو کہانی کے طور پر سنانا چاہئے، اس سلسلہ میں جناب افضل حسین صاحب کی ''اخلاقی کہانیاں'' اور ''سچی کہانیاں'' اور ذرا بڑی طالبات کے لئے مولانا عبدالسلام ندوی کی ''اسوۂ صحابیات'' بہتر کتابیں ہیں۔

عقائد اور اعمال، آداب واخلاق اور سیرت نبوی ﷺ کے سلسلے میں مولانا محمد میاں صاحبؒ کی دینی تعلیم کے رسائل بھی بڑے نفیس اور مفید ہیں، گو اس مختصر مدت میں ان تمام رسائل کو پڑھانا ممکن نہیں؛ لیکن ایک دو منتخب رسالوں کو پڑھایا جاسکتا ہے، اسی طرح عقائد وعبادات کے لئے مولانا مفتی کفایت اللہ صاحبؒ کی کتاب ''تعلیم الاسلام'' سوال وجواب کے انداز پر مفید کتاب ہے، یہ تو شاید ممکن نہ ہو کہ ایک ماہ میں یہ پورا رسالہ پڑھا دیا جائے؛ لیکن کم سے کم عقیدہ کا حصہ ضرور پڑھایا جاسکتا ہے، ہندوستان کے موجودہ حالات میں یہ بات بہت ضروری ہوگئی ہے کہ ہمارے بچے عقیدۂ توحید کے بارے میں پختہ ذہن کے حامل ہوں اور شرک کی نفرت پوری طرح ان کے دلوں میں راسخ ہو؛ تاکہ ہندوتوا تحریکوں کی جانب سے مسلمانوں کی نئی نسل کو اعتقادی اور تہذیبی اعتبار سے جذب کرنے کی جو کوشش کی جارہی ہے

اس خطرہ سے ان کو بچایا جاسکے۔

اس وقت ہندوستان میں اس بات کی کوشش کی جارہی ہے کہ تاریخ کو مسخ کر کے مسلمانوں کو ڈاکو، لٹیرا اور دہشت گرد ثابت کیا جائے اور مسلمان فرماں رواؤں کے ظلم وجور کی مفروضہ کہانیاں اس کثرت سے بیان کی جائیں اور لکھی جائیں کہ نہ صرف ہندوؤں میں فرقہ پرستی کا ذہن پروان چڑھے؛ بلکہ خود مسلمانوں کی نئی نسل اپنے بارے میں احساس کمتری میں مبتلا ہوجائے اور اپنے اسلاف کی تاریخ پر شرمانے لگے، اس پس منظر میں یہ بات ضروری ہوگئی کہ ہماری نئی نسل ہندوستان کی حقیقی تاریخ سے آشنا ہو اور وہ پروپیگنڈوں اور مغالطوں کا شکار نہ ہو، اس سلسلہ میں جناب افضل حسین صاحبؒ کی کتاب ''آئینہ تاریخ'' ایک مفید اور جامع کتاب ہے، جس میں سنگھ پریوار کی جانب سے اُٹھائے جانے والے بے جا اعتراضات کو ملحوظ رکھا گیا ہے، اتنے کم عرصے میں یہ پوری کتاب تو شاید نہ پڑھائی جاسکے؛ لیکن کم سے کم اس کے مغلیہ عہد کا حصہ پڑھا دیا جائے تو بہتر ہوتا کہ بابر اور حضرت اورنگ زیب عالمگیرؒ کے بارے میں جو غلط فہمیاں پیدا کی جاتی ہیں ان کا ازالہ ہوسکے۔

غرض کہ موجودہ حالات میں یہ بات ضروری ہوگئی ہے کہ ہم اپنے ان بچوں کو جو اسکولوں اور کالجوں میں زیر تعلیم ہیں، شعوری طور پر مسلمان بنائیں اور ان میں فکری پختگی پیدا کریں کہ وہ اسلام کے خلاف کئے جانے والے پروپیگنڈوں کا جواب دینے کے لائق بن سکیں؛ بلکہ اسلامی افکار واحکام کو انھیں اپنے معقول طریقے پر پڑھایا جائے، اللہ کی اس بھیجی ہوئی ابدی اور آفاقی سچائی کی طرف بلاسکیں، اس کے لئے گرمائی تعطیلات کے ایام اور مختلف سن و سال کے طلبہ وطالبات کے نفسیات اور ان کی شعوری صلاحیت کو سامنے رکھ کر مستقل نصاب مدون کرنے کی ضرورت ہے، کاش ہمارے تعلیمی مراکز اس جانب توجہ دیں۔

(۲۷/اپریل ۲۰۰۱ء)

مادری زبان میں تعلیم کی اہمیت

ملک کو آزاد ہوئے نصف صدی کا عرصہ گذر چکا ہے، قوموں کی زندگی میں پچاس سال کی مدت کچھ کم مدت نہیں ہوتی، اس نصف صدی نے جہاں ہمیں محرومی کی داستانیں دی ہیں، وہیں ہم نے بہت کچھ پایا بھی ہے، ہم نے جو کچھ پایا ہے ان میں سب سے اہم چیز تعلیم کی ضرورت اور اس کی اہمیت کا احساس ہے، کسی صالح انقلاب کے لئے سب سے پہلی ضرورت یہی ہوتی ہے کہ انسان اپنی کوتاہی کا احساس کرے اور اس کے اندر اس خیر کی طلب بلکہ تڑپ پیدا ہو جائے جو زندگی کو سنوارنے اور اسے کامیابی سے ہمکنار کرنے کا ذریعہ ہو، اس لئے بچوں کو تعلیم دلانے کا یہ عمومی رجحان بھی ایک بہت بڑی کامیابی ہے!

ایک زمانہ تھا کہ علم کو مخصوص خاندان کی جاگیر سمجھا جاتا تھا، کچھ زمیندار اور وڈیرے اپنے بچوں کو تعلیم دلاتے تھے، لوگوں کے ذہن میں یہ بات بیٹھادی گئی تھی کہ صرف یہی لوگ پڑھنے پڑھانے کے لئے پیدا ہوئے ہیں، عام لوگ اپنے بچوں کے بارے میں تعلیم دلانے کا تصور بھی نہیں کرتے تھے اور نچلے درجے کے کاموں پر قانع تھے، متوسط درجہ کے لوگ اگر اپنے بچوں کو پڑھاتے بھی تو چھوٹے اور معمولی اسکولوں میں ہی پڑھا سکتے تھے، معیاری درس گاہیں نوابان، رؤساء اور جاگیرداروں کے لئے مخصوص تھیں، عام لوگوں کے بچے ان درس گاہوں میں تعلیم نہیں پاسکتے تھے اور ظاہر ہے کہ یہ اس ہندوانہ فکر و تہذیب کا اثر تھا، ذات پات کی تفریق جن کے عقیدہ کا جزو ہے اور جن کے لئے اس فکر سے آزاد ہو کر سوچنا ممکن نہیں ہے۔

یہ اللہ کا شکر ہے کہ جمہوری نظام نے ان بند دروازوں کو کھولا، تعلیم کے مواقع سے فائدہ اٹھانے کا سبھوں کو موقع میسر آیا اور یہ سوچ عام ہوئی کہ تکلیف اٹھا کر اور پیٹ کاٹ کر بچوں کو تعلیم دلانی چاہئے؛ لیکن ملک کے موجودہ نظام تعلیم کے تانے بانے ان بدیشی آقاؤں

کے بنے ہوئے ہیں، جن کا اصل مقصد تعلیم کو وسیلہ بنا کر رعایا کو اپنی فکر اور اپنی تہذیب وثقافت کا اسیر بنانا تھا، وہ چاہتے تھے کہ ہندوستان اپنے تمدن میں مغرب کا عکس ہو جائے، ان کا منصوبہ تھا کہ ان کے دماغ مغربی فکر کے سانچے میں ڈھل جائیں، ان کی کوشش تھی کہ وہ اپنی زبان بھول جائیں اور ان کا اصل ہدف یہ تھا کہ رعایا اپنے مذہب وعقیدہ کے بارے میں بھی حکمراں کی متبع ہو جائے اور اگر اتنا نہ ہو تو کم سے کم ان کے دلوں میں اپنے مذہب کی بابت شکوک وشبہات کے کانٹے چبھ جائیں۔

انگریز رہنما اس پالیسی پر کتنی منصوبہ بندی کے ساتھ عمل پیرا تھے؟ اس کا اندازہ اس خط کے اقتباس سے کیا جاسکتا ہے جو میکاؤلے نے ۱۸۳۶ء میں اپنے والد کو لکھا تھا کہ :

> ہمارے انگریز اسکول دن دونی رات چوگنی ترقی کر رہے ہیں اور اب حالت یہ ہوگئی ہے کہ طلبہ کے لئے گنجائش نکلنی مشکل ہے...... اس تعلیم کا بہت زیادہ اثر ہندوؤں پر ہو رہا ہے، کوئی ہندو انگریزی پڑھنے کے بعد اپنے مذہب پر فی الواقع ایمان نہیں رکھ سکتا، مجھے پورا اعتماد ہے کہ اگر ہماری تعلیمی پالیسی کامیاب ہوئی تو بنگال میں کوئی بت پرست باقی نہ رہے گا، یہ سب فطری طور پر ہوگا، بغیر کسی مذہبی وعظ اور مداخلت کے۔

(B.C.Rai History of Indian Education p.135 بحوالہ: طرز تعلیم: ۷)

اسی لئے اُردو زبان کے دو مشہور شعراء —— جو مشرق اور مغرب دونوں کے بادہ خواروں میں تھے اور انگریزی زبان اور مغربی علوم پر ماہرانہ نظر رکھتے تھے، نے —— مسلمانوں کو للکارا اور اس جدید نظام تعلیم کے فتنہ سے ان کو باخبر کرنے کی کوشش کی، میری مراد اکبر الٰہ آبادی اور ڈاکٹر اقبالؒ سے ہے، یہ کوئی مولوی اور دینی مدارس کے فیض یافتگان میں نہ تھے؛ بلکہ ان کی پوری تعلیم اسی درس گاہ میں ہوئی جو اس زمانہ میں مغرب کی نمائندہ تھی؛ بلکہ اقبالؒ نے تو یورپ کے قلب میں پہنچ کر علم حاصل کیا اور اس نظام تعلیم کو سر کی آنکھوں سے دیکھا

اور کہہ اٹھے :

اور یہ اہل کلیسا کا نظام تعلیم
ایک سازش ہے فقط دین ومروت کے خلاف

ایک موقعہ پر اقبال نے کیا تیکھی تنقید کی ہے :

لڑکیاں پڑھ رہی ہیں انگریزی ڈھونڈلی قوم نے فلاح کی راہ
روش مغربی ہے مد نظر وضع مشرق کو جانتے ہیں گناہ
یہ ڈرامہ دکھائے گا کیا سین ؟
پردہ اُٹھنے کی منتظر ہے نگاہ

غالباً اقبالؔ زندہ ہوتے تو وہ اعتراف کرتے کہ پردہ اُٹھ چکا ہے اور جس الحاد کا انتظار تھا وہ اب نگاہوں کے سامنے پوری طرح بے لباس ہے۔

جن لوگوں نے اس نظام تعلیم پر تنقید کی ہے، ایسا نہیں ہے کہ وہ تحقیق وسائنس کے خلاف ہوں، سائنس تو کائنات میں چھپی ہوئی حقیقتوں سے پردہ اٹھاتی ہے، اگر اس سے لوگوں کو نفع پہنچے تو کوئی سمجھدار شخص کیسے اس کی مخالفت کرسکتا ہے؟ اصل یہ ہے کہ ہر قوم کا نظام تعلیم اس کے افکار اور سماجی ماحول سے ہم آہنگ ہونا چاہئے، وہ علم کے ساتھ ساتھ اسے اپنے عقیدہ پر پختگی دے، اپنی تہذیب وثقافت سے اس کی وابستگی کو برقرار رکھے، وہ اپنے بارے میں احساس کمتری کا شکار نہ ہو، ہندوستان کو جو نظام تعلیم اپنے مغربی آقاؤں سے ملا، وہ اس خصوصیت سے محروم ہے، وہ ہندوستانیوں کو اپنی زبان، اپنی تہذیب، اپنے ادب اور اپنی سماجی قدروں کے بارے میں احساس کمتری میں مبتلا کرتا ہے، اور اس کی اہم وجوہ میں ایک یہ ہے کہ ہم نے انگریزی زبان کو ایک زبان کی حیثیت سے پڑھنے کے بجائے اسی کو ''ذریعہ تعلیم'' بنالیا، کہ ہمارے بچے اپنی الف، ب سے ہی انگریزی میں بولنا، انگریزی میں لکھنا اور انگریزی میں سوچنا شروع کردیں۔

انگریزی کی عظمت کچھ اس طرح ہمارے دل ودماغ پر مسلط ہوئی کہ ہم نے اس کو علم

کی معراج سمجھ لیا، اور اس چیز نے ہمارے بچوں کو ذہنی اعتبار سے بھی اور صحت جسمانی کے اعتبار سے بہت نقصان پہنچایا ہے، غور کیجئے کہ ابتداء ہی سے انگریزی ذریعہ تعلیم قرار پائی، ہندوستان میں قومی زبان کی حیثیت سے اسے ہندی بھی پڑھنی ہے، اور چوں کہ یہ ایک ''مختلف لسانی'' خطہ ہے اس لئے ہر علاقہ کی اپنی اپنی زبانیں اس کے سواء ہیں، طالب علم اسے بھی پڑھے گا، اگر ہندی ریاستوں میں کوئی اور مقامی زبان نہیں تو اب قوم پر سنسکرت مسلط کی جارہی ہے، ان کے علاوہ مسلمانوں کو اپنے سماجی رابطہ اور مذہبی ورثہ سے وابستگی کے لئے اردو بھی پڑھنی ہے، اس طرح ہمارے مسلمان بچوں کو ابتدائی عمر سے ہی چار چار زبانوں کا بوجھ اٹھانا پڑتا ہے۔

طبّی اعتبار سے نوعمر بچوں کے لئے یہ ایک بار گراں ہے، بالخصوص ان حالات میں کہ فی زمانہ چار سال کی عمر سے ہی بچوں کی تعلیم شروع کرادی جاتی ہے اور ابھی زبان کا تلفظ بھی درست نہیں ہوتا کہ کتابوں کا ضخیم بستہ پشت پر رکھ دیا جاتا ہے، دوسرے کسی بھی انسان کے اندر اپنی زبان کو بے تکلف سمجھنے اور ادا کرنے کی جو صلاحیت ہوتی ہے، اجنبی زبان کو اس طریقہ پر پڑھنا پڑھانا دشوار ہوتا ہے، نتیجہ یہ ہے کہ اصل مضمون کو سمجھنے اور اس میں فکری ترقی حاصل کرنے کے بجائے اس کا ذہن چند انگریزی فقروں کے گرد گھومتا رہتا ہے، اصل فن پر اس کی توجہ کم ہوتی ہے، اسی لئے دنیا کی جتنی ترقی یافتہ قومیں ہیں، انھوں نے علوم وفنون کو اپنی مادری زبان کا جامہ پہنایا ہے، اور وہ اپنے بچوں کو اسی زبان میں تعلیم دیتے ہیں، فرانسیسی اور جرمن جغرافیائی اعتبار سے برطانیہ سے کتنے قریب ہیں؟ لیکن ان کے یہاں ذریعہ تعلیم فرانسیسی اور جرمنی ہے، چین اور جاپان دنیا کے ترقی یافتہ اور معاشی اور صنعتی اعتبار سے طاقت ورترین ممالک میں ہیں؛ لیکن ان کے یہاں ذریعہ تعلیم چینی اور جاپانی ہے، روس میں جب کمیونسٹ انقلاب آیا اور اس نے ترقی کی نئی کروٹ لی، تو سب سے پہلے مغربی علوم کو روسی زبان میں منتقل کیا؛ لیکن ہمارے ذہنوں پر انگریزی کا ایسا سحر چھایا ہوا ہے کہ ہم اپنی قومی زبانوں میں عصری تحقیقات کو منتقل کرنے میں پوری طرح کامیاب نہیں ہوئے

اور بجائے اس کے کہ ہم دوسرے علوم کو اپنی زبان کا جامہ پہناتے ہم نے خود اپنی زبان سے منھ پھیر لیا۔

مسلمان جب فاتحانہ یورپ تک پہنچے اور یورپ میں ان کو حکمت و دانش کا ورثہ ملا تو نہایت بے تعصبی کے ساتھ اسے گلے لگایا اور سر آنکھوں پر رکھا؛ لیکن جلد سے جلد اس علمی سرمایہ کو عربی زبان میں منتقل کرلیا، عباسی دور میں اس سلسلہ میں جو کارہائے نمایاں انجام دئے گئے وہ کسی صاحبِ علم کے لئے محتاج اظہار نہیں، ہندوستان میں مسلمانوں کے لئے مادری زبان سے محرومی کا ایک اور بڑا نقصان یہ ہے کہ ہمارے دینی علوم و معارف کا بہت بڑا حصہ اُردو زبان میں ہے، انگریزی یا دوسری مقامی زبانوں میں اسلام پر جو کچھ کام ہوا ہے، وہ اس کا عشر عشیر بھی نہیں، ان حالات میں اگر ہماری نسلیں اردو زبان سے ناواقف رہیں تو یہ براہِ راست دین و ایمان سے ان کا رشتہ کاٹ دینے کے مترادف ہوگا۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اُردو ذریعہ تعلیم کے معیاری مدارس قائم کریں، بچوں کو مادری زبان میں کم سے کم میٹرک تک تعلیم دیں اور انگریزی کو بھی ایک زبان کی حیثیت سے پڑھائیں؛ تاکہ وہ اصل فن میں آگے بڑھ سکیں اور جو صلاحیت محض سمجھنے اور سمجھانے میں صرف ہوتی ہے، وہی صلاحیت اصل مضمون میں استعمال ہو، یہ انشاء اللہ ان کی تعلیمی ترقی کا ضامن ہوگا، ہر سال اگر رینک لانے والے طلبہ وطالبات کا جائزہ لیا جائے تو یہ وہ ہیں، جنھوں نے مادری زبان میں تعلیم حاصل کی ہے، پڑوسی ریاست مہاراشٹر میں بحمد اللہ کئی سال سے مسلم طلبہ اور طالبات اُردو سے تعلیم پاکر امتیازی رینک لاتے ہیں۔

انگلش میڈیم کا جو طوفان اس وقت آیا ہوا ہے اور غالباً مسلمان اس کے زیادہ شکار ہیں، وہ جہاں معاشی اعتبار سے متوسط خاندان کے لوگوں کی کمر توڑ رہا ہے، وہیں یہ بات بھی دیکھنے میں آتی ہے کہ بہت سے بچوں کے لئے یہ تعلیم ایسا بوجھ ثابت ہوتی ہے کہ وہ چند قدم چل کر تھک ہار کر بیٹھ جاتے ہیں اور اپنا تعلیمی سفر مکمل نہیں کر پاتے، اس کے علاوہ اُردو زبان سے ناواقفیت انھیں سماج سے بھی کاٹ دیتی ہے، وہ اپنے خاندان کے بزرگوں سے کسی اہم

موضوع پر مؤثر گفتگو نہیں کر سکتے، اگر وہ باہر سے خط لکھیں تو ان کا خط پڑھا نہیں جاتا اور دین و مذہب سے جو ان کا رشتہ کمزور ہوتا ہے وہ نقصان تو سب سے سوا ہے، اس لئے اُردو ذریعۂ تعلیم کی درس گاہیں قائم کرنا، اپنے تعاونِ عمل سے انھیں مستحکم کرنا اور ان کو تقویت پہنچانا وقت کی نہایت اہم ضرورت ہے اور اسی میں ہمارے مذہب اور تہذیب و ثقافت کی حفاظت ہے۔

دینی و عصری درسگاہیں — تعلیمی مسائل

مشترک مسائل

اساتذہ کے ساتھ سلوک

چند دنوں میں ۵ رستمبر کی تاریخ آنے والی ہے، یہ بعض اعتبار سے نہایت اہم تاریخ ہے؛ کیوں کہ اس دن کو ''یوم اساتذہ'' کی حیثیت سے منایا جاتا ہے، اساتذہ ہی سماج وقوم کے اصل معمار ہیں؛ کیوں کہ تعلیم گاہوں کی حیثیت سپلائی ہاؤس کی ہے، جہاں سے ہر شعبۂ زندگی کو افراد فراہم کئے جاتے ہیں، حکومت کو اچھے منتظم، عدالتوں کو منصف اور جج، دواخانوں کو طبیب اور معالج، کارخانوں کو انجینئر اور کارکن، مارکٹ کو مارکٹنگ کرنے والے کارکن اور اچھی منصوبہ بندی کرنے والے افراد واشخاص، مالیاتی اداروں کو اچھے محاسب، یہاں تک کہ ملک کی سرحدوں کو باشعور فوجی اور ان سب سے بڑھ کر سماج کو سچا خادم اور مصلح، غرض زندگی کا کوئی شعبہ نہیں، جو تعلیم گاہوں سے مستغنی ہو اور ان تعلیم گاہوں کے ارتقاء واستحکام اور نافعیت وافادیت کا پورا انحصار ان ہی ساتذہ پر ہے۔

استاذ کی ذمہ داری معمولی نہیں، وہ اپنی آنکھیں جلاتا ہے، دل ودماغ کو سلگاتا ہے اور اپنے مطالعہ کا حاصل ان لوگوں کو سمجھاتا ہے جو سمجھنے کے لئے تیار نہیں ہوتے اور جو اپنی بے شعوری کی وجہ سے اس راہ کی آبالہ پائی کو سب سے زیادہ گراں خاطر تصور کرتے ہیں، تعلیم کا کام آسان نہیں، بالخصوص متوسطات تک کی تعلیم؛ کیوں کہ یہ ان لوگوں کو دکھانا ہے جو دیکھنا نہیں چاہتے، یہ ان لوگوں کو سنانا ہے جو سننے کو تیار نہیں، یہ ان لوگوں کو سمجھانا ہے جو سمجھنے پر آمادہ نہیں اور یہ ایسے فقیر کی کشکول بھرنا ہے جس کو اپنی فقر واحتیاج اور ضرورت کا شعور تک نہیں، اس لئے اساتذۂ ومعلمین کی ذمہ داریاں بہت ہیں، علم اور طالب علم کی محبت اور افادۂ ونفع رسانی کے جذبۂ صادق کے بغیر کوئی شخص کامیاب استاذ ومعلم نہیں ہوسکتا، استاذ کے دل کو اپنے طلبہ کی محبت سے اسی طرح لبریز ہونا چاہئے، جیسے مشک خوشبو سے ہوتا ہے، جب ہی اس کے

علم کی خوشبو پھیلے گی اور اس کا فیض علم عام وتام ہوگا۔

استاذ کی ذمہ داریاں جتنی زیادہ ہیں، اسی نسبت سے اس کے حقوق اور اس کے تئیں طلبہ اور اولیاء طلبہ اور سماج کی ذمہ داریاں بھی بہت ہیں، استاذ کی اہمیت اور اس کے مقام کی رفعت کے لئے یہی بات کافی ہے کہ قرآن مجید نے امت سے رسول اللہ ﷺ کی جس نسبت کو سب سے زیادہ نمایاں کیا ہے اور اس کا بار بار ذکر کیا ہے، وہ یہی ہے کہ آپ ﷺ اس اُمت کے معلم ہیں: ''**یعلمهم الکتاب و الحکمة**'' (آل عمران: ۱۶۴) رسول اللہ ﷺ ایک مرتبہ مسجد نبوی تشریف لائے تو مسجد میں مختلف حلقے قائم تھے؛ لیکن آپ ﷺ نے اس حلقے کا انتخاب فرمایا جو علمی مذاکرے کا تھا اور ارشاد فرمایا کہ میں معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں: ''**انما بعثت معلما**''۔ (سنن دارمی: ۳۵۷، سنن ابن ماجہ: ۲۲۹)

اساتذہ کا بنیادی حق ان کے ساتھ تکریم واحترام کا رویہ اختیار کرنا ہے، طلبہ ہوں یا اولیاء طلبہ اور حکومت ہو یا سماج، اساتذہ کا احترام سب کی ذمہ داری ہے، قرآن مجید نے اس سلسلہ میں ایک دلچسپ واقعہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت خضر کا نقل کیا ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام قانونِ شریعت کے سب سے بڑے عالم اور اپنے وقت کے جلیل القدر پیغمبر ہیں اور حضرت خضر تکوینی علوم کے عالم ہیں، ظاہر ہے اس اعتبار سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا علمی مقام بڑھا ہوا ہے؛ چنانچہ ایک خاص پس منظر میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم ہوا کہ وہ حضرت خضر سے علمی استفادہ کریں؛ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنے ایک رفیق کے ساتھ ایک جاں گسل اور بھٹکا دینے والا سفر کر کے حضرت خضر کی خدمت میں حاضر ہوئے، حضرت خضر کے مزاج اور گفتگو کا جو نقشہ قرآن نے کھینچا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بہت صاف گو؛ بلکہ ایک حد تک تیز مزاج آدمی تھے، خود حضرت موسیٰ علیہ السلام پر بہ مقابلہ جمال کے جلال کا رنگ غالب تھا، حضرت خضر نے غیر مشروط طور پر تعلیم وتربیت کی ذمہ داری قبول نہیں فرمائی؛ بلکہ یہ شرط بھی لگائی کہ چاہے کتنی بھی خلاف طبیعت بات نظر آئے، مہر بہ لب رہیں۔

اب ایک طالب علم اور استاذ کا سفر شروع ہوا، گویا ایک موبائیل درس گاہ ہے، جس میں

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے داخلہ لیا ہے، حضرت خضر سے بار بار خلاف طبع اور بعض اوقات بہ ظاہر خلاف شرع باتیں صادر ہوتی ہیں اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا پیمانۂ صبر لبریز ہو جاتا ہے اور بے ساختہ سوال کر بیٹھتے ہیں، پھر حضرت خضر کی طرف سے تنبیہ ہوتی ہے، اس تنبیہ کے جواب میں نہ احتجاج ہے، نہ معذرت، نہ تنقید ہے نہ اعتراض؛ بلکہ کمال تواضع کے ساتھ اپنی بے صبری کا اعتراف اور آئندہ دامن صبر نہ چھوڑنے کا وعدہ، آخر یہ نوبت ایک بار نہیں؛ بلکہ تین تین بار پیش آتی ہے اور حضرت خضر کی طرف سے پروانۂ فراق دے دیا جاتا ہے، قرآن نے اس واقعہ کو عبرت وموعظت کے لئے بیان کیا ہے، اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ایک جلیل القدر پیغمبر کو بھی اپنے استاذ کے ساتھ کس درجہ تکریم اور تواضع کا سلوک کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔

یہی مزاج رسول اللہ ﷺ نے اس اُمت کا بنایا، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: علم حاصل کرو، علم کے لئے سکینت و وقار سیکھو اور جس سے علم حاصل کرتے ہو، اس سے تواضع اختیار کرو: ''تو اضعوا لمن تعلموا منه'' (مجمع الزوائد: ۱/ ۱۲۹) چنانچہ مسلمانوں کے یہاں استاذ کے ساتھ تواضع کی ایک روایت سی رہی ہے، امام شعبیؒ سے مروی ہے کہ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے نماز جنازہ پڑھی، میں نے خچر قریب کیا کہ وہ سوار ہوں، تو حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما تشریف لے آئے اور خچر کی رکاب تھام لی، حضرت زید رضی اللہ عنہ نے کہا: اے برادر زادہ رسول! اسے چھوڑ دو، ابن عباس رضی اللہ عنہما نے عرض کیا کہ ہمیں علماء اور اکابر کے ساتھ اسی سلوک یعنی تواضع وخدمت کا حکم دیا گیا ہے، حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے ہاتھ کو بوسہ دیا اور فرمایا کہ ہمیں بھی رسول اللہ ﷺ کے اہل بیت کے ساتھ اس سلوک کا حکم ہے، (احیاء العلوم: ۱/ ۵۰) امام ابو حنیفہؒ کے بارے میں منقول ہے کہ وہ اپنے استاذ حمادؒ کے مکان کی طرف بھی اپنا پاؤں نہیں کرتے تھے، حضرت انس رضی اللہ عنہ کی باندی حضرت جمیلہ سے مروی ہے کہ جب حضرت ثابت رضی اللہ عنہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کے پاس آتے تو حضرت انس رضی اللہ عنہ اپنی باندی سے فرماتے خوشبو لاؤ کہ میں اپنے ہاتھ میں لگاؤں؛ کیوں کہ ثابت رضی اللہ عنہ میرے ہاتھوں کو بوسہ دئے بغیر راضی نہیں ہوتے: ''لا یرضی حتی

یقبل یدی''۔ (مجمع الزوائد: ۱؍۱۳۰)

مشہور محدث امام بخاری نے اپنی کتاب صحیح بخاری میں آداب علم سے متعلق ایک باب 'کتاب العلم' کا قائم کیا ہے اور بڑے نفیس انداز پر علم سے متعلق اساتذہ اور طلبہ کی ذمہ داریوں پر روشنی ڈالی ہے، مثلاً یہ کہ جب استاذ درس دینے میں مشغول ہو اور بیچ میں طالب علم سوال کرلے تو اس استاذ کو کیا کرنا چاہئے، اونچی آواز خلاف ادب سمجھی گئی ہے؛ لیکن استاذ اپنے شاگرد سے اونچی آواز میں بات کرسکتا ہے، مجلس درس کا ادب یہ ہے کہ طالب علم کو جہاں جگہ ملے بیٹھ جائے، کیا استاذ تعلیم اور نصیحت وموعظت میں اپنے غصہ کا اظہار کرسکتا ہے؟ اس طرح کے بہت سے آداب طلبہ سے متعلق ذکر کئے گئے ہیں، استاذ کا کردار واخلاق کیسا ہو؟ اور طلبہ کے ساتھ وہ کیا رویہ اختیار کرے؟ اس پر بھی امام بخاری نے بڑی عمدہ روشنی ڈالی ہے، امام بخاری نے تعلیم وتعلم کے آداب میں اس بات پر بھی متنبہ فرمایا ہے کہ محض ذہانت اور محنت کسی طالب علم کے کامیاب ہونے کے لئے کافی نہیں؛ بلکہ استاذ کی دُعاء بھی نہایت ضروری چیز ہے، حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کم سن صحابی تھے اور حضور ﷺ سے زیادہ شرف رفاقت حاصل نہیں تھا، اس کے باوجود قرآن وحدیث اور فقہ واجتہاد میں بہت بلند پایہ شمار کئے گئے؛ کیوں کہ رسول اللہ ﷺ نے آپ ﷺ کے لئے تفقہ کی دُعاء فرمائی تھی، (بخاری، حدیث نمبر: ۷۵، باب قوله: اللهم علمه الكتاب) اور ظاہر ہے کہ دل سے دُعاء اس وقت نکلتی ہے جب طلبہ اور اولیاء طلبہ سے استاذ خوش ہو اور دل گرفتہ نہ ہو۔

آج کل صورتِ حال یہ ہے کہ استاذ اور شاگرد کا تعلق محض ایک قانونی اور تجارتی تعلق بن کر رہ گیا ہے، نہ احترام ہے اور نہ محبت، نہ شفقت ہے اور نہ دردمندی، نہ اساتذہ میں اپنے طلبہ کو پروان چڑھانے کی تڑپ ہے اور نہ طلبہ میں اپنے استاذ سے سچی محبت اور عظمت، اولیاء طلبہ کا حال یہ ہے کہ کسی سرکاری آفس میں پہنچیں گے، یا سیاست داں کی بارگاہ میں حاضری دیں گے تو خوشامد اور چاپلوسی کریں گے اور وہ اساتذہ جو اپنا خون جگر پلا کر ان کے بچوں کی علمی نشو ونما کرتے ہیں، ان سے نہ صرف ناشائستہ گفتگو کریں گے؛ بلکہ موقع ہو تو ہاتھا پائی سے بھی

دریغ نہ کریں گے، یہ انتہائی شرمناک اور افسوس ناک بات ہے، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تملق وخوشامد مؤمن کے اخلاق میں سے نہیں، سوائے طلب علم کے، کہ علم حاصل کرنے کے لئے خوشامد بھی کرنی چاہئے، (احیاء العلوم: ۱/ ۵۰) ایسی حرکتوں سے اصل نقصان خود طلبہ کا ہے؛ کیوں کہ جب استاذ طالب علم کی نظر میں بے وقار ہوجائے، تو علم کی عظمت بھی اس کے دل سے جاتی رہے گی؛ کیوں کہ تواضع اور جھکاؤ کے بغیر علم سے فائدہ نہیں پہنچتا، اللہ تعالیٰ نے خود فرمایا کہ دعوت حق ان ہی لوگوں کے لئے مفید ہوسکتی ہے، جن کے پاس قبول کرنے والا دل اور ہمہ تن متوجہ رہنے والے کان بھی موجود ہوں: ''لمن کان له قلب او ألقی السمع وهو شهید''۔

امام غزالیؒ نے جو فلسفۂ اخلاق کے بڑے ماہر اور انسانی نفسیات کے کامل درجہ رمز آشنا تھے، انھوں نے حصولِ علم کے لئے دس ضروری شرطیں لکھیں ہیں: ان میں سے تیسری شرط کو ان الفاظ میں تحریر فرمایا ہے :

> علم پر تکبر نہ کرے اور استاذ کے مقابلہ سرکشی کا ثبوت نہ دے؛ بلکہ پورے طریقہ پر اپنے معاملات کی لگام اس کے ہاتھ میں دے دے اور جیسے ایک جاہل مریض شفقت کرنے والے ماہر طبیب پر یقین رکھتا ہے، اسی طرح اپنے استاذ پر بھروسہ کرے، استاذ کے لئے تواضع اختیار کرے اور استاذ کی خدمت کرکے ثواب اور شرف کا خواستگار رہے۔ (احیاء العلوم: ۱/ ۵۰)

جہاں اساتذہ کے ساتھ احترام ومحبت ضروری ہے، وہیں یہ بھی ضروری ہے کہ معاشی اعتبار سے بھی ان کے ساتھ بہتر سلوک روا رکھا جائے، جس استاذ کا ذہن نان ونمک کی فکر سے آزاد نہ ہوگا وہ کیسے تعلیم کی طرف یکسو ہوسکے گا؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جب اپنے دورِ خلافت میں وظائف متعین کئے تو فریضۂ تعلیم انجام دینے والوں کا وظیفہ بہت ہی نمایاں رکھا، کہا جاتا ہے کہ امام ابوحنیفہؒ کے صاحبزادے حماد کو جب انکے استاذ نے سورۂ فاتحہ پڑھائی تو آپ نے پانچ سو دینار انھیں پیش کئے اور فرمایا کہ یہ بھی کم ہیں، گر اس وقت میرے پاس اس سے زیادہ

ہوتا، تو اور پیش کرتا، اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ہمارے بزرگوں کی نظر میں تعلیم کی کیا قدر و قیمت تھی، دینی مدارس کے ذمہ داران اور نجی درسگاہوں کے منتظمین کے لئے خاص طور پر یہ پہلو قابل توجہ ہے!

اساتذہ — مقام اور ذمہ داریاں

ابھی پانچ ستمبر کی تاریخ گزری ہے، یہ دن ''یوم اساتذہ'' (Teachers Day) کی حیثیت سے منایا جاتا ہے، کسی خاص سلسلہ میں ''دن منانا'' ایک رسم سا ہوگیا ہے؛ اس لئے سوائے اخبارات میں اکادکا رسمی بیان کے، ایسے مواقع پر کچھ نہیں ہوتا؛ حالاں کہ ایسے دنوں کو متعلقہ موضوعات پر سنجیدہ غور وفکر، تبادلۂ خیال اور ان کی روشنی میں انقلابی تبدیلیوں کی کوششوں کا محرک بنانا چاہئے۔

حقیقت یہ ہے کہ تعلیم وتدریس نہایت ہی مقدس اور معزز پیشہ ہے، ہر مذہب اور ہر سماج میں اساتذہ کو بڑا احترام حاصل رہا ہے؛ کیوں کہ سماج میں جو کچھ بھلائیاں اور نیکیاں پائی جاتی ہیں اور خدمت خلق کا جو سروسامان موجود ہے، وہ سب دراصل تعلیم ہی کا کرشمہ ہے اور درسگاہیں ان کا اصل سرچشمہ، اسلام کی نگاہ میں انسانیت کا سب سے مقدس طبقہ پیغمبروں کا ہے، پیغمبر کی حیثیت اپنے اُمتی کی نسبت سے کیا ہوتی ہے؟ اللہ تعالیٰ نے متعدد جگہ اس کا ذکر فرمایا ہے اور وہ یہی کہ نبی انسانیت کا مربی اور معلم ہوتا ہے، وہ تعلیم بھی دیتا ہے اور انسانیت کو اس علم کے سانچہ میں ڈھالنے کی بھی کوشش کرتا ہے : '' يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَ يُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَ الْحِكْمَةَ ''۔ (آل عمران: ۱۶۴)

اسی لئے اساتذہ کا احترام اسی قدر ضروری ہے جتنا اپنے والدین کا، حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فقہاءِ صحابہ میں ہیں، حدیث کی نقل وروایت اور فہم ودرایت میں بھی بڑے اعلیٰ درجے کے مالک ہیں اور تفسیر وفہم قرآن کا کیا پوچھنا کہ اُمت میں سب سے بڑے مفسر مانے گئے ہیں ؛لیکن اس مقام ومرتبہ کے باوجود صورتِ حال یہ تھی کہ حضرت زید بن ثابت انصاری رضی اللہ عنہ کی سواری کی رکاب تھام لیتے تھے اور کہتے تھے کہ ہمیں اہل علم کے ساتھ اسی

سلوک کا حکم دیا گیا ہے، (مستدرک حاکم: ۳/ ۴۲۳) خلف احمر مشہور امام لغت گزرے ہیں، امام احمدؒ ان کے تلامذہ میں ہیں؛ لیکن علومِ اسلامی میں مہارت اور زہد وتقوی کی وجہ سے امام صاحب کو اپنے استاذ سے بھی زیادہ عزت ملی، اس کے باوجود امام احمدؒ کبھی ان کے برابر بیٹھنے کو تیار نہیں ہوتے اور کہتے کہ آپ کے سامنے بیٹھوں گا؛ کیوں کہ ہمیں اپنے اساتذہ کے ساتھ تواضع اختیار کرنے کا حکم ہے، (**تذکرۃ السامع والمتکلم**، ص: ۸۷) امام شافعیؒ امام مالکؒ کے شاگردوں میں ہیں، کہتے ہیں کہ جب میں امام مالکؒ کے سامنے ورق پلٹتا تو بہت نرمی سے، کہ کہیں آپؒ کو بارِ خاطر نہ ہو، (حوالہ سابق، ص: ۸۸) خود قرآن مجید نے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت خضر کے واقعہ کو تفصیل سے بیان کیا ہے، باوجودیکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام مقامِ نبوت پر فائز تھے؛ لیکن انھوں نے نہایت صبر اور تحمل کے ساتھ حضرت خضر کی باتوں کو برداشت کیا اور بار بار معذرت خواہی فرمائی، امام ابوحنیفہؒ کے بارے میں منقول ہے کہ اپنے استاذ حمادؒ کے مکان کی طرف پاؤں کرنے میں بھی لحاظ ہوتا تھا، امام صاحبؒ خود اپنے صاحب زادہ کا نام اپنے استاذ کے نام پر رکھا، قاضی ابویوسفؒ کو اپنے استاذ امام ابوحنیفہؒ سے ایسا تعلق تھا کہ جس روز بیٹے کا انتقال ہوا اس روز بھی اپنے استاذ کی مجلس میں حاضری سے محرومی کو گوارا نہیں فرمایا۔

بدقسمتی سے اب اساتذہ اور طلبہ کے درمیان محبت واحترام کا یہ جذبہ مفقود ہے، طلبہ اپنے اساتذہ کو ایسی نگاہ سے دیکھتے ہیں کہ گویا وہ ان کے حریف اور فریق ہیں، نقل وحرکت اور نشست وبرخاست میں ادب واحترام تو بہت دور کی چیز ہے، رودررو فقرے چست کرنے اور جملے کسنے میں بھی کوئی حجاب نہیں، ظاہر ہے اس بے احترامی اور بے اکرامی کے ساتھ کیوں کر کسی شخص سے فیض یاب ہوا جا سکتا ہے؟

جو شخص جتنے بلند مقام ومرتبہ کا حامل ہو، اسی نسبت سے اس کی ذمہ داریاں بھی ہوتی ہیں، استاذ باپ کا درجہ رکھتا ہے؛ لیکن اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے شاگردوں کو وہی محبت اور پیار بھی دے، جو ایک باپ اپنی اولاد کو دیتا ہے، حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اپنے طلبہ کی نسبت سے فرماتے تھے کہ اگر ان پر ایک مکھی بھی بیٹھ جاتی ہے تو مجھے تکلیف

ہوتی ہے، (تذکرۃ السامع،ص:۴۹) سلف صالحین کو اپنے شاگردوں سے ایسی محبت ہوتی کہ ان کی نجی دشواریوں کو بھی حل کرتے، امام شافعیؒ بڑے اعلیٰ درجے کے فقیہ ومحدث ہیں، یہ حصولِ علم کے لئے مدینہ پہنچے، غریب آدمی تھے، امام مالکؒ نے اپنے اس ہونہار شاگرد کو خود اپنا مہمان بنایا اور جب تک مدینہ میں رہے، ان کی کفالت کرتے رہے، پھر جب امام شافعیؒ نے مزید کسبِ علم کے لئے کوفہ کا سفر کرنا چاہا تو سواری کا نظم بھی کیا اور اخراجات سفر کا بھی اور شہر سے باہر آکر نہایت محبت سے آپؒ کو رخصت کیا، امام شافعیؒ کوفہ آئے اور امام ابوحنیفہؒ کے شاگرد رشید امام محمدؒ کی درس گاہ میں بحیثیت طالب علم شریک ہوگئے، یہاں بھی امام محمدؒ نے ذاتی طور پر امام شافعیؒ کی کفالت فرمائی؛ بلکہ بھرپور تعاون فرمایا، امام شافعیؒ اس حال میں کوفہ پہنچے کہ نہایت ہی معمولی کپڑا آپ کے جسم پر تھا، امام محمدؒ نے اسی وقت ایک قیمتی جوڑے کا انتظام فرمایا، جو ایک ہزار درہم قیمت کا تھا، پھر جب امام شافعیؒ کو رخصت کیا تو اپنی پوری نقدی جمع کر کے تین ہزار درہم انھیں حوالہ کئے، (جامع بیان العلم لابن عبدالبر،ص:۲۶۸) امام ابویوسفؒ کے والد دھوبی کا کام کرتے تھے اور بڑی عسرت کے ساتھ گزر اوقات ہوتی تھی؛ بلکہ اس افلاس و مجبوری کی وجہ سے ان کے والدین کو امام ابویوسفؒ کا پڑھنا پسند نہیں تھا، وہ چاہتے تھے کہ آپ کسبِ معاش میں مصروف ہوں اور گھر کے اخراجات میں ہاتھ بٹائیں، امام ابوحنیفہؒ ان کی ذہانت اور طلب علم کے شوق سے بہت متأثر تھے، اس لئے آپؒ نے بنفس نفیس ان کے اخراجات برداشت کئے۔

آج کل صورتِ حال یہ ہے کہ تدریس محض درس گاہ کی ملازمت نہیں کہ آدمی تکمیل ضرورت کے لئے کچھ تنخواہ لے لے اور بے غرضی کے ساتھ اپنے شاگردوں کو پڑھائے؛ بلکہ تدریس ایک ایسی تجارت بن گئی ہے کہ جس کے لئے کسی سرمایہ اور دوکان کی ضرورت نہیں، اساتذہ تاجر ہیں اور طلبہ گاہک، اساتذہ اسکولوں اور کالجوں میں قصداً غیر معیاری اسباق دیتے ہیں اور اسباق کو تشنہ رکھتے ہیں؛ تاکہ طلبہ ان سے ٹیوشن پڑھیں اور کم وقت کی زیادہ قیمت ادا کرنے پر آمادہ ہوں، ایسا بھی ہوتا ہے کہ بعض دانش گاہوں میں ایم فل اور پی ایچ ڈی کے

لئے بھی ''شایانِ شان نذرانہ'' پیش کرنا ہوتا ہے!

یہ ایسی شرمناک بات ہے کہ شریف النفس لوگوں کے لئے اس کا تذکرہ بھی گراں خاطر ہے، ایک ایسا مقدس رشتہ جو مکمل طور پر بے غرضی پر مبنی ہے، جو ایک دوسرے سے بے لوث محبت اور بے پناہ شفقت کا متقاضی ہے اور جو تعلیم گاہیں انسانیت، محبت اور فرض شناسی کا احساس پیدا کرنے کے لئے ہیں، وہیں سے ایسی بداخلاقی اور حرص وطمع کا سبق ملے تو پھر کون سی جگہ ہوگی جہاں انسان کو انسانیت کا سبق مل سکے گا؟ حماد بن سلمہ ایک مشہور محدث گزرے ہیں، ان کے ایک شاگرد نے چین کا تجارتی سفر کیا اور کچھ قیمتی تحائف اپنے استاذ کی خدمت میں پیش کئے، استاذ نے فرمایا کہ اگر یہ تحفے قبول کروں گا تو آئندہ پڑھاؤں گا نہیں اور پڑھاؤں گا تو یہ تحفے قبول نہیں کرسکتا، (الکفایۃ للخطیب، ص: ۱۵۳) مولانا محمد قاسم نانوتویؒ (بانئ دارالعلوم دیوبند) کا حال یہ تھا کہ صرف تیس روپے ماہانہ پر خدمت فرماتے تھے، اس درمیان بعض رئیسوں کی طرف سے تین سو اور پانچ سو روپے ماہانہ پر کام کرنے کی درخواست کی گئی تو آپ نے معذرت کردی اور فرمایا کہ اللہ کے یہاں ان ہی پیسوں کا حساب دینا مشکل ہے، اگر اور زیادہ پیسے لئے جائیں تو ان کا حساب تو اور بھی دشوار ہوگا۔

مسئلہ صرف پیسوں ہی کے لین دین کا نہیں؛ بلکہ ہر طرح کی نصح و ہمدردی کا ہے، ابن جماعہ نے خوب لکھا ہے کہ استاذ کا فرض ہے کہ وہ اپنے لئے جو پسند کرتا ہے وہی اپنے شاگردوں کے لئے پسند کرے اور جو چیز اپنے لئے ناپسند ہے اسے اپنے شاگردوں کے لئے بھی ناپسند سمجھے، (تذکرۃ السامع، ص: ۴۹) استاذ کو اپنے شاگرد سے بے حد محبت ہونی چاہئے اور اسے ہر وقت اس کا خیر خواہ ہونا چاہئے، جیسے کوئی باپ اپنے بیٹے کی ترقی پر خوش ہوتا ہے اور اس کی ناکامی پر کبیدہ خاطر، یہی تعلق ایک استاذ کو اپنے شاگردوں کے ساتھ ہونا چاہئے، یہ تعلق بے غرض اور بے لوث ہو اور پاکیزگی پر مبنی ہو، اگر اساتذہ اپنے شاگردوں کے ساتھ ایسا رویہ اختیار کریں تو کوئی وجہ نہیں کہ طلبہ میں ان کے تئیں وہی احترام نہ پیدا ہو جن کا ذکر ہم کتابوں میں پڑھتے ہیں۔

سب سے اہم بات یہ ہے کہ تدریس کے لئے کسی شخص کا انتخاب اہلیت اور لیاقت کی بناء پر ہونا چاہیئے نہ کہ تعلقات اور دوسری بنیادوں پر ؛ اس لئے کہ تدریس نہایت ہی اہم اور نازک کام ہے، مشہور بزرگ ابوبکر شبلی سے منقول ہے کہ جو شخص قبل از وقت کسی منصب پر فائز ہوجائے وہ دراصل اپنی رسوائی کے درپے ہے : '' **من تصدر قبل أوانه فقد تصدر لهوانه** '' (تذکرۃ السامع والمتکلم:۴۵) اہلیت کا مطلب یہ ہے کہ جس مضمون کی تدریس اس کے حوالہ کی جارہی ہے، وہ واقعی اس مضمون میں عبور رکھتا ہو اور اپنے اخلاق و عادات کے اعتبار سے بھی انگشت نمائی سے محفوظ ہو۔

پھر یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اپنے مضمون پر مناسب محنت کرتا ہو اور اس کے مطالعہ وتحقیق میں ارتقاء اور تسلسل ہو کہ اس کے بغیر وہ اپنے طلبہ کو کما حقہ فیضیاب نہیں کرسکتا ، وہ اوقاتِ درس کا پابند ہو اور اپنے وقت کو طلبہ کی امانت تصور کرتا ہو، قرآن مجید نے کم ناپنے تولنے کی بڑی مذمت فرمائی ہے اور اہل علم نے لکھا ہے کہ ناپ تول کی کمی میں یہ صورت بھی داخل ہے کہ وہ ملازمت کے اوقات میں سے کوئی حصہ اپنی ضرورت میں اور مفوضہ کام کے علاوہ کسی اور کام میں خرچ کرے، یہ بھی ایک طرح کی چوری ہے اور ان اوقات کی اجرت اس کے لئے حلال نہیں۔

اساتذہ کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ طلبہ کی نفسیات کا شعور رکھتے ہوں اور عملی زندگی میں اس سے فائدہ اُٹھاتے ہوں، طالب علم کے ساتھ اہانت آمیز سلوک کرنا اور اس کی تذلیل کے درپے ہونا نہایت اوچھی بات ہے اور کسی بھی طرح استاذ کے شایان شان نہیں، رسول اللہ ﷺ کا معمولِ مبارک تھا کہ اگر کسی کی غلطی پر ٹوکنا ہوتا تو تنہائی میں توجہ دلاتے اور اگر متعدد افراد کو اس غلطی میں مبتلا دیکھتے تو مجمع عام میں کسی کا نام لئے بغیر مبہم انداز میں توجہ دلاتے ؛ چوں کہ مقصود اصلاح ہے نہ کہ انتقام ، ایسا بھی ہوا کہ آپ ﷺ کے بعض نو آموز رفقاء نے مسجد میں پیشاب کردیا، آپ ﷺ نے اس پر پانی بہانے کا حکم دیا اور کسی ناگواری کا اظہار کئے بغیر محبت کے ساتھ سمجھانے پر اکتفا فرمایا، بعض طلبہ بظاہر شر پسند ہوتے ہیں؛ لیکن اگر تنہائی میں بلا

کران کی تفہیم کی جائے اوران کی ذہانت کوتخریبی کاموں کے بجائے تعمیری کاموں کی طرف موڑ دیا جائے تو بآسانی ان کی اصلاح ہوجاتی ہے اور وہ قوم کے لئے ایک مخلص عنصر ثابت ہوسکتے ہیں۔

اساتذہ کے لئے علمی لیاقت کے ساتھ اخلاقی اقدار بھی نہایت ضروری وصف ہے، استاذ کو اتنا باوقار ہونا چاہئے کہ اس کی ایک نگاہِ درشت سے طلبہ سہم جائیں، اگر اساتذہ خود اخلاقی پستی میں مبتلا ہوں، طلبہ سے سطحی گفتگو کرتے ہوں، ان کے سامنے فحش ہنسی مذاق کیا کرتے ہوں، ان کے کردار کو شک وشبہ کی نظر سے دیکھا جاتا ہواوران کی زبان وبیان سے وقتاً فوقتاً سوقیانہ پن اور پھوہڑ پن کا اظہار ہوتا ہو، تو بجا طور پر طلبہ ان کو اپنا بے تکلف دوست سمجھتے ہیں اور استاذ کا درجہ نہیں دیتے؛ کیوں کہ یہ ایک فطری بات ہے کہ انسان خود کتنا بھی برا ہو، وہ اپنے بزرگوں کو اس سے ماوراء دیکھنا چاہتا ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ سماج اور قوم کی تعمیر میں اساتذہ کا بڑا رول ہے، وہ نہ صرف طلبہ بلکہ سماج کے لئے بھی قابل احترام ہیں؛ لیکن اسی قدر ضروری یہ بھی ہے کہ وہ اپنے مقام کو پہچانیں اور جیسے وہ اپنے حقوق کے لئے احتجاج کرنے میں ذرا بھی کوتاہی نہیں برتتے، اسی طرح؛ بلکہ اس سے بڑھ کر وہ اپنے فرائض وواجبات پر بھی نگاہ رکھیں اور خود احتسابی سے بھی غافل نہ ہوں۔

(۱۱؍ستمبر ۱۹۹۸ء)

طلبہ کی تادیب اور فہمائش کے شرعی اُصول*

انسان خیر وشر کا مجموعہ ہے اور شر کی طرف رجحان اس کی فطرت میں رکھ دیا گیا ہے، اللہ تعالیٰ نے کریم بن کریم بن کریم بن کریم حضرت یوسف بن یعقوب بن اسحاق بن ابراہیم علیہم السلام، کی زبان حق ترجمان سے کہلایا ہے: ''وَمَا اُبَرِّئُ نَفْسِیْ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَۃٌ بِالسُّوْئِ'' (یوسف: ۵۳) —— پھر بہت سی غلطیاں ہیں جن پر تقاضۂ عمر بھی انسان کو اُکساتا ہے، اس لئے بچوں سے غلطیوں کا سرزد ہوجانا کوئی تعجب انگیز بات نہیں ہے، تاہم ان کی اصلاح اور ان کی ذہنی اور اخلاقی تربیت بھی ضروری ہے۔

اصلاح کے لئے سب سے پہلی ضرورت یہ ہے کہ استاذ اور مربی طالب علم کو خود سے مانوس کرلے اور اپنے استاذ سے طالب علم کو ایک روحانی محبت اور پاکیزہ وارفتگی پیدا ہوجائے ، ایک مخصوص مدت میں جب تک طلبہ کو خود سے مانوس نہ کرلیا جائے، ان پر سختی کرنا قبل از وقت ہوگا، پیغمبر اسلام ا کی حیاتِ طیبہ میں ہم کو یہ حکمت واضح طور پر ملتی ہے، مثلاً ایک طرف رسول اللہ ﷺ نے ان لوگوں کی سخت مذمت فرمائی جو مسجد میں تھوکیں یا کسی گمشدہ چیز کا اعلان کریں، دوسری طرف ہمیں یہ واقعہ بھی ملتا ہے کہ ایک دیہاتی نے جب مسجدِ نبوی میں پیشاب کرنا شروع کردیا اور صحابہ رضی اللہ عنہم نے اس کو مسجد سے نکالنا چاہا تو آپ ﷺ نے منع فرمادیا اور جب وہ پیشاب کرچکے تو آپ ﷺ نے اسے پانی سے دُھلوا دیا اور نہایت نرمی سے ان کی فہمائش کی کہ مسجد صرف عبادت کی جگہ ہے، رسول اللہ ﷺ کے طرزِ عمل کا یہ فرق اسی پر مبنی تھا، یہ نومسلم تھے

* غالباً ۱۴۱۰ھ میں دارالعلوم سبیل السلام حیدرآباد میں دینی تعلیم اور دینی مدارس کے موضوع پر ایک ریاستی مذاکرہ رکھا گیا تھا، جس کا ایک موضوع طلبہ کی تادیب میں بے اعتدالی بھی تھا، اسی سلسلہ میں یہ تحریر مرتب کی گئی تھی۔

اور ابھی اسلام اور پیغمبر اسلام سے کما حقہ مانوس نہیں تھے اور وہ تہدیدان صحابہ ﷺ کے لئے تھی جو ایک عرصہ سے آپ کی صحبت سے مشرف تھے اور آپ کو جسم و جاں سے زیادہ عزیز رکھتے تھے، بعض مفسد ذہن طلبہ کو چھوڑ کر عام بچوں کا یہ مزاج ہوتا ہے کہ استاذ کی تھوڑی سی شفقت اور محبت بہت جلد ان کو گرویدہ بنا دیتی ہے؛ تاہم اس کے لئے ضروری ہے کہ استاذ شفقت اور وقار کا ایک بہترین آمیزہ ہو، اس کی شفقت و محبت طلبہ کو اس سے مانوس رکھتی ہے اور اس کا وقار طلبہ سے کم سے کم اختلاط، کثیف اور ناشائستہ ہنسی مذاق سے پرہیز، خصوصیت سے زبان اور لب ولہجہ میں احتیاط اور تعلیم کے معاملہ میں پختگی اور عدم کوتاہی اس کو باوقار بنائے رکھے، اس کے مزاج میں ایسا غلبۂ غضب بھی نہ ہو کہ طلبہ کو ان سے توحش ہو اور مزاج میں اتنا غیر سنجیدہ بھی نہ ہو کہ طلبہ کو ان سے تکلف اور حجاب باقی نہ رہے۔

نیز وہ طلبہ کے ذاتی معاملات و واقعات پر بھی نظر رکھے مثلاً کوئی بیمار ہو تو اس کی عیادت کر لی جائے، کسی کے ہاں کوئی حادثہ پیش آیا تو اس سے کلمات تعزیت کہے، بیماری کے بعد مدرسہ آئے تو اس کی مزاج پرسی کر لی جائے —— یہ وہ باتیں ہیں جو بہ ظاہر صرف چند الفاظ ہیں؛ لیکن درحقیقت انسان کے ذہن پر گہرے نقوش واثرات چھوڑتی ہیں۔

اس کے ساتھ ساتھ ایک حد تک بچوں کی غلطیوں کو نظر انداز بھی کرنا چاہئے اور ایسی صورت اختیار کرنی چاہئے کہ گویا استاذ ان کی اس غلطی سے ناواقف اور انجان ہے؛ تاکہ وہ اپنے آپ کو بالکل قید و بند میں محسوس نہ کریں اور رفتہ رفتہ مدرسہ کی تربیت کے ماحول میں خود کو ڈھال لیں —— حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ ''ایک شخص نشہ کی حالت میں پکڑا گیا، لوگوں نے اس کو پکڑا اور حضور ﷺ کے پاس لانے لگے، جب حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے مکان کے پاس لوگ پہنچے تو ان کا نشہ اُتر گیا اور مارے شرم کے حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے چمٹ گئے اور کسی طرح حضور ﷺ کے پاس آنے تیار نہ ہوئے، حضور ﷺ کو جب اس کا علم ہوا تو آپ ﷺ نے ان کو کوئی سزا نہیں دی اور نہ خود اپنے سامنے بلایا'' (ابوداؤد، حدیث نمبر: ۴۴۷۶، باب الحد فی الخمر، عن ابن عباسؓ) یہ غلطی کو نظر انداز کرنے کی ایک مثال ہے۔

مزاج کے رُخ کی تبدیلی

اصلاح کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ انسان کے فطری مزاج و مذاق کو بدلا نہیں جا سکتا؛ البتہ اس کا ''رُخ'' تبدیل کیا جا سکتا ہے، مثلاً کسی طالب علم کو دیکھا جائے، کہ وہ ہر کام میں دوسرے ساتھی کو اپنا حریف سمجھتا ہو اور اس کو زیر کرنے کا خواہاں رہتا ہو، تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ اس کے اندر جذبۂ مسابقت ہے، استاذ کا فرض ہے کہ وہ اس کے اس جذبۂ مسابقت کو دوسری چیزوں سے پھیر کر کتاب اور اس کی یادداشت کی طرف یکسو کر دے۔

مدارس میں جو طلبہ فتنہ وفساد کا سبب بنتے ہیں اور لیڈری کرتے ہیں، اس کا اصل سبب یہی ہوتا ہے کہ ان کے اندر جذبۂ خودنمائی ہوتا ہے، اب اگر تقریر وتحریر میں اس کے وقت کو زیادہ سے زیادہ مصروف کر دیا جائے اور وقتاً فوقتاً اس کی حوصلہ افزائی کی جائے اور اس کی بعض محنتوں کو شائع کر دیا جائے تو اس کے نفس کی تسکین ہو جاتی ہے اور اب خود کو نمایاں کرنے کا جذبہ ایک صحیح رُخ اختیار کر لیتا ہے، ایسے طلبہ کو اگر مصروف نہ رکھا جائے تو وہ پورے ماحول کے لئے خت مضر ثابت ہوتے ہیں، اسی کو حضور ﷺ نے فرمایا کہ: ''**خيار كم فى الجاهلية خيار كم فى الإسلام**'' (صحیح بخاری، حدیث نمبر: ۴۶۸۹، باب، کتاب تفسیر سورۂ یوسف) حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مزاج کی درشتی اسلام کے بعد بھی باقی رہی، مگر پہلے اس کا استعمال اظہار شجاعت ومردانگی کے لئے تھا اور اب وہ فاروقیت کا نشان بن گئی۔

موعظت

طلبہ جب کوئی غلطی کریں تو سب سے پہلے موعظت اور تذکیر سے کام لینا چاہئے اور انفرادی طور پر تنہائی میں محبت کے ساتھ ان کو سمجھانا چاہئے، انفرادی نصیحت اکثر اوقات انسان پر بہت اثر انداز ہوتی ہے؛ اسی لئے اسلام کی دعوت واشاعت میں انفرادی دعوت ہی کو زیادہ دخل رہا ہے، اس کے لئے ضروری ہے کہ استاذ پہلے طالب علم کے مزاج اور اس کی بنیادی کمزوریوں کو سمجھے اور اس کی دو تین بنیادی غلطیوں کو اپنے ذہن میں رکھے، پھر تھوڑے

تھوڑے وقفہ سے ان سب کے بارے میں یکے بعد دیگرے سمجھائے اور عہد لے کہ آئندہ وہ ایسا نہیں کرے گا، مثلاً ایک بچہ چوری کرتا ہے، لوگوں سے قرض لیتا رہتا ہے، اپنے سامان بیچ لیتا ہے، گھر سے لائے ہوئے پیسوں کو جلد ختم کر دیتا ہے، تو یہ اس کی بنیادی کمزوری فضول خرچی کا رجحان ہے، اب مربی کا کام ہے کہ وہ چند دن پیسے کی ایک مخصوص مقدار پر کفایت کرائے، رفتہ رفتہ اس میں کمی کرتا جائے، یہاں تک کہ بتدریج اس کی یہ عادت ختم ہو جائے۔

یا مثلاً کوئی طالب علم بہ ظاہر فہیم ہے؛ لیکن کتاب یاد نہیں کرتا ہے، مفوضہ کام انجام نہیں دیتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ کام چور ہے، اس کی اصلاح کے لئے سب سے بنیادی ضرورت ''انضباطِ وقت'' کی ہے، استاذ کا کام ہے کہ وہ اس سے اس کا پورا نظام العمل بنوائے اور روزانہ اس کی خانہ پری کرائے؛ تاکہ بتدریج وہ وقت کے صحیح استعمال کا خوگر ہو جائے۔

تہدید

نصح وموعظت بھی جب مفید ثابت نہ ہو تو اب ڈانٹ ڈپٹ سے کام لیا جائے، اسی لئے ابنیاء کو بشیر کے ساتھ نذیر بھی بنایا گیا ہے اور آپ نے اول درجہ میں بشارت سے کام لینے کا حکم دیا ہے اور دوسرے درجہ میں ڈرانے کا، ہمیشہ نرم گفتگو بد طینت لوگوں کو اور شوخ بنا دیتی ہے اور ان کے حوصلے بڑھاتی ہے — تاہم ڈانٹ ڈپٹ میں بھی دو باتوں کا خیال رکھنا چاہئے ایک یہ کہ بدُعاء وغیرہ کے الفاظ نہ ہوں جس کی وجہ سے طالب علم استاذ کو اپنا دشمن اور بدخواہ تصور کرنے لگے، حدیث میں ہے کہ ایک صحابی ؓ آپ ﷺ کو بہت ہنسایا کرتے تھے، لوگ غالباً مزاحاً ان کو ''حمار'' کہا کرتے تھے، ان سے کئی دفعہ شراب نوشی کی غلطی سرزد ہوگئی، لوگ ان کو شرم و عار دلانے لگے، اسی دوران ایک صاحب نے کہہ دیا کہ تم پر اللہ کی لعنت ہو اور کسی نے کہہ دیا خدا تم کو رسوا کرے، حضور ﷺ نے اس فقرہ کو پسند نہیں فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ ایسی بات کہہ کر تم شیطان کی مدد نہ کرو اور جہاں تک مجھے معلوم ہے وہ خدا اور اس کے رسول سے محبت رکھتا ہے۔ (بخاری، حدیث نمبر: ۶۷۸۰، ۶۷۸۱، کتاب الحدود، عن عمر بن الخطاب ؓ)

دوسرے ڈانٹ ڈپٹ میں بھی طالب علم کے لئے دردمندی اور نصح کا جذبہ ہو؛ اسی

لئے انبیاء کو قرآن مجید نے ''مخوف'' نہیں کہا؛ بلکہ ''نذیر'' کہا نذیر ایسے ڈرانے والے کو کہتے ہیں، جو دوسرے کو بے عزت اور خوفزدہ کرنے کے لئے نہیں ڈرائے؛ بلکہ ترس اور درد کے ساتھ ڈراتے ہیں۔

بے توجہی

اصلاح کا ایک طریقہ تھوڑے وقفہ کے لئے بے توجہی بھی ہے، اگر طالب علم ایک غلطی کا بار بار اعادہ کرتا ہو اور استاذ چند دن اس کی طرف توجہ کرنا چھوڑ دے اور اس کے ہم جماعت طلبہ کو بھی دو تین دنوں کے لئے بے تعلق کر دے تو اس طرح وہ اپنے ماحول میں بالکل اجنبی بن کر رہ جائے گا اور یہ قدم اس کی اصلاح کے لئے بڑا مؤثر ثابت ہوگا۔

حدیث میں ہم کو اس کی اصل یہ ملتی ہے کہ حضرت کعب وحضرت ابولبابہ اور مختلف صحابہ رضی اللہ عنہم ہیں کہ جن کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی طریقہ اختیار فرمایا ہے، خود بھی ان سے بہ ظاہر بے توجہی کرتے اور صحابہ رضی اللہ عنہم کو بھی چند دنوں ان سے قطع تعلق کا حکم دیا، یہ چیز نہ صرف یہ کہ ان کے لئے ایک عبرت خیز واقعہ بن گئی؛ بلکہ دوسرے لوگوں کے لئے بھی یہ ایک زبردست تازیانہ ثابت ہوا — دراصل مقاطعہ اور کسی انسان کو اس کے ماحول سے کاٹ دینا اصلاح کے لئے ایک نہایت مؤثر ذریعہ ہے؛ تاہم اس کے لئے بہت احتیاط اور طالب علم کی نفسیات کے مطالعہ کی ضرورت ہے اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب اس کے اندر دینی تعلیم کی طرف توجہ اور اپنے استاذ سے محبت پیدا ہوگئی ہو، قبل از وقت اس قسم کا اقدام اس کے لئے تعلیم سے نفرت اور مدرسہ کے ماحول وفضاء سے بُعد کا سبب بن جائے گا۔

جسمانی تادیب

تنبیہ وتادیب کا ایک اہم ذریعہ ''جسمانی سرزنش'' بھی ہے، اس کی ایک صورت تو یہ ہے کہ مار پیٹ کے علاوہ دوسرے طریقوں سے جسمانی سرزنش کی جائے، مثلاً کسی مخصوص انداز سے کھڑا کر دینا یا بیٹھا دینا، ایسی تدبیروں کے بجائے ایسا بھی کیا جاسکتا ہے کہ اس سے

کچھ نمازیں پڑھائی جائیں یا ایک دووقت کا کھانا بند کردیا جائے، شریعت میں تادیب کے اس طریقہ کے لئے ثبوت موجود ہے؛ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ متعدد غلطیوں کا کفارہ ''روزہ'' کو قرار دیا گیا ہے، یہ اس بات کی علامت ہے کہ جسمانی سرزنش کی یہ ایک مؤثر اور انقلاب انگیز تدبیر ہے، جب ہی تو اسلام نے کفارات کے لئے اس کا انتخاب کیا ہے۔

مارپیٹ

سرزنش کا ایک آخری درجہ ''ضرب'' اور مناسب حدود میں ہی مارپیٹ کرنا ہے، مارپیٹ ایک نامناسب چیز ہے؛ لیکن کبھی کبھی اصلاح وتربیت کی خاطر اس قدر ناگزیر ہوجاتی ہے کہ اس کے بغیر چارہ نہیں ہے؛ اس سلسلہ میں نہ یہ نظریہ صحیح ہے کہ طالب علم کو بالکل مارا ہی نہ جائے اور نہ یہ طریقہ صحیح ہے کہ طلبہ کو سزا دیتے ہوئے دیکھنے والے کو ایسا گمان ہو کہ جانور پر کوڑے برسائے جارہے ہیں، حدیث میں ہے کہ دس سال کی عمر ہونے کے باوجود بچے نماز نہ پڑھیں تو ان کو مارو (ابو داؤد، حدیث نمبر: ۴۹۴، **باب متی یؤمر الغلام بالصلاۃ**) اور یہ کہ اللہ تعالیٰ اس آدمی پر رحم فرمائے جو اپنے گھر میں ڈنڈا لٹکا کر رکھے تا کہ اس کے ذریعہ بچوں کی تربیت کی جاسکے، (**مسند دیلمی، بحواله کنز العمال**، حدیث نمبر: ۴۴۹۹۸، **باب تربیة أهل البیت**) اس سے معلوم ہوا کہ بچوں کو ان کی غلطی پر ''مارپیٹ'' کی سزا بھی دی جاسکتی ہے۔

دوسری طرف مار ایسی بھی نہ ہو کہ ''ضرب مبرح'' ہوجائے، اس سلسلہ میں احادیث اور کتبِ فقہ کی صراحتوں سے جو ہدایات ملتی ہیں وہ یہ ہیں کہ :

(۱) رسول اللہ ﷺ نے جانور کو بھی چہرہ پر مارنے سے منع فرمایا، (کنز العمال، حدیث نمبر: ۲۵۶۲۳، ۲۵۶۳۵، حقوق الراکب والمرکوب) اسی طرح غلام کو بھی چہرہ پر مارنے کی ممانعت فرمائی ہے۔ (**کنز العمال**، حدیث نمبر: ۲۵۶۲۰، **حقوق المملوک**)

اور سرزنش کے سلسلہ میں صراحتاً حکم فرمایا کہ چہرہ سے بچا جائے: ''**إذا ضرب أحدکم فلیتق الوجه**''۔ (ابوداؤد، حدیث نمبر: ۴۴۹۳، باب فی ضرب الوجہ فی الحد، کتاب الدیات)

(۲) جسم کے نازک حصہ جیسے پیٹ، سینہ وغیرہ پر بھی نہ مارا جائے۔

(۳) مسلسل ایک ہی مقام پر نہ مارا جائے؛ بلکہ جسم کے مختلف حصوں پر مارا جائے۔

(۴) اس طرح نہ مارے کہ جسم پھٹ جائے، ہڈی ٹوٹ جائے، یا مار کا نشان جسم پر نمایاں ہوجائے کہ فقہاء نے ان ساری صورتوں کو ''ضرب مبرح'' میں داخل قرار دیا ہے۔

ان اُمور کی رعایت کے بغیر سخت ترین اور تکلیف دہ سزا دینا نامناسب تو ہے ہی شرعاً بھی ناجائز ہے اور علامہ شامیؒ نے لکھا ہے کہ خود ایسے مدرس کی تعزیر کی جائے گی۔

(۵) ایک دفعہ دس چھڑی سے زیادہ نہ مارا جائے، حدیث میں ہے کہ حد کے علاوہ کسی اور غلطی پر دس کوڑے سے زیادہ نہیں مارنا چاہئے: ''**لا یجلد فوق عشر جلدات إلا في حد من حدود اللہ**''۔ (بخاری، حدیث نمبر: ۶۸۴۸، مسلم، حدیث نمبر: ۱۷۰۸، عن ابی ہریرہؓ)

لیکن یہ طریقہ کہ استاذ انتظامیہ کے پاس شکایت کرے پھر وہ اس کی تحقیق کریں اور بعد تحقیق وتفتیش مقدار متعین فرمائیں اس کے بعد کسی طالب علم کی سرزنش کی جائے، تجرباتی لحاظ سے سخت مضر ہے اور میرے خیال میں اس کے لئے کوئی شرعی اصل بھی موجود نہیں ہے، فقہاء نے جہاں والد یا استاذ یا شوہر کے لئے تعزیر کی اجازت دی ہے، وہاں کہیں ایسی کوئی قید نہیں لگائی گئی ہے؛ البتہ استاذ کے لئے اس کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ سرزنش کے پیچھے انتقام اور اشتعال کا جذبہ کارفرما نہ ہو۔

اخراج

لیکن نصح وموعظت، تہدید، جسمانی تادیب اور مار پیٹ کے باوجود اگر طالب علم کی اصلاح نہ ہو پائے یا طالب علم کوئی حد سے گذری ہوئی بات کر جائے تو ایسے طالب علم سے مدرسہ کے ماحول کو خالی کر دینا دراصل نہ صرف دوسرے طلبہ؛ بلکہ خود اس کے ساتھ بھی انصاف ہے — اس معاملہ میں مدرسہ کی انتظامیہ عام طور پر افراط وتفریط میں مبتلا ہوتی ہے کچھ لوگ ذرا سی بات پر یہ کہہ اُٹھتے ہیں کہ مدرسہ کو اس طالب علم سے خالی کر دیا جائے گویا مدرسہ طلبہ کی اقامت گاہ بلکہ خدا رسیدہ بزرگوں کی خانقاہ ہو، جن سے غلطی کا ارتکاب قابل تصور نہ ہو اور ہوجائے تو قابل برداشت نہ ہو۔

اس کے مقابلہ میں کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ جب مدرسہ نے ایک طالب علم کا داخلہ لے لیا تو گویا اس بات کا ٹھیکہ لے لیا ہے کہ چاہے وہ کسی درجہ میں بھی مفسد ہو، مگر اس کو سند فراغت پر ہی رخصت کرے گا؛ اس لئے کہ مدرسہ اسپتال ہے اور یہ جگہ تو ہے ہی بیماروں کے لئے — یہ بات بعض اوقات پہلی رائے سے بھی زیادہ مضرت رساں ہوجاتی ہے؛ اس لئے کہ ایک مفسد اور کمینہ طینت طالب علم کی موجودگی اکثر اوقات پورے ماحول کو خراب کرکے رکھ دیتی ہے، اس طرح ایسے طالب علم کو مدرسہ میں رکھنا دوسرے طلبہ کے ساتھ سخت ناانصافی اور ظلم ہے اور یہ خود اس طالب علم کے حق میں بھی مضر ہے، مثلاً ایک طالب علم استاذ کے ساتھ گستاخ ہو، آپ اس کی تنبیہ بھی کردیں تو اس ماحول میں جہاں وہ پہلے شوخیاں کرتا رہا ہے، اس کو اپنے لئے وقار کا مسئلہ سمجھ لیتا ہے اور اپنی فروتنی سے اس کو ذلت محسوس ہونے لگتی ہے، پھر چوں کہ بعض اساتذہ کے لئے اس کے دل میں نفرت کے جذبات رہتے ہیں؛ اس لئے ان سے استفادہ دشوار ہوجاتا ہے، استاذ میں بھی اس کی طرف سے ایک حد تک اِبا کا جذبہ کارفرما رہتا ہے، جسے بہر حال انتظامیہ اپنے آمرانہ مزاج سے ختم نہیں کرسکتی؛ اس لئے اگر وہ اس مدرسہ سے نکل کر کسی نئے ماحول میں چلا جائے تو فروتنی میں عار محسوس نہیں ہوتی، کسی استاذ کے بارے میں اس کے دل میں کوئی نفرت نہیں ہوتی نہ کسی استاذ کو اس سے حجاب رہتا ہے، اس طرح وہ خود بھی اپنی تعلیم کو صحیح طور پر جاری رکھ سکتا ہے اور اپنی اصلاح کرسکتا ہے۔

اسلام میں اس کی واضح نظیر ''تغریب'' یعنی جلاوطنی ہے، فقہاء نے از راہِ تعزیر جلاوطن کئے جانے کی اجازت دی ہے، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد میں بارہا اس طریق کو استعمال فرمایا ہے، قرآن نے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت خضر کے درمیان فراق کا جو واقعہ لکھا ہے وہ ایک طالب علم کے اخراج کی بہترین نظیر ہے۔